[Book Title]

حدیثِ عمل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ

وْأَنزَلْنَاهَـٰذَاالْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا
مُّتَصَدِّعًامِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ
نَضْرِبُهَالِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور بے پناہ رحم کرنے والے ہیں
اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا
کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔ اور یہ باتیں ہم لوگوں کے
لئے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ فکر کریں (الحشر۔21)

انتساب

ختمی الرسل نبی کریم ﷺ کے نام جن

کے وسیلے ہی سے انسانیت کو دنیا کے ساتھ

ساتھ حیات وکائنات کی وسعتوں کا شعور

اور نسلِ انسانی کو عالمگیر مساوات کا پیغام ملا۔

فہرست

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	عید میلاد النبی ﷺ	بروز جمعتہ المبارک 12 ربیع الاوّل 1431ھ 26 فروری	8
2	وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں	بروز اتوار 14 ربیع الاوّل 1431ھ 28 فروری 2010ء	12
3	شکاری	بروز منگل 16 ربیع الاوّل 1431ھ 2 مارچ 2010ء	16
4	مصلحت کے بوجھ	بروز جمعرات 18 ربیع الاوّل 1431ھ 4 مارچ 2010ء	19
5	وڈیرہ سائیں	بروز ہفتہ 20 ربیع الاوّل 1431ھ 6 مارچ 2010ء	22
6	موہن لال سنگھ سے من موہن سنگھ تک	بروز اتوار 21 ربیع الاوّل 1431ھ 7 مارچ 2010ء	25
7	چشمِ عبرت!	بروز سوموار 22 ربیع الاوّل 1431ھ 8 مارچ 2010ء	29
8	چشمِ تماشہ	بروز بدھ 24 ربیع الاوّل 1431ھ 10 مارچ 2010ء	32
9	عظیم مغالطہ	بروز جمعتہ المبارک 26 ربیع الاوّل 1431ھ 12 مارچ	37
10	عالمِ شہود	بروز ہفتہ 27 ربیع الاوّل 1431ھ 13 مارچ 2010ء	40
11	عزتِ نفس	بروز اتوار 28 ربیع الاوّل 1431ھ 14 مارچ 2010ء	43
12	عزّت توقیر کی داستان	بروز سوموار 29 ربیع الاوّل 1431ھ 15 مارچ 2010ء	46
13	زمیں کی رات	بروز منگل 30 ربیع الاوّل 1431ھ 16 مارچ 2010ء	49
14	قائد کی ذہانت اور قراردادِ پاکستان	بروز جمعرات 2 ربیع الثانی 1431ھ 18 مارچ 2010ء	53
15	اندھیری رات کے مسافر	بروز ہفتہ 4 ربیع الثانی 1431ھ 20 مارچ 2010ء	58
16	وارثانِ قلم و قرطاس	بروز سوموار 6 ربیع الثانی 1431ھ 22 مارچ 2010ء	61
17	وسیع تر قومی مفاد	بروز بدھ 8 ربیع الثانی 1431ھ 24 مارچ 2010ء	64
18	ہوئے بے توفیق فقیہانِ حرم!	بروز جمعرات 2 ربیع الثانی 1431ھ 18 مارچ 2010ء	67
19	نفسیاتی روگ	بروز ہفتہ 4 ربیع الثانی 1431ھ 20 مارچ 2010ء	69
20	"دل کے چراغ"	بروز اتوار 12 ربیع الثانی 1431ھ 28 مارچ 2010ء	72
21	"ڈبل گیم"	بروز جمعتہ المبارک 17 ربیع الثانی 1431ھ 2 اپریل 2010ء	76
22	"ماں کھو گئی ہے"	بروز ہفتہ 18 ربیع الثانی 1431ھ 3 اپریل 2010ء	79
23	"واویلا"	بروز منگل 20 ربیع الثانی 1431ھ 5 اپریل 2010ء	83
24	کھیت رہے نہ کھلیان	بروز بدھ 22 ربیع الثانی 1431ھ 7/اپریل 2010ء	85
25	تفاخر کی بُو، نمود و نمائش کی آگ	بروز جمعتہ المبارک 24 ربیع الثانی 1431ھ 9/اپریل 2010ء	88
26	ہندو استدلال	بروز سوموار 27 ربیع الثانی 1431ھ 12/اپریل 2010ء	91

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	قرونِ اولیٰ کی ایک نایاب خوشبو	بروز بدھ 29 ربیع الثانی 1431ھ 14/اپریل 2010ء	97
28	بقاء کا راستہ	بروز جمعتہ 2 جمادی الاوّل 1431ھ 16/اپریل 2010ء	100
29	ہمارا اقبال	بروز اتوار 4 جمادی الاوّل 1431ھ 18/اپریل 2010ء	103
30	کشمیر۔ عمل اور ردّ عمل	بروز منگل 6 جمادی الاوّل 1431ھ 20/اپریل 2010ء	106
31	رازِ ملوکانہ	بروز بدھ 7 جمادی الاوّل 1431ھ 21/اپریل 2010ء	110
32	اقبال کا پاکستان	بروز جمعتہ 9 جمادی الاوّل 1431ھ 23/اپریل 2010ء	113
33	غیر مرئی دباؤ	بروز اتوار 11 جمادی الاوّل 1431ھ 25/اپریل 2010ء	118
34	کس بوٹ کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے	بروز سوموار 12 جمادی الاوّل 1431ھ 26 اپریل 2010ء	121
35	طاؤس ورباب	بروز منگل 13 جمادی الاوّل 1431ھ 27/اپریل 2010ء	124
36	کئی رموز ہیں پنہاں.....!	جمعرات 15 جمادی الاوّل 1431ھ 29/اپریل 2010ء	127
37	نیا درسِ حکمت	بروز ہفتہ 17 جمادی الاوّل 1431ھ یکم مئی 2010ء	135
38	دجّالی فتنے!	بروز سوموار 19 جمادی الاوّل 1431ھ 3 مئی 2010ء	138
39	اسلامیانِ ہند کا دیدہ بینا مفکّر	بروز بدھ 21 جمادی الاوّل 1431ھ 5 مئی 2010ء	141
40	خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ	بروز جمعتہ المبارک 23 جمادی الاوّل 1431ھ 7 مئی	146
41	آخر کب تک؟	بروز اتوار 25 جمادی الاوّل 1431ھ 9 مئی 2010ء	150
42	فوری بائیکاٹ!	بروز منگل 27 جمادی الاوّل 1431ھ 11 مئی 2010ء	153
43	مہندی کے رنگ	بروز جمعرات 29 جمادی الاوّل 1431ھ 13 مئی 2010ء	156
44	مرگِ مسلسل	بروز جمعتہ 30 جمادی الاوّل 1431ھ 14 مئی 2010ء	159
45	روم سے اسلام آباد تک	بروز ہفتہ یکم جمادی الثانی 1431ھ 15 مئی 2010ء	162
46	شوق کا سفر	بروز سوموار 3 جمادی الثانی 1431ھ 17 مئی 2010ء	165
47	گناہِ کبیرہ	بروز بدھ 5 جمادی الثانی 1431ھ 19 مئی 2010ء	168
48	کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟	بروز جمعتہ المبارک 7 جمادی الثانی 1431ھ 21 مئی	171
49	انسان خسارے میں	بروز اتوار 9 جمادی الثانی 1431ھ 23 مئی 2010ء	174
50	خونِ شہداء کی شفق رنگ	بروز منگل 11 جمادی الثانی 1431ھ 25 مئی 2010ء	178
51	تاریخ کا عبرتناک سبق	بروز جمعرات 13 جمادی الثانی 1431ھ 27 مئی 2010ء	182
52	رہے نام اللہ کا	بروز ہفتہ 15 جمادی الثانی 1431ھ 29 مئی 2010ء	185

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
53	آواز دے کہاں ہے؟	بروز سوموار 17 جمادی الثانی 1431ھ 31 مئی 2010ء	188
54	زمین کی رات	بروز منگل 18 جمادی الثانی 1431ھ یکم جون 2010ء	191
55	تیری بربادیوں کے.....	بروز بدھ 19 جمادی الثانی 1431ھ 2 جون 2010ء	195
56	آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو	بروز جمعتہ 21 جمادی الثانی 1431ھ 4 جون 2010ء	198
57	کانپ اٹھتا ہوں!	بروز منگل 25 جمادی الثانی 1431ھ 8 جون 2010ء	202
58	وطن کی فکر کرناداں.....	بروز جمعرات 27 جمادی الثانی 1431ھ 10 جون	205
59	عشق و محبت کے بے ذوق تماشے	بروز ہفتہ 29 جمادی الثانی 1431ھ 12 جون 2010ء	208
60	کوتاہیوں کا کفارہ	بروز اتوار یکم رجب المرجب 1431ھ 13 جون 2010ء	211

عید میلاد النبی ﷺ

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہیں تو ہو

اور جذبۂ عشق رسول اکرم ﷺ کا اصل تقاضہ یہی ہے کہ یہ کیفیت ہمارے فکر و عمل کا پوری طرح احاطہ کرلے۔ یہ بات ایمان کی ہے اور ایمان کا ثبوت اعمال صالح کی صورت ہی میں فراہم کیا جاسکتا ہے۔ سیرت پاک کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی ہمارا جزو ایمان ہونی چاہئے کہ دور رسالتِ مآب ﷺ تاریخ کا حصہ نہیں ہے بلکہ ساری نسلِ انسانی کیلئے قیامت تک ہدائت جاریہ ہے۔

ہمارے رسول کریم ﷺ نے اسلام کو ایک مکمل معاشرتی نظام بنا کر نسلِ انسانی کو عطا فرمایا ہے اور انسانی تاریخ کا حقیقی انقلاب وہی دور سعادت آثار ہے۔ رسول کریم ﷺ کے وسیلے ہی سے انسانیت کو دنیا کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کی وسعتوں کا شعور اور نسلِ انسانی کی عالمگیر مساوات کا پیغام ملا۔ انسان انفرادی طور پر جس طرح مختلف مرحلوں سے گزر کر باشعور ہونے کی منزل تک پہنچتا ہے' نسلِ انسانی بھی مجموعی طور پر انہی مرحلوں سے گزری ہے۔ ختم نبوت کا اعلان پوری نسلِ انسانی کے باشعور ہونے کا اعلان بھی ہے اسی لئے ہمارے حضور ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع میں ساری نسل انسانی کو مخاطب فرمایا۔

اس طرح پوری نسل انسانی کیلئے اللہ کی ہدائت حرفاً حرفاً محفوظ ہوگئی اور اس کے مطابق پوری معاشرتی زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل عملی نمونہ سامنے آ گیا۔ "آئیڈیل" کو معاشرتی زندگی کی حقیقت بنا کر پیش کر دیا گیا' زندگی عملی نمونے میں ڈھل گئی۔ انسان پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ کائنات کے نظام اور انسان کی انفرادی، اجتماعی زندگی اور سماجی زندگی سب اللہ کے قانون کی گرفت میں ہیں۔ کائنات کے نظام میں اللہ کی حاکمیت براہِ راست ہے لیکن ارادے اور اختیار کی صفت کی وجہ سے انسانی زندگی پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ انسانی ایمان و اعمال کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ کائنات کا نظام حیرت انگیز نظم و ضبط کے تحت چل رہا ہے۔ وہاں کسی نوعیت کا کوئی فساد ممکن ہی نہیں، کیونکہ فساد شرک سے پیدا ہوتا ہے اور کائنات میں شرک ممکن نہیں ۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا ہے "زمین اور آسمانوں میں ایک سے زائد الٰہ ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا"۔

فساد شرک سے پیدا ہوتا ہے، شرک ناقابل معافی گناہ اسی لئے ہے کہ اس سے احترامِ آدمیت کی نفی ہو جاتی ہے۔ انسان کے مشرکانہ افکار و اعمال سے اللہ کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ساری دنیا کے انسان بھی اگر مشرک ہو جائیں تو اللہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ شرک سے انسانی فکر میں، انسانی عمل میں اور انسانی معاشرے میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور جہاں فساد ہوتا ہے وہاں امن و انصاف برقرار نہیں رہ سکتا۔ انسانی معاشرے میں خیر و فلاح کیلئے اور ہمہ جہت ارتقاء کیلئے امن و انصاف قائم رہنا ضروری ہے۔ حریت، مساوات، اخوت، امانت، دیانت، صداقت اور عدالت، یہ صفات جنہیں ہم اخلاقی قدریں کہتے ہیں، یہ قدریں درحقیقت وہ قوانین قدرت ہیں جن کے نفاذ سے انسانی معاشرے میں امن و انصاف کی ضمانت مہیا ہو جاتی ہے۔ جس

فرد میں جس حد تک یہ صفات زندہ و بیدار اور متحرک ہوں گی، وہ فرد اسی نسبت سے خیر و فلاح قائم کرنے کا باعث ہو گا اور اور جس معاشرے میں ایسے صالح اعمال والے افراد کی کثرت ہو گی وہ معاشرہ امن و سلامتی اور انصاف کا گہوارہ بن جائے گا۔

بیج کو کھلی فضا ملے تو پوری طرح پھلتا پھولتا ہے۔ اس پر کوئی دباؤ آجائے یا وہ کسی پتھر کے نیچے آجائے تو وہ نشو و نما سے محروم ہو جاتا ہے۔ سرکار دوعالم ﷺ اس اوّلین اسلامی معاشرے سے انسانی جذبات، مفادات، خواہشات اور تعصبات کے سارے پتھر سمیٹ لئے تھے چنانچہ انسانی معاشرت کا وہ باغ ایسا لہلہایا، ایسے پھل پھول لایا کہ انسانی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو سیرت سرکار دوعالم ﷺ کی مثال واقعی بے مثال ہے۔ حضور اکرم ﷺ سب سے زیادہ با اختیار تھے اور سب سے زیادہ قانون کے پابند تھے ۔ حضور اکرم ﷺ کے تصرف میں ہر شئے آسکتی تھی لیکن حضور اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ سادہ زندگی بسر فرمائی۔ حضور اکرم ﷺ کا ہر فرمان قانون تھا اور حضور اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ خود احتسابی کی زندگی بسر فرمائی۔ اس اعتبار سے اسلامی معاشرے کی خصوصیات بڑی منفرد ہیں ۔ اسلامی معاشرے میں تکریم کا واحد معیار شخصی کردار ہے۔

اسلامی معاشرے میں دشمن اقوم کے افراد سے بھی انصاف کیا جائے گا اور غلطی اور جرم کرنے والا سب سے پہلے خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کرے گا۔ اسلامی نظام میں انسانوں کی انسانوں پر حکومت کا کوئی تصور نہیں بلکہ معاشرتی زندگی میں معاملات اور اشیاء کا انتظام کرنے والا ہر وقت ہر شخص کے سامنے اپنے اعمال اور طرزِ انتظام کیلئے جوابدہ رہے گا اور ایسے نظام کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ خود انسان کی اپنی خواہشات نفسانی بن جاتی ہیں۔ سورۃ فرقان میں ارشاد ہے" أَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَـٰهَهُۥ هَوَىٰهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا الٰہ بنالیا ہے، اب ایسے شخص کو تم راہِ راست پر کیسے لاسکتے ہو۔ یہی خواہشاتِ نفسانی معاشرتی امن و انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

معاشرتی زندگی میں انصاف سے محرومی سے فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے اور فتنہ و فساد کی کیفیت لوگوں کے جذبات اور تعصبات کو مسلسل ابھارتی رہتی ہے ۔ جبر کے ذریعے لوگوں کو وقتی طور پر خاموش رکھا جاسکتا ہے لیکن جبر کی خاموشی پھر بغاوت کا طوفان بن کر نمایاں ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ وہ فانی نہیں ہے۔ انسانی وجود کو، انسانی ذات کو موت کے بعد بھی باقی رہنا ہے انسان کیلئے آنے والی زندگی ناگزیر ہے اور اس آنے والی دائمی زندگی میں کامیابی یا ناکامی کی بنیاد اس دنیا میں ایمانی شعور کے تحت اختیاری عمل ہو گے۔ آخرت پر ایمان انسان میں خود احتسابی کی صفت پیدا کرتا ہے۔ انسانی معاشرت کے تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو نسلوں، علاقوں یا ملکوں تک محدود نہیں رہتے۔

گزشتہ چودہ سو برسوں میں عالمگیر سطح پر جتنی بھی مثبت تبدیلیاں ہوئی ہیں، انسانی حقوق کا جتنا شعور بھی بیدار ہوا ہے، قوموں کو اعلیٰ انسانی اقدار کے مطابق اپنا نظام مرتب کرنے پر راغب کرنے کیلئے بین الاقوامی تنظیموں کے قیام کی جو کوششیں بھی ہوئی ہیں، ان ساری کوششوں کا حقیقی محور مرکز سرکار دوعالم ﷺ کا دور سعادت آثار ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید پر ایمان سازی نسل انسانی کیلئے خیر و فلاح کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

لیکن نسل انسانی کی وحدت اور اس کی فلاح و خیر کی راہ میں رکاوٹیں بھی مسلسل آتی رہتی ہیں اور حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان یہ آویزش انسانی معاشرے کی امتیازی صفت ہے چنانچہ امن و انصاف کی فضا کو فتنہ و فساد پیدا کرنے والی طاقتیں برابر مکدر کرتی رہتی ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ فساد پھیلانے والے بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اصلاح کرنے والے ہیں۔ فتنہ و فساد کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ قرآن پاک میں فتنہ پردازی کو انسانی قتل سے بھی زیادہ بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ فرعون کو مفسد کہا گیا ہے اور فساد کی شدت کو انسانی بداعمالیوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ تاریخ قوموں کا حافظہ اور واقعات کی ریاضی ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے اور اس طرح ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی رہتی ہے کہ اللہ کا قانون بدلا نہیں کرتا۔ حیات و کائنات کا نظام انسانی معاشرے کے مختلف اجزاء پر مشتمل ہے، ان میں منقسم نہیں ہے، ہم نے عملاً اسے منقسم کر دیا ہے۔

عبادات الگ، معاملات زندگی الگ اور ہم اس ارشادِ قرآنی کو بھول جاتے ہیں کہ ایک سے زیادہ الٰہ ہوں گے تو فساد ہو گا۔ ہمارے ہادی برحق ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع میں ہم اہل ایمان پر یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ جو وہاں موجود تھے وہ اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ ایک عالمگیر ذمہ داری تھی۔ اس کے ساتھ قرآنِ کریم نے ہم پر اجتماعی طور پر "خیر امت" اور "امتِ وسط" ہونے کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے۔ قران کریم کی سورۃ انفال میں ارشاد ہوا ہے "حق کی منکر قوتیں ایک دوسرے کا ساتھ دعوت دیتی ہیں، تم اگر ایسا نہیں کرو گے تو بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔" علامہ اقبال نے امت مسلمہ کو یہی ذمہ داری یاد دلائی ہے

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ہے ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پر بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں پر بھروسہ
تقدیرِ امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

ایمان کی توانائی فرد میں اور قوم میں، دونوں میں خود احتسابی کی صفت پیدا کرتی ہے۔ ہم اس صفت سے ایک طویل عرصے سے عالمگیر سطح پر محروم ہیں اور اس محرومی نے ہمیں اس توانائی سے بھی محروم کر دیا ہے جسے اقبال نے مومن کی فراست کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اس کے باوجود عالمی سطح پر امن وانصاف کے قیام کیلئے ہمارا ملی کردار کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک وہ کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے، عالمگیر سطح پر امن وانصاف قائم نہیں ہو سکتا اور اپنی اس بے بسی کیلئے ہم اللہ کے حضور جوابدہ بھی ہونگے اور اس کردار کی ادائیگی کی راہ جذبہ حب رسول □ سے ہی منور ہو سکتی ہے کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی ذات ہی حاصلِ حیات و کائنات ہے ۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
نہ یہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی
نہ ہو بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزمِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

رہے نام میرے رب کا جس نے میرے نبی ﷺ کو سب جہانوں کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا!

بروز جمعتہ المبارک 12 ربیع الاوّل 1431ھ 26 فروری 2010ء

وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

برطانیہ کا مشہورِ زمانہ اخبار سنڈے ٹائمز ہر سال برطانیہ کے ایک ہزار امیر ترین افراد کی فہرست شائع کرتا ہے۔ اس سال بھی اس نے ہزار ارب پتیوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ایک دفعہ پھر رومین ابراموویچ برطانیہ کا امیر ترین شہری قرار پایا ہے اور اس کے اثاثوں کی ملکیت آٹھ بلین پاؤنڈ ہے۔ اس کی دولت میں ہر گھنٹے 57 ہزار پاؤنڈ (75 لاکھ 24 ہزار روپے) اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد فلپ گرین اور بھارت نژاد لکشمی متل کا نمبر آتا ہے۔ لکشمی متل نے چند برس پہلے سنٹرل لندن میں 72 ملین پاؤنڈ کا ایک محل خریدا تھا جو دنیا کا مہنگا ترین محل ہے اور اس لحاظ سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہو چکا ہے۔ اس فہرست میں سر انور پرویز اور عارف پٹیل سمیت سات پاکستانی بھی شامل ہیں۔ سنڈے ٹائمز کا کہنا ہے کہ پورے یورپ میں سب سے زیادہ ارب پتی برطانیہ میں آباد ہیں اور آبادی کے لحاظ سے بھی برطانوی باشندے یورپ بھر میں سب سے زیادہ امیر ہیں۔

مجھے اس فہرست اور اس فہرست میں شامل لوگوں کا پروفائل پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس میں بڑے بڑے امیر لوگ موجود ہیں۔ لوگوں کے پاس محلات ہیں، ہوائی اور بحری جہاز ہیں، وہ کار سازاداروں سے اپنے لئے مخصوص گاڑیاں بنواتے ہیں۔ ان کے دفتروں، کمپنیوں اور کارخانوں میں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کے جوتے اور کپڑے ڈیزائن کرنے کیلئے، ان کی خوشبویات اور باتھ رومز کی اشیاء بنانے کیلئے الگ کمپنیاں ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی ایک کمپنی برطانیہ کے صرف سو خاندانوں کیلئے جوتے بناتی ہے۔ ایک ڈینش کمپنی ان لوگوں کے کتوں اور بلیوں کیلئے خوراک بناتی ہے۔ یہ خوراک ان لوگوں کے گھروں پر پہنچائی جاتی ہے، یہ کبھی مارکیٹ نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی ذاتی زندگی، ان لوگوں کے اخراجات اور پسند و ناپسند ایک الگ کہانی ہے، یہ کہانی ہم کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔

سرِ دست ہم اس فہرست پر غور کرتے ہیں۔ اس فہرست میں ایک ہزار لوگ شامل ہیں لیکن آپ دلچسپ بات ملاحظہ کیجئے، ان ہزاروں لوگوں میں ایک بھی سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹ نہیں۔ یہ سب لوگ بیوپاری، تاجر اور صنعتکار ہیں۔ مجھے یہ جان کر حقیقتاً حیرت ہوئی کیونکہ اگر کبھی پاکستان میں ارب پتیوں کی فہرست بنی تو اس میں صرف سینکڑوں سیاستدان وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس شامل ہوں گے۔

یہ حقیقت، یہ نکتہ ہی پاکستان کی پسماندگی کی واحد وجہ ہے۔ معاشروں اور ریاستوں میں تاجر، بیوپاری اور صنعتکار پیسہ بنایا کرتے ہیں اور سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس ایسی پالیسیاں جن کے ذریعے صنعتکاروں، تاجروں اور بیوپاریوں کے اثاثے، اکاؤنٹس اور منافع ٹیکس کے دائرے میں آجائیں اور وہ لوگ اپنے مالیاتی جثے کے مطابق سرکاری خزانے میں جمع کرائیں، اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ خیراتی کاموں میں خرچ کریں اور عوامی فلاح کے منصوبوں میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں لیکن جس معاشرے میں سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس ارب پتی ہوں، وہ خود صنعتکار، بیوپاری اور تاجر ہوں، اس ملک میں کبھی ٹیکس کے مضبوط قوانین پاس نہیں ہو سکتے۔ جس ملک میں قانون توڑنے والے ہی قانون ساز ہوں، اس ملک

میں کبھی قانون کی پاسداری نہیں ہو سکتی اور جس ملک میں حکمرانی کی جڑیں جاگیرداروں کی ڈیوڑھیوں میں پیوست ہوں، اس ملک میں جاگیرداری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

آپ خود سوچئے اگر آپ کسی جواری کو ایس ایچ لگا دیں تو کیا اس تھانے کی حدود سے جوا خانے ختم ہوں گے ؟ کبھی ختم نہیں ہو سکتے ! لہٰذا برطانیہ جیسے معاشرے، پارلیمینٹ اور چیمبر آف کامرس کے درمیان ہمیشہ ایک خندق کھود کر رکھتے ہیں۔ وہ کسی سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس کو سرمایہ دار بننے دیتے ہیں اور نہ ہی کسی سرمائے دار کو سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس !

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے کہ جس ملک میں دواساز کمپنیاں اپنے کسی نمائندے کو محکمہ صحت کا وزیر مقرر کروالیں تو کیا اس ملک کی ادویات کی قیمتوں میں کمی آسکتی ہے ؟ جی نہیں، قیامت تک کم نہیں ہونگی جبکہ اس ملک میں اگر یہ محکمہ کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیا جائے جو عرصے تک خود دوائیں خرید تا رہا ہو جو اپنی جیب سے دوائیں خرید کر غریبوں میں تقسیم کرتا رہا ہو یا جس نے طویل عرصے تک لوگوں کے چندے سے چلنے والے کسی اسپتال میں کام کیا ہو، آپ دوسرے روز ہی اس وزارت میں تبدیلی محسوس کر لیں گے مگر یہ کام ہمارے معاشروں میں ممکن نہیں۔ ہمارے ملک میں تو اقتدار اور پیسے کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ہم خربوزوں کی رکھوالی کیلئے ہمیشہ گیدڑ بھرتی کرتے ہیں اور اس کے بعد چھلکے گنتے رہتے ہیں۔

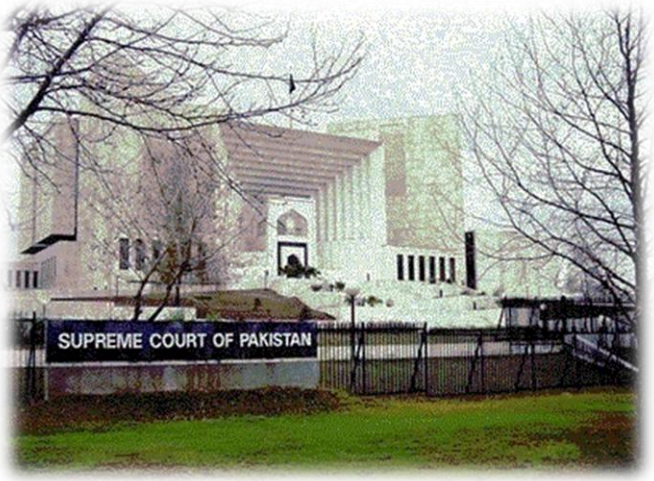

یقین کیجئے جن معاشروں میں ایک ہی شخص مدعی بھی ہو اور منصف بھی ان معاشروں میں کبھی انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ منتخب ہونے کے بعد گھر سے نکلے تو حضرت عمر نے پوچھا "امیر المومنین کہاں کا قصد ہے ؟" فرمایا،، اپنی دوکان پر جا رہا ہوں " حضرت عمر مسکرائے اور عرض کیا "جناب عالی ! جس بازار میں خلیفہ کی دکان ہو گی وہاں دوسروں کی دوکانیں کہاں چلیں گی ؟" حضرت ابو بکر صدیق نے اثبات میں گردن ہلائی اور گھر واپس چلے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب جرمنی پوری طرح تباہ ہو گیا تو وہاں ایک قانون پاس ہوا "کوئی صنعتکار، تاجر، بزنس مین، بیوپاری پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بن سکتا، اگر کوئی بننا چاہے تو اسے پہلے کاروبار بند کرنا ہو گا،، یہ قانون صرف یہیں تک محدود نہیں رہا۔ آج یہ حالت ہے جرمنی میں کوئی سیاستدان سیاست سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جرمنی میں کاروبار نہیں کر سکتا جبکہ ہمارے ملک میں دوکانوں، شاپنگ پلازوں، کارخانوں اور فارم ہاؤسز پر وزارت کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس کارخانے دار ہیں لہٰذا ہم ترقی کیسے کریں گے ؟

پاکستانی الیکشن کمیشن ہر سال پارلیمنٹ کے ممبران، حکومتی عہدیداران سے ان کے اثاثوں کی فہرست طلب کرتا ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے بہت سے سیاستدان اور حکمران تو اتنے غریب ہیں کہ وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔ امسال صرف سابقہ وزیر خزانہ کو ارب پتی اور وزیرِ داخلہ کو کروڑ پتی بتایا گیا ہے ۔ ہمارے بعض سیاستدانوں کے پاس رہنے کیلئے نہ گھر ہے اور نہ سواری کیلئے کوئی گاڑی، جن محلات میں وہ مقیم ہیں وہ یا تو ان کی اولاد کی ملکیت ہے اور وہ قیمتی کاریں بھی ان کے رشتہ داروں کی ملکیت ہوتی ہیں اور مالی لحاظ سے بھی وہ مقروض ہیں۔ محلات میں مقیم اور قیمتی گاڑیوں کے جلو میں سفر کرنے والے ان رہنماؤں کو کیا معلوم کہ اس ملک کے کتنے گھروں میں بھوک اور مسلسل مفلسی کے ہاتھوں کتنے افراد خودکشی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

اس وقت سیاستدان جو تماشہ لگائے بیٹھے ہیں اور پوری قوم کو ساری دنیا کے سامنے ایک تماشہ بنایا ہوا ہے دراصل اس کی روح یہ ہے کہ سیاستدان جب اقتدار کی غلام گردشوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی سب سے بڑی خواہش ریاست کی تمام طاقت پر مکمل قبضہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق ملک کے تمام وسائل پر کنٹرول حاصل کرنا ہوتا ہے جہاں یہ کسی کو جوابدہ نہ ہوں۔ بھٹو صاحب 1967ء نے پیپلز پارٹی کے نام سے ایک باندی جماعت قائم کی اور 2002ء تک، 35 سال کے عرصے تک اس ملک میں طاقت کے تین ستون تھے۔ ایک پیپلز پارٹی، دوسری مسلم لیگ اور تیسری قوت اس ملک کی افواج ! جب طاقت کے دو حصے ایک طرف ہو جاتے تھے تو اس ملک کی باگ ڈور وہ سنبھال لیتے تھے اور اس طرح اقتدار کی میوزیکل چیئر 35 سال تک اس ملک کی قسمت سے اپنے مفادات کے خوفناک کھیل میں مصروف رہی۔

اگست 2002ء میں اس طاقت کے تگڈم میں آزاد میڈیا کو بھی باریابی ملی ۔ پہلی دفعہ پاکستانی عوام نے اس میڈیا کو اپنے مسیحا سمجھتے ہوئے اس کا بھرپور ساتھ دینا شروع کر دیا اور اقتدار کی تگڈم کو جوابدہی کا احساس ہونے لگا اور اس طرح طاقت کے مراکز کی تعداد چار ہو گئی۔ پھر 2007ء میں آزاد عدلیہ کی حیرت انگیز تحریک شروع ہو جاتی ہے جو عوام اور میڈیا کے تعاون سے کامیابی حاصل کر کے پاکستانی اقتدار کی اس ،،چوکر،، کو اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے تمام غیر قانونی کاموں کا جواب طلب کرتی ہے تو گویا اس ملک کے طاقت کے مراکز کی تعداد اب بڑھ کر پانچ ہو کر ایک پنجہ کی شکل اختیار کر گئی ہے ۔ پچھلے پچاس برس سے اقتدار کی تگڈم نے ہمیشہ عدلیہ کو اپنا ماتحت سمجھا اور اپنی مرضی کے مطابق اس کو استعمال بھی کیا اور عدلیہ بھی طوعاً کرہاً اسی میں اپنی عافیت سمجھ کر ان کے ہر غلط اقدام کی توثیق کرتی رہی۔

لیکن 2007ء میں بے بس ، مجبور و مقہور عوام کی قربانیوں کے ساتھ اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ موجودہ حکومت کو جب اپنے اقتدار کا سنگھاسن ڈولتا ہوا نظر آیا تو طاقت کے دوسرے مراکز نے موجودہ حکومت کو آزاد عدلیہ کی بحالی پر مجبور کر دیا اور اب طاقت کے اس سرچشمے یعنی عدلیہ نے اپنی اس آئینی ذمہ داری کا مطالبہ کر دیا جو ملک کے آئین میں اس کا حق ہے تو اقتدار میں بیٹھے فرعونوں نے اس کا بہت برا منایا۔ آزاد عدلیہ آخر کیا کہہ رہی ہے۔ آرٹیکل 177 یا آرٹیکل 6 کا فی الحال ذکر نہ بھی کریں لیکن آزاد عدلیہ ان اقتدار کے نشے میں بدمست افراد سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں سے اخلاقیات کا جو سبق آپ بھولے بیٹھے ہیں اس پر اب عمل کرنا ناگزیر ہے ۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے سرمایہ دار، سیاستدان، وزیر مشیر، سفیر، جرنیل یا بیوروکریٹس اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرلیں لیکن ہماری موجودہ حکومت کو یہ بالکل گوارہ نہیں کہ ملک کو لوٹنے کا ایک اور نادر موقع ملا ہے اور طاقت کا یہ پنجہ نہ صرف ان کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے بلکہ وہ پہلی سے لوٹی ہوئی قومی دولت کو واپس لانے کا مطالبہ کر رہا ہے اس لئے موجودہ حکومت کو اب آنے والے انقلاب میں اپنی موت نظر آرہی ہے جس کی بناء پر آئے دن قوم کو مختلف بحرانوں میں مبتلا کر کے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگا کر پوری قوم کی توجہ اپنی بد عنوانی سے ہٹا کر خود کو مظلوم بنانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے لیکن اب قوم مزید دھوکہ کھانے کو تیار نہیں اور اب وہ آزاد عدلیہ کے ساتھ آزاد میڈیا کو اپنا مسیحا جانتے ہوئے ایک صاف اور شفاف نظام چاہتے ہیں جہاں ہر کسی کو انصاف ملے اور ظالموں کا بڑا عبرت ناک احتساب ہو۔ میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس دفعہ پاکستان میں یہ ہو کر رہے گا چاہے اس کیلئے ظالم بد عنوان کو انجام تک پہنچانے کیلئے کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

رہے نام میرے رب کا جس نے ظلم، فسق و فجور کے خاتمے کا حکم دیا ہے۔

بتوں کو آج سروں پر سجا کے نکلے لوگ
وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

بروز اتوار 14 ربیع الاوّل 1431ھ 28 فروری 2010ء

شکاری

دنیا امن وسلامتی کی آرزومند ہے، کم سے کم زبان سے تو سب اسی امن اور سلامتی کے دعویدار ہیں لیکن اس امن وسلامتی کی ایک شرط ہے ایک بنیاد ہے اگر یہ شرط پوری نہ ہو اور یہ بنیاد میسر نہ آئے تو ہماری اس انسانی دنیا کا امن اور سلامتی فقط ایک دعویٰ اور خالی آرزو ہی رہے گی۔ وہ شرط اور بنیاد عدل ومساوات ہے۔ جب تک عدل وقائم نہ ہو اور سب کے ساتھ برابر کا سلوک نہ ہو سکے تو امن وسلامتی کا دعویٰ بھی جھوٹا ہے اور اس کیلئے آرزو بھی خام خیالی ہے کیونکہ امن وسلامتی سے پہلے عدل ومساوات ضروری ہے اور عدل وانصاف کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے۔

سوئے اتفاق اور بدقسمتی سے دنیا میں تصادم کی فضا ہے، ظلم وناانصافی ہے اور سب سے یکساں سلوک مفقود ہے۔ یہ بھی عجب ستم ظریفی ہے کہ یہ ظلم اور ناانصافی صرف مسلمانوں سے روا رکھی جارہی ہے۔ ظالمانہ تصادم کی فضا کا عملی شکار بھی مسلمان ہیں۔ اس سے بھی عجیب ترین بات یہ ہے کہ اس تصادم اور ظلم وفساد کی جڑ بھی مسلمانوں کو ٹھہرایا جارہا ہے اور عجیب ترین بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ کیفیت چپ چاپ برداشت کرلی ہے، کم سے کم دنیا بھر کے مسلم حکمران تو بالکل چپ ہیں، اس پر احتجاج بھی نہیں کررہے جیسے کچھ دیکھتے نہ ہوں، جیسے کچھ سمجھتے نہ ہوں۔ اس المناک صورت حال کا سبب یہ ہے کہ یہاں عوام اور حکمرانوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہ حکمراں اسلام مخالف قوتوں کے رحم وکرم پر ہیں اور عالمِ اسلام ظالم لٹیروں کی زد میں ہے۔

اگر صحیح جمہوری فضا ہوتی تو دنیا بھر کے مسلم عوام اور اسلامی دنیا کی یہ حالت نہ ہوتی۔ آج بھی اگر مسلم عوام اور ان کے حکمراں متحد ہو کر اس امتیازی سلوک کے خلاف زوردار آوازیں اٹھائیں تو یہ فضا بدل سکتی ہے۔ امن وسلامتی کے جھوٹے دعویدار اپنی اپنی قوم کے سامنے رسوا ہو کر بے اثر ہو سکتے ہیں کیونکہ حسنِ اتفاق سے ان کے اپنے اپنے ملک کے عوام جمہوری قوتوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں اور یہ عوامی جمہوری قوتیں جس طرح اپنے جھوٹے حکمرانوں کو برداشت نہیں کرتیں، وہ پسماندہ قوموں سے ظلم وناانصافی اور ڈبل معیار کی بھی مخالف ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی دنیا کے عوام دنیا کے جمہوری عوام تک رسائی اور ربط کی صورت پیدا کریں تو پھر وہی ہو سکتا ہے جو عراق میں بش اور ٹونی بلیئر کے ساتھ ہوا۔

گو عراق ابھی تک آزاد نہیں ہوا لیکن عراقی عوام آزاد ہو گئے ہیں کیونکہ انہوں نے ظلم کو مسترد کر دیا ہے اور ان کی اور ان کے قاتل کی حقیقی صورتحال دنیا کے جمہوری عوام تک پہنچ گئی ہے جو اپنے حکمرانوں سے حساب لے سکتے ہیں اور لیتے ہیں۔ اگر آپ کی نظر تاریخ پر ہے تو آپ محض مسلمان ہونے کے سبب اس ظالمانہ تہمت اور تصادم سے بچ بھی سکتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ پر جارحانہ چڑھائی سے صلیبی جنگوں کا آغاز کس نے کیا بلکہ یہ بھی کہ یہ کس نے کروایا؟ چار سو سال تک انسانیت کا خون پانی کی طرح بہتا رہا جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، مال لوٹا گیا، ملک چھینے گئے، یہ سب سلوک مسلمانوں سے تھا اور یورپ کے صلیبیوں نے کیا تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگیں کس نے شروع کیں؟ پرانے سامراجیوں نے۔ آج یہ ظالمانہ

تصادم کی فضا کس نے پیدا کی؟ آج کے نئے سامراجیوں نے۔ مگر یہ سب کچھ کس نے کرایا؟ مسلمانوں کے اصلی دشمن یہودیوں نے، جی ہاں! خفیہ وسیہ کاریوں میں یہودیوں کا جواب نہیں۔

یقین نہیں آتا تو دیکھ لیجئے ہٹلر کے آنے تک مسیحی دنیا خصوصاً یورپ یہودیوں کا دشمن تھا، ان سے نفرت کرتا تھا، اپنے معاشرے سے انہیں نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ دونوں عالمی جنگوں میں اگر سود خوروں کے قرضے نہ ہوتے تو یہ جنگیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی تھیں۔ سودی کاروبار کس کے پاس تھا؟ انہی یہودیوں کے ہاتھ میں۔ دونوں جنگوں میں لگنے والے یہودی سرمائے نے مغرب کو پنجۂ یہود میں جکڑ دیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ سے اور بعد کے حالات سے تو ساری دنیا سود کے جال میں پھنس گئی ہے اور یہ جال یہودیوں شکاریوں کے ہاتھ میں ہے۔

گزشتہ صدی کے دوران سود خوروں نے سودی پیسے سے مسلمان حکمرانوں کو خریدنا چاہا تھے مگر منہ کی کھائی، یہی پیسہ مغرب کے حکمرانوں کو جکڑنے کیلئے دیا گیا۔ پہلے یورپ کو پھر امریکا کو، چنانچہ آج سب پنجہ یہود میں ہیں لیکن یہودی وسیہ کاری ملاحظہ ہو کہ وہ انہی پرانے اور نئے سامراجیوں سے مسلمانوں کو پٹوا رہا ہے اور مسلمان سوتے رہے یا سلا دیئے گئے، آج بھی سو رہے ہیں یا سلائے جا رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں سے یہودی عداوت اور حسد ایک فطری رد عمل ہے۔ اس عداوت اور حسد کی ایک لمبی تاریخ ہے جو طویل بھی ہے اور تلخ بھی۔ ایک وقت تھا جب مکہ اور عرب کے تمام بت پرست اور یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد تھے، آج بھی متحد ہیں، پہلے مشرکین مکہ اور یثرب و خیبر کے یہودی اسلام کے خلاف متحد تھے۔ آج بھی تل ابیب اور نئی دہلی نے ایک مدت کے بعد ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے۔ پہلے اتحاد خفیہ تھا لیکن ایڈوانی اور شیرون نے اسے ایک کھلی حقیقت بنا کر مسلمان دنیا کو پیغام دیا ہے کہ کل بھی دونوں کا دشمن مشترک تھا اور آج بھی مشترک ہے۔

اس اشتراک، عداوت اور حسد نے یہود و ہنود کو مسلمانوں کے خلاف ایک بنا رکھا ہے۔ یہود و ہنود دونوں کی خواہش ہے کہ نئے اور پرانے سامراجی انہیں تعاون کیلئے اپنے مہرے بنائیں تو خونِ مسلم میں ہاتھ رنگ کر من کو شانتی ملے اور لوٹ ماریں سے کچھ حصہ بھی ملے مگر قدرت نے نئے سامراجیوں کو ننگا کر دیا ہے اور امریکا اور مغرب کے جمہوریت پرست عوام انہیں تاریخ کی گمنامی میں دھکیل رہے ہیں مگر یہ یہود و ہنود اب بھی نہیں بدلے۔ وہ عدل و انصاف کی ہر آواز پر تلملا اٹھتے ہیں، وہ ہر صورت میں کچھ نہ کچھ لے مرنے کی فکر میں رہتے ہیں کہ فلسطین اور کشمیر میں کسی نہ کسی بہانے مسلمانوں کا خون بہاتے رہیں۔

مسلمانوں کیلئے یہ موقع ہے کہ مغرب کے امن پسند اور انصاف کے داعی تنظیموں سے اپنا رابطہ از سرِ نو مرتب کریں۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر مسلم ملکوں کیلئے داخلی، علاقائی اور عالمی مسائل پیدا کر کے الجھانے کی سر توڑ کوشش موجودہ وسیہ کاری اور خفیہ سازش کا حصہ ہے۔ صہیونیوں کو پہلے خطرہ صرف پاکستان کے ایٹمی اسلحے سے تھا مگر اب تازہ خطرہ ایران سے ہے۔ اگر عراق میں شیعہ اکثریت کے حق کو تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس سے ایران کو یقیناً تعاون اور فائدہ ہو گا اور اس سلسلے میں اس نے ایک طرف عرب ممالک کو ممکنہ ایرانی خطرے کے پیش نظر اس خطے کے مسلمانوں کی حمائت

حاصل کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے لیکن عراق میں مسلمانوں کے تمام دھڑے صہیونی سازشوں سے باخبر ہو گئے ہیں اور ان کی یہ پالیسی بظاہر ناکام ہو گئی ہے۔

عراق میں مسلمانوں کے تمام دھڑوں کے اس اتفاق نے صہیونی طاقتوں کو از حد پریشان کر رکھا ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کا اتحاد کل فلسطین کی آزادی کا سبب بھی بن سکتا ہے اور کشمیر کو بھی بھارتی ظالم ہندو استبداد سے بھی نجات مل سکتی ہے۔ صہیونی تو اس علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی طرح وہ ساؤتھ ایشیا میں ہنود کی بالادستی میں ان کی مدد کر رہے ہیں اس لئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان عالمی امن پسند چاہتے ہیں اور اسی طرح وہ ساؤتھ ایشیا میں ہنود کی بالادستی میں ان کی مدد کر رہے ہیں اس لئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان عالمی امن پسند قوتوں سے رابطہ قائم کر کے یہود و ہنود کے ان ناپاک ارادوں کو ناکام بنا دیں۔

ساؤتھ ایشیا میں لالہ لبھورام کشمیر میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو اسرائیل کا جنونی دہشت گرد فلسطین میں کھیل رہا ہے۔ آزادی مانگنے والا ہر کشمیری بھارت کے نزدیک پاکستان کا ایجنٹ ہے اس لئے اسے سات لاکھ فوج مارنے میں حق بجانب ہے۔ پاکستان کے حکمراں تو اقتدار کی کرسی کیلئے کشمیریوں کی ہر قربانی کو پس پشت ڈالتے ہوئے بھارت کے ساتھ مذاکرات کیلئے انتہائی بے چین نظر آتے ہیں جب کہ بھارت انتہائی مکاری اور ہوشیاری کے ساتھ پاکستان کو دباؤ میں رکھنے کیلئے اصل مسائل پر مذاکرات کرنے کی بجائے دوسرے مسائل میں پاکستان کو الجھا رہا ہے۔ لیکن کشمیری اب اس بات سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اگر افغانستان جیسا ملک دنیا کی سب سے بڑی سپر طاقت اور اس کے اتحادیوں کو شکستِ فاش پر مجبور کر سکتا ہے تو بھارتی بنیا تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کشمیریوں نے اپنے خون کے ساتھ جو حریت کی داستانیں رقم کی ہیں اور اپنی آزادی کی خاطر جو بیش بہا قربانیاں دی ہیں، وہ کبھی رائیگاں نہیں ہو سکتیں اور وہ دن بہت قریب ہے جب کشمیری اپنی اس فصل کو آزادی کی نعمت میں وصول کر کے رہیں گے انشاء اللہ!

رہے نام میرے رب کا جو حی القیوم ہے!

بروز منگل 16 ربیع الاوّل 1431ھ 2 مارچ 2010ء

مصلحت کے بوجھ

اس کا بچپن لندن کے شمال میں واقع ایک علاقے پوٹن میں گزرا۔ اس کے والدین بنگلہ دیش سے تلاشِ رزق کی خاطر اس ملک کے دار لحکومت آ نکلے جس نے ان کے آبائی وطن پر ڈھائی سو سال پہلے سراج الدولہ کو شکست دیکر قبضہ جمایا تھا۔ وہ بنگال جس کی ململ پوری دنیا میں اپنی نفاست اور باریکی کی وجہ سے مشہور تھی، جب ان فرنگیوں کے قبضے میں آیا تو مانچسٹر کی کپڑے کی صنعت کو دوام دینے کیلئے اس خوبصورت ململ کی صنعت کو تباہ کر دیا گیا۔ اس کے والدین نے اپنی اس ذہین بچی کا نام شبینہ بیگم رکھا۔ انہوں نے اپنی لختِ جگر کو ایک انتہائی نامور اسکول ڈنبرہ ہائی اسکول میں داخل کیا۔ اس اسکول میں 80٪ سے زیادہ طالبِ علم مسلمان تھے۔ شبینہ اسکول کی ان چند ذہین طالبات میں شمار ہونے لگی جن کیلئے مستقبل کے کسی بھی دروازے پر دستک دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ شبینہ اسکول میں عمومی طور پر شلوار قمیض پہن کر آتی، یہ لباس اس کی اکثر ساتھی مسلمان لڑکیاں پہنتی تھیں۔

پھر ایک دن جب گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد ستمبر 2002ء میں اسکول کھلا تو پندرہ سالہ شبینہ اچانک اپنے اساتذہ اور اسکول کے طالب علموں کو ایک لمبے گاؤن اور حجاب میں نظر آئی۔ وہ اسکول جس میں 80٪ سے زیادہ مسلمان طلبہ زیرِ تعلیم تھے اچانک اس کیلئے اجنبی ہو گیا۔ اسے اسکول کی انتظامیہ نے بلایا اور سختی سے پوچھا کہ یہ تم کیا پہن کر آئی ہو؟ شبینہ نے بڑے مؤدب انداز میں جواب دیا کہ اسے میرے مذہب میں "جلباب" کہتے ہیں اور چونکہ میں اب ایک بالغ مسلمان لڑکی ہوں، اس لئے میرے ستر کیلئے یہ لازم ہے۔ اسکول انتظامیہ نے مثال دیتے ہوئے کہا جو باقی مسلمان لڑکیاں تمہارے ساتھ اسکول میں پڑھتی ہیں ان کو کبھی اس لباس میں ملبوس نہیں دیکھا؟ وہ شلوار قمیض سے لیکر نیکر تک پہن کر آتی ہیں ۔ شبینہ کا جواب وہی تھا جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان بچی کا ہونا چاہئے۔ اس نے بڑے پر عزم انداز میں جواب دیا کہ میں نے جہاں تک اسلام کو پڑھا ہے اس کے مطابق میرے لئے یہی لباس اور یہی ستر ضروری ہے۔ مجھے اللہ کے ہاں اپنے اعمال اور اپنی احتیاط کا جواب دینا ہے۔ انسانی حقوق کے علمبر دار وراس اسکول کی انتظامیہ نے شبینہ کو کہا کہ وہ کل سے اسکول نہیں آئیں گی۔

اسکول میں ذہین ترین طالبہ کا اعزاز رکھنے والی اور مستقبل میں ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھنے والی یہ ہونہار بچی جب اسکول سے نکالی گئی تو اس نے نہ تو اس ماحول سے سمجھوتا کرنے کا سوچا اور نہ ہی اپنے روشن مستقبل کا واسطہ دینے والے لوگوں کی بات مان کر لباس بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے حق کیلئے قانون کا سہارا لینے کا ارادہ کر لیا اور اس پندرہ سالہ کمزور شبینہ نے عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور اس نے اسکول کی انتظامیہ کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ شبینہ کا دفاع کرنے والا وکیل ایوان اسپنسر ایک عیسائی تھا اور ڈنبرہ ہائی اسکول کا دفاع کرنے والا وکیل ایک "روشن خیال" مسلمان جاوید اقبال تھا۔

جسٹس بینٹ کی عدالت میں کئی ماہ تک یہ مقدمہ چلتا رہا، ماڈریٹ اسلام اور روشن خیالی کی مثالیں دی جاتی رہیں، دنیا بھر کے مسلمان ممالک میں عورتوں کے لباس اور وضع قطع کو بیان کیا گیا۔ پندرہ سالہ شبینہ اس عدالت کے روبرو بیٹھی یہ سب بحث سنتی رہی۔ وہ بچی جسے اس بات کا ادراک تھا کہ وہ لباس جسے "جلباب" کہتے ہیں صرف وہی اسے پوری طرح ڈھانپ سکتا ہے، اس معاشرہ میں چاروں طرف پھیلی، تیکھی اور چبھنے والی نظروں سے بچا سکتا ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد گھومتے، فقرے کستے اور غلیظ نظروں سے ٹٹولتے کریہہ المنظر مردوں کو دیکھا تھا، دونوں طرف سے دلائل پیش ہوئے۔ شبینہ کے پاس ایک ہی مضبوط دلیل تھی کہ اس کے رب کا حکم ہے اور بحیثیت انسان یہ اس کا پیدائشی حق ہے کہ وہ جیسا لباس چاہے وہ پہنے، بس اسے اخلاق و تہذیب کے دائرے میں ہونا چاہئے اور اس کا لباس تو اخلاقیات کی معراج اعلیٰ پر فائز تھا، اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔

بحث تمام ہوئی اور پندرہ جون 2004ء کو جسٹس بینٹ نے عدالتِ عالیہ کی کرسی پر بیٹھے فیصلہ سنا دیا۔ شبینہ اپنا کیس ہار چکی تھی۔ چھ سال اسکول سے غیر حاضر رہ کر لڑنے والی کئی بار ہارنے کے باوجود آج بھی اسی طرح پر عزم ہے اور اپنی تعلیم کو بہر حال اس نے گھر میں بیٹھ کر اعلیٰ گریڈ کے ساتھ مکمل کر لیا ہے۔ اس نے کہا میں اب اسی لباس اور اسی ستر کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کیلئے یونیورسٹی جانے کی کوشش کروں گی اور اگر وہاں انہی پابندیوں نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ پھر بھی اپنی تعلیم کو اسی لباس اور اسی ستر میں مکمل کر کے اس بات کو ثابت کرے گی کہ میرا یہ لباس اور ستر کسی بھی طرح میری تعلیم میں مانع نہیں ہے لیکن میرے لئے باعثِ شرم وہ دلائل ہیں جو اسکول کے "روشن خیال" مسلمان جاوید اقبال نے عدالت کے سامنے پیش کئے۔

اس نے یہ کہا کہ اس اسکول میں آٹھ سو کے قریب مسلمان طلبہ اب بھی زیرِ تعلیم ہیں، ان میں کچھ شلوار قمیض پہن کر آتے ہیں اور اس لباس کو علاقے کی مسجد کی کونسل نے مسلمانوں کیلئے موزوں لباس قرار دیا ہے ۔ شبینہ کے ملک بنگلہ دیش اور میرے ملک پاکستان کے اسکولوں اور ان کے یونیفارم کی مثالیں دی گئیں اور پھر جج نے وہی کیا جو مسلمان معاشروں میں دیکھا تھا، جو اس کے علماء مصلحت کے تحت کہہ جاتے تھے۔ مجھے تو ڈر اب اس بات کا ہے کہ دوبارہ یونیورسٹی میں شبینہ کے لباس پر نئے سرے سے بحث شروع ہوئی تو لاہور پاکستان کی لمز یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات کی وہ تصاویر جو میرے سامنے پڑی ہوئی ہیں، ان تصاویر کو اسی روشن خیال وکیل جاوید اقبال نے عدالت میں پیش کر دیا تو پاکستان جس کو کبھی "اسلام کا قلعہ" کہتے ہوئے ہماری زبان نہیں تھکتی تھی، یقیناً اپنا مقدمہ بری طرح ہار جائے گی۔

میں جب کبھی اپنے ارد گرد دیکھتا ہوں تو صبح ہزاروں کی تعداد میں بچیاں اسکول کے مروجہ یونیفارم میں اپنے والدین کے ہمراہ اسکول جا رہی ہوتی ہیں۔ مستقبل کی خواہشوں میں ڈوبے اور مصلحت کے بوجھ تلے ہم والدین نے کبھی بھی اپنی بچی کو یہ حوصلہ ہی نہیں دیا کہ وہ ایک دن اسکول میں یونیفارم کے اوپر لمبا سا گاؤن اور سکارف پہن کر چلی جائے، پھر تمسخر کا نشانہ بنے، تضحیک سنے، روتی ہوئی گھر آئے اور آپ اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہیں "نہیں

ہم لڑیں گے، یہ تو تم اپنے رب کا فرمان پورا کر رہی ہو۔ "کیا ایسا کبھی ہمارے کسی ماڈرن، نیم ماڈرن، یا سرکاری اسکول میں ہوا۔ کیا ہم سب مصلحت کی کند چھری سے لمحہ لمحہ ذبح ہونے والے والدین سوال کر سکتے ہیں برطانیہ کے اس جج سے کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں دیا، ہرگز نہیں!

جہاں مصلحت حق پر غالب آجائے اور روشن مستقبل آخرت سے بیگانہ کر دے وہاں شبینہ بیگم اپنا مقدمہ ہارا ہی کرتی ہے۔ اس لئے کہ اسے کیس جہاں جیتنا ہے وہاں معیار مصلحت نہیں، اطاعت ہے! یہی وجہ ہے کہ برسوں پہلے امریکی اٹارنی جنرل نے بھری عدالت میں بڑی نفرت سے کہا تھا کہ پاکستانی تو چند ہزار ڈالر کی خاطر اپنی ماں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور بعد میں اس نے اپنے اس بیان پر معذرت کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس بیان پر بہت سے پاکستانیوں کے دلوں پر جو قیامت بیت گئی تھی لیکن اس کے جواب میں ہمارا کردار کیا رہا؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی بیٹی ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے کیونکہ ہمارے ملک کے فاسق کمانڈو نے ڈالروں کے عوض ہی اپنی قوم کے بچوں اور بچیوں کو امریکا کے ہاں فروخت کر دیا تھا جس کا ذکر وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنی کتاب میں کر چکا ہے! روشن خیال وکیل کو ایسے روشن خیال لیڈر کے پہلو میں بیٹھا دیکھ کر مجھ کو کوئی تعجب نہیں ہوا!

رہے نام میرے رب کا جس نے ہمیں رحمۃ العالمین ﷺ کا امتی بنایا

کیا نام کا پوچھو ہو کہ ہے ننگ میرا نام
اور ننگ کا بس یہ ہے کہ دنیا ہے نہ دیں ہے
کچھ اس طرح اب شہر میں رقصاں ہیں بگولے
بے چادر و بے سایہ ہر اک پردہ نشیں ہے

بروز جمعرات 18 ربیع الاوّل 1431ھ 4 مارچ 2010ء

وڈیرہ سائیں

امانتوں کے لوٹانے کا وقت آن پہنچا ہے، آزمائش کی گھڑی ہے، مشکل یہ ہے کہ جبر اور بے بسی نے محروم طبقوں سے یہ احساس تک چھین لیا ہے کہ اقتدار میں بامعنی شراکت ان کا فطری حق ہے۔ اگر کہیں بیداری کی ہلکی سی لہر دکھائی دیتی بھی ہے تو منظم نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات! اقتدار مخصوص طبقے کے ہاتھ میں رہتا ہے جو اونچے سرکاری افسروں، بڑے بڑے زمینداروں اور اہل ثروت پر مشتمل ایک نہ بدلنے والی تکون ہے۔ حکومت کیا، سارا معاشرہ اسی مثلث کی مٹھی میں بند ہے۔ یہ لوگ اپنے مفادات کیلئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے ۔عوام کے نام کی مالا کبھی کبھار جپ لیا کرتے ہیں تاکہ جمہوری طرزِ حکومت سے ان کی وابستگی اپنے پرائے پر عیاں رہے۔

بظاہر تبدیلی کے آثار نہیں آتے، کمزور طبقوں کو حیوانی سطح تک نیچے دھکیل دیا گیا ہے۔ وہ پنجروں میں بند ان پنچھیوں کی طرح ہیں جنہیں رہائی ملے تو شائد مر ہی جائیں۔ وہ کھلی فضاؤں میں زندہ رہنے کے اہل ہی نہیں رہے۔ اعتبار نہ آئے تو مزارعوں کی بود وباش کا جائزہ لیں، قرض کے جال میں جکڑے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ جاگیرداروں کے سایہ میں پل کر جوان ہوتے ہیں، اسی کا دیا کھاتے ہیں، اسی کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں، کسی اور کے ہاں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان میں سے کسی کے محنتی اور جفاکش ہونے کی شہرت سن کر کوئی اور زمیندار اسے اپنے ہاں رکھنا چاہے تو وہ اسے اس کے مالک کے ساتھ معاملہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے نام کا لکھا ہوا تمام،، قرض،، چکائے اور یوں،، خرید،، کر اسے لیجائے، گویا انسانوں کی خرید و فروخت اب بھی جاری و ساری ہے۔

آج کے زمانے میں بھی خیر سے چند جاگیر دار ایسے ہیں جن کی نجی جیلوں میں کئی درجن ہاری خاندان بستے ہیں۔ جبر کا یہ شکنجہ عورتوں اور بچوں تک سے نرمی نہیں برتتا۔ وڈیرے سائیں سے پوچھیں کہ اکیسویں صدی کے زمانے میں وہ فرعون کے زمانے کا نظام کیوں چلا رہا ہے تو بڑے بھولے پن سے سائیں جواب دیتا ہے کہ،، یہ میرے جدی پشتی نوکر چاکر ہیں، اچھے برے وقت میں ان کے کام آتا ہوں، شادی بیاہ کا سارا خرچہ اٹھاتا ہوں، بیمار پڑ جائیں تو علاج کرواتا ہوں، مر جائیں تو کفنانے دفنانے یا کریا کرم کا اہتمام کرتا ہوں اور ان سب کاموں پر پیسہ لگتا ہے۔ ان کے پاس دینے کو کچھ ہوتا نہیں، بس ان کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے۔ قرض چکا کر جہاں مرضی چلے جائیں۔،، وڈیرہ سائیں یہ نہیں بتلاتا کہ ہاری کو مزدوری ہی فقط اتنی ملتی ہے جس سے بمشکل زندگی کی ڈور چلتی ہے۔ وہ لاکھ جتن کرے، وہ کچھ نہیں بچا سکتا، لہٰذا قرض لئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ سانس کی ڈور،، سائیں،، کے ادھار سے بندھی رہتی ہے۔

یہی حال نہ صرف بھٹہ مزدوروں کا ہے بلکہ یہ لعنت معاشرہ میں دور دراز تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان گنت انسان جو مفلس والدین کے ہاں پیدا ہونے کا جرم کرتے ہیں، کوئی ہنر سیکھے بغیر اس منڈی میں بہت سستے بکتے رہتے ہیں۔ جسمانی مشقت کے سوا ان کے پاس بیچنے کیلئے کچھ اور ہوتا ہی نہیں پھر بے وسیلہ لوگوں کے ہاں بچے بھی زیادہ جنم لیتے ہیں گویا غریبوں کی آبادی میں خوشحال طبقے کی نسبت کئی گنا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دنیا بھر میں منڈی کی معیشت کا

راج ہے، طلب کی نسبت رسد جتنی زیادہ ہو گی اس مال کے دام اتنے ہی گرتے جائیں گے۔ بے ہنر مزدور تھوک کے بھاؤ ملتے ہیں اس لئے اسے یا تو کام ملتا ہی نہیں یا واجبی اجرت پر انسانوں کا بڑھتا ہوا ہجوم یوں افلاس اور جہالت کی دوہری چکی میں پستا چلا جا رہا ہے۔

معمولی جائیداد رکھنے والوں کا حل بھی چنداں مختلف نہیں۔ تقسیم در تقسیم کے چکر نے ان کے پلے کچھ نہیں چھوڑا۔ زرعی زمین کے چھوٹے مالک تو دہرے عذاب میں مبتلا ہیں۔ چند ایکڑ زمین ان کے پاؤں کی ایسی زنجیر ہے جس سے وہ کسی صورت جان نہیں چھڑا سکتے۔ پشتوں سے انہیں باور کرایا گیا ہے کہ زمین کاشتکار کی ماں ہے، بوجھ بن جائے تو پھر بھی گلے سے لگائے رکھنی پڑتی ہے۔ نہ ڈھنگ سے روزی کما سکتے ہیں، نہ محنت مزدوری کیلئے شہروں کا رخ کر سکتے ہیں۔ ناکافی آمدنی کی وجہ سے چھوٹے کاشتکار دھڑا دھڑ خطِ افلاس سے بھی نیچے گرتے جا رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ان کی پتا سننے والا کوئی نہیں۔ تعداد کے حساب سے تو دیہی آبادی کا دو تہائی حصہ مزدوروں، مزارعوں اور چھوٹے مالکان زمین پر مشتمل ہو گا لیکن ان میں سے اسمبلیوں میں شاذونادر ہی کوئی پہنچتا ہے۔

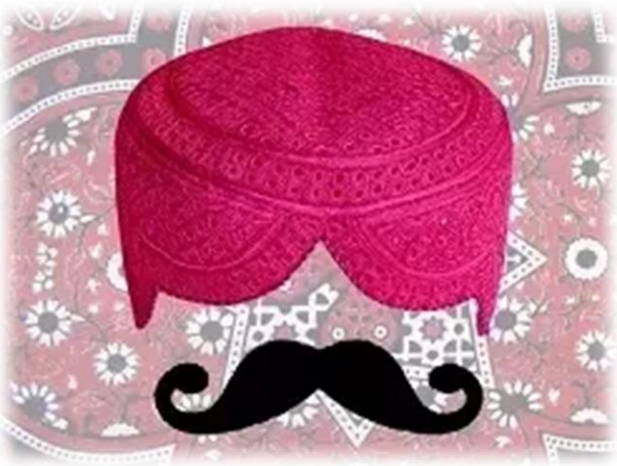

تاریخ میں سر چھوٹو رام کا نام رہ گیا ہے۔ قوم کا جاٹ تھا، باپ چند ایکڑ اراضی کا مالک تھا۔ اس نے بیٹے کو پڑھنے ڈال دیا، بچہ ہوشیار تھا، نہ صرف پڑھ لکھ گیا بلکہ ہوتے ہوتے متحدہ پنجاب میں وزیرِ مال کے عہدے تک جا پہنچا۔ ترقی کی شاہراہ پر منزلیں طے کرتے ہوئے اس کا خون سفید نہیں ہوا، اسے یاد رہا کہ بنیا مہاجن اور ساہوکار کاشتکاروں کا کیسے کیسے خون چوستے تھے۔ ان درندوں کا راستہ روکنے کیلئے اس نے نہ صرف اسمبلی سے قانون پاس کروائے بلکہ ان پر مؤثر عمل درآمد بھی کروایا۔ یوں لاکھوں ایکڑ اراضی ہندو بنیوں کے پاس رہن رکھے جانے یا فروخت ہونے سے بچ گئی۔

کہنا یہ مقصود ہے کہ اب اس خطے میں کوئی چھوٹا آدمی انتخاب لڑ ہی نہیں سکتا۔ اس کے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ نہیں سکتے اس لئے کسی اچھے عہدے پر تعیناتی بالکل ناممکن ہے۔ اکا دکا اگر کوئی بن بھی جائے تو وہ اشرافیہ میں جاتے ہی اپنی جڑوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ عوام ووٹ دیتے ہیں مگر اقتدار میں کسی سطح پر انہیں شراکت نہیں ملتی۔ سرکار کے ایوانوں میں رسائی بڑے لوگوں تک محدود ہے جو تمام تر اختیارات اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ واضح طبقاتی تقسیم بالانشینوں کو اس لئے نظر نہیں آتی کہ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

برطرف محکوم طبقے میں اتنی رمق نظر نہیں آتی کہ وہ شرکتِ اقتدار کا کوئی مطالبہ تک کر سکیں۔ سیاسی جمود نے ہر طرف بے حسی مسلط کر دی ہے۔ بنیادی حقوق کی پاسداری تک کا شعور مدھم پڑ گیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کہ ان کے اعضاء ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ طرح

طرح کے شربت ایک بوتل میں انڈیل دیئے گئے ہیں۔ گڈ مڈ کا یہ عالم ہے کہ کالے نیلے پیلے اودھے رنگ ایک دوسرے پر چڑھے ہیں ایسے میں تبدیلی آئے تو کیونکر؟ بظاہر امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مگر تاریخ اشارہ دیتی ہے کہ کہ حبس اور گھٹن دیرپا نہیں ہوتے۔ یہ ہوا کہ دعوت دیتی ہے، فرق اتنا کہ رکاوٹیں نہ ہونے کی صورت میں ہولے سے بادِ نسیم چلتی ہے وگرنہ طوفانِ بادِ باراں تباہی مچاتا ہے۔ ہمارے اہل حکم بصیرت سے کام لیتے ہوئے وہ امانتیں جمہور کو لوٹا دیں جو کسی کونے کھدرے میں رکھ کر بھول گئے ہیں تو معاشرہ مار دھاڑ سے بھرپور اکھاڑ پچھاڑ سے بچ جائے گا اور عروجِ آدم کے زینہ پر ہم دو قدم آگے بڑھ جائیں گے! وگرنہ یہ نوشتۂ دیوار

ہے کہ اب حق دار کو زیادہ دیر تک دیوار سے نہیں لگایا جاسکتا۔ قوم کی نظریں اب عدل کے حصول کیلئے اعلیٰ عدلیہ پر جمی ہوئی ہیں اور وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ملک لوٹنے والے لٹیرے وراہزن اب کسی بھی بہروپ میں آئیں قوم ان کو بے نقاب کر کے رہے گی۔ یقین نہ آئے تو تھائی لینڈ کی طرف دیکھ لیں جہاں تھائی وزیر اعظم کے ساٹھ بلین بھات کے اثاثے عدالت نے ضبط کرنے کا حکم دیا ہے!

رہے نام میرے رب کا جس کے گھر میں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں!

مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

بروز ہفتہ 20 ربیع الاوّل 1431ھ 6 مارچ 2010ء

موہن لال سے من موہن سنگھ تک؟

تقریباً دو صدیاں پہلے کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کچھ ہندو پنڈتوں نے مستقل رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت کشمیری مسلمانوں نے اپنے حسن سلوک سے ان کو صدقِ دل سے خوش آمدید کہا اور اس طرح آہستہ آہستہ مزید ہندو افراد بھارت سے کشمیر میں پہنچنا شروع ہو گئے اور اس طرح یہ تمام ہندو افراد کشمیری پنڈت کے نام سے بلائے جانے لگے۔ بدھ سنگھ جو ایک لٹا پٹا جاگیر دار تھا اس نے بھی اپنے کنبے کے کچھ افراد کے ساتھ کشمیر میں پناہ لی۔ ابھی وہ جوان ہی تھا کہ اس نے ایک انگریز افسر مانسٹوٹ کے پاس ملازمت حاصل کر لی اور پھر اس کے ساتھ ہی دلی منتقل ہو گیا۔ دورانِ ملازمت دلی قیام کے دوران 1812ء میں اس کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام اس نے موہن لال رکھا۔ بدھ سنگھ ایک جہاں دیدہ شخص تھا لہٰذا جب 1828ء میں انگریز نے فارسی کالج دلی میں انگریزی کی کلاسیں شروع کیں تو بدھ سنگھ نے اپنے بیٹے موہن لال کو وہاں داخلہ دلا دیا جہاں موہن لال کے نام کے ساتھ کاشمیری کا اضافہ کر دیا گیا۔

یوں موہن لال کاشمیری ہندوستان کے ان چھ نوجوانوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے انگریز راج کے شروع میں انگریزی سیکھ لی۔ 1831ء کو وہ فاتح افغانستان سر الیگزانڈر برنس کے پاس ملازم ہو گیا۔ موہن لال فارسی اور انگریزی زبان بولنے اور لکھنے میں کافی ماہر ہو گیا تھا لہٰذا اسے شروع میں بخارا کی مہم سونپی گئی۔ وہ برنس کے ساتھ دہلی سے نکلا اور لدھیانہ، پانی پت، کرنال، لاہور، پنڈ دادن خان، جلالپور، راولپنڈی، پشاور، کابل اور بامیان سے ہوتا ہوا بخارا پہنچا۔ برنس اور اس کے انگریز ساتھی جیرارڈ مقامی لوگوں کی بھیس میں اس کے ساتھ تھے۔ اس مہم کا مقصد افغانستان کی دفاعی پوزیشن کا جائزہ لینا تھا۔ موہن لال کاشمیری سفر کے دوران ڈائری لکھتا رہا جو مختلف ذریعوں سے انگریز سرکار تک پہنچتی رہی۔ موہن لال 1834ء کو واپس پہنچا، انگریز سرکار نے اس کی خدمات کے عوض اسے قندھار میں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ لگا دیا۔

1838ء کو انگریز نے افغانستان پر قبضے کا فیصلہ کیا، موہن لال کو اس مہم کا "گائیڈ" مقرر کر دیا گیا۔ موہن لال برنس کے ساتھ نکلا اور انگریز فوج کو سیدھا کابل لے گیا۔ افغانوں سے جنگ ہوئی، افغان ہار گئے کیونکہ موہن لال اس سے پہلے بہت سے غیر مسلم افغانیوں کو مال و دولت سے انگریز سرکار کی حمائت کیلئے خرید چکا تھا۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا اور اس کی آڑ میں افغانستان پر حکومت کرنے لگے۔ موہن لال اس سارے دور میں انگریزوں کے مفادات کیلئے کام کرتا رہا۔ موہن لال کو قدرت نے سازش، مکر و فریب اور جوڑ توڑ کی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مقامی لوگوں میں رچ بس جاتا تھا اور پھر ان کی جڑیں کاٹ کر اپنے آقا انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ موہن لال 1877ء تک زندہ رہا، اپنی باسٹھ سالہ زندگی میں اس نے برطانیہ کا سفر بھی کیا، آخری عمر میں اس نے دو سفر نامے بھی لکھے جو کسی ہندوستانی باشندے کی انگریزی زبان میں پہلی کتابیں تھیں۔

یہ کتابیں بد قسمتی سے شہرت نہ پا سکیں۔1930ء کے آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو لندن کے ایک کباڑیئے کی دوکان پر کسی کام سے گئے تو وہاں انہوں نے ان کتابوں کو خرید لیا۔ان کتابوں کا جب مطالعہ کیا تو موہن لال کے مشاہدات اور زبان دانی پر حیران ہو گئے۔نہرو کی تحریک پر بعد ازاں ہری رام گپتا نے موہن لال پر پی ایچ ڈی کی۔گپتا کا مقالہ 1943ء میں شائع ہوا ،اس کا دیباچہ خود نہرو نے لکھا لیکن بد قسمتی سے یہ مقالہ بھی کوئی شہرت نہ حاصل کر سکا۔ساٹھ برس بعد یعنی 2003ء میں یہ ایک بار پھر شائع ہوا ،اس مرتبہ اس نے تہلکہ مچا دیا،دنیا موہن لال کا شمیری کے مشاہدات پر حیران رہ گئی۔

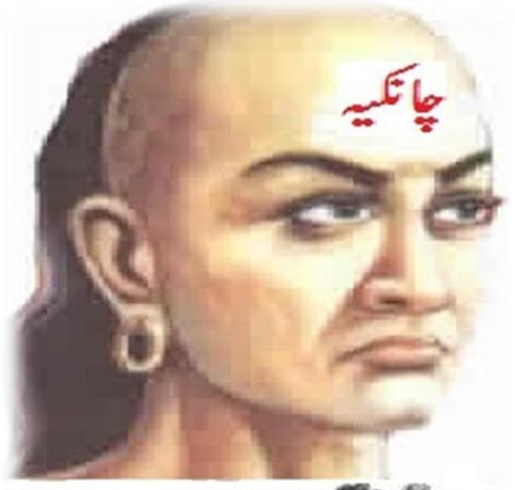

موہن لال 1838ء سے 1841ء تک کابل رہا تھا ،اس نے انگریزوں کی حکومت بنتے اور پھر بگڑتے دیکھی تھی،وہ افغانوں کا مزاج شناس بھی تھا لہٰذا جب اس نے کابل میں انگریزوں کے زوال کی داستان لکھی تو کمال کر دیا۔ اس نے لکھا افغان سب کچھ سہہ جاتے ہیں لیکن وہ بیرونی طاقتوں کو برداشت نہیں کرتے۔ افغان شراب اور جنسی بے راہروی کے ساتھ بھی سمجھوتا نہیں کرتے ۔انگریز اقتدار پر قابض ہوئے تو انہوں نے افغانوں کے مزاج کو فراموش کر دیا،انہوں نے سارے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لئے،بادشاہ محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔کابل میں شراب خانے کھولے گئے اور انگریز فوج نے سرِ عام شراب نوشی شروع کر دی۔انگریزوں نے بڑے بڑے مکانات اور باغات پر قبضہ کر لیا،وہ وہاں گھڑ دوڑ، کرکٹ اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

وہ سردیوں میں کابل میں اسکیٹنگ بھی کرتے تھے،شہر بھر میں قحبہ خانے کھل گئے،انگریز فوجیوں کی دست درازیاں شرفاء کے گھروں تک پہنچ گئیں۔ انگریز افسر اور اہلکار سرداروں کی بہو بیٹیاں اٹھالاتے اور اس زیادتی پر حکومت خاموش رہتی ۔انگریزوں نے شہر کے تمام اچھے مکانات ہتھیا لئے یا پھر کرائے پر حاصل کر لئے۔اناج، گھاس، گوشت اور سبزیاں بھی انگریز خرید لیتے تھے جس کے نتیجے میں افغانستان قلت اور مہنگائی کا شکار ہو گیا۔افغان تین برس تک یہ ظلم سہتے رہے یہاں تک کہ 1841ء ستمبر آن پہنچا۔تمام افغان سرداروں نے قرآن پر حلف لیتے ہوئے ایک معاہدے پر دستخط کئے اور اس کے بعد انگریزوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔برنس کو اس کے گھر کے سب سے بڑے دروازے پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔یہ بغاوت 7 جنوری 1842ء تک جاری رہی۔تنگ آکر میجر پاٹنجر نے افغانستان چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔انگریز فوج کابل سے نکلی لیکن افغانوں نے اسے راستے میں گھیر کر بے دردی سے قتل کر دیا۔اس جنگ میں بیس ہزار انگریز مارے گئے، صرف ڈاکٹر برائیڈن بچا جو

زندگی بھر افغانوں کی بربریت کی داستانیں سناتا رہا۔ موہن لال بھی اس جنگ میں گرفتار ہوا لیکن اس نے انگریزوں کے تمام خفیہ راز اگل دیئے اور بڑی مشکل سے رہائی پائی۔

مجھے گزشتہ دنوں میرے ایک مربی نے ان کشمیری پنڈتوں کی تاریخ پڑھنے کو کہا تو میرے ہاتھ موہن لال کا شمیری کی آپ بیتی، گلوب اینڈ میل کی ایک پرانی رپورٹ اور کرسٹینا لیمب کا 2004ء میں لکھا ہوا کالم اکٹھے پڑھنے کا اتفاق ہوا، گلوب اینڈ میل نے انکشاف کیا "کابل شہر گناہوں کی دلدل بن چکا ہے، شہر میں جسم فروشی کے سینکڑوں مراکز کھل چکے ہیں، وزیر اکبر خان اور شہر نو کے جدید علاقوں میں درجنوں نائٹ کلب ہیں۔ افغان قانون کے مطابق شراب نوشی جرم ہے لیکن شہر میں شراب عام ہے۔" کرسٹینا لیمب نیویارک ٹائمز میں اپنے کالم میں لکھتی ہیں کہ "کابل شہر میں ایک سابق افغان عمر نے دو لاکھ ڈالر سے "پی کاک" کے نام سے ریستوران کھولا جس کا سوئمنگ پول مارٹینی شراب کے گلاس کی مانند ہے، اس ریستوران میں شراب کے ساتھ حرام گوشت بھی ملتا ہے، پی کاک کے علاوہ وہاں برطانیہ کے دو باشندوں نے ایلبوروم کے نام سے کاک ٹیل بار اور تھائی ریستوران بھی کھولا ہے۔ پورے شہر میں شراب اور عورت عام ہے جسے افغان پسندیدگی سے نہیں دیکھ رہے، حالت یہ ہے طالبان کے مخالف بھی آج ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، کیا امریکا نے یہ جنگ اس لئے لڑی تھی کہ وہ یہاں شراب خانے، ریستوران اور رقص گاہیں تعمیر کر سکے

میں نے موہن لال کی آپ بیتی کو ایک طرف رکھا اور ٹھنڈا سانس بھر کر سوچا" کیا 1841ء اور 2010ء میں کوئی فرق ہے؟" کرسٹینا لیمب کے اسی کالم کے آخر میں اس کا جواب مل جاتا ہے کہ "ہاں ہے، 1841ء میں افغانستان میں انگریز تھا اور آج وہاں امریکی ہیں۔" میں نے سوچا "کیا تاریخ خود کو دہرائے گی؟" تو اس کے جواب میں کرسٹینا لیمب یوں جواب دیتی ہے کہ "ہاں جلد ہی کیونکہ غلطیوں کے بیج سے ہمیشہ غلطیوں کے پودے نکلتے ہیں۔ "میرا وجدان مجھے فوری طور پر اس طرف لے گیا کہ چند سال پہلے جب کشمیر کی تحریک آزادی نے بہت زور پکڑا تو بھارتی خفیہ ایجنسی کشمیر کی تحریک آزادی کو بدنام کرنے کیلئے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی۔

امریکی صدر کلنٹن کے بھارتی دورے کے دران بھارتی فوج کے خفیہ ادارے "را" نے 20 مارچ 2000ء کو کشمیر کی تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے چھتی سنگھ پورہ اننت ناگ میں بڑے بہیمانہ انداز میں وہاں کے مقامی گردوارہ میں 34 سکھوں کو قتل کر دیا اور اس کی ساری ذمہ داری کشمیری مسلمانوں پر ڈال دی لیکن بعد میں خود بھارتی تین رکنی تحقیقاتی کمیشن نے بھارتی سیکورٹی فورسز کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بھارتی بنئے کی اس خوفناک سازش کا بھانڈہ پھوڑ دیا۔ اس طرح بہت سے موہن لال اپنے گھناؤنے کردار کے ساتھ بے نقاب ہو گئے اور دوسری طرف کشمیری پنڈتوں کو استعمال کرتے ہوئے من گھڑت واقعات سے دنیا کو گمراہ کرنا شروع کر دیا جس کو بھارت کے میڈیا نے بہت اچھالا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ان پنڈتوں کا انخلاء اس لئے بھی مقصود تھا کہ مسلمانوں کے خلاف بھارتی فوج کے ظالمانہ آپریشن میں ان کو فری ہینڈ مل سکے۔

بھارت جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرتا ہے آخر وہ دنیا کے پریس اور کیمرے کو وہاں جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ اگر چند منٹ کیلئے بڑی ناگواری کے ساتھ فرض کر لیا جائے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے تو وہ کون سا قانون ہے جس کے تحت بھارت نے اپنے ہی ایک لاکھ سے زائد بے

گناہ شہریوں کو کشمیر میں قتل کر دیا ہے؟اور پنڈت جواہر لال نہرو جو بھارت کا بڑا محبوب لیڈر تھا اس نے اقوام متحدہ میں عالمی طاقتوں کو ضامن بنا کر جس تحریر پر دستخط کئے تھے اس قرارداد کشمیر پر ساٹھ سال سے کیوں عملدرآمد نہیں ہوا؟اس کا کوئی جواب ہے کسی کے پاس؟؟ کیا موہن لال اور من موہن سنگھ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے حال سے بھی واقف ہے!

ہوں چراغ داغ بنا ہوا، سر شام جلتا ہوں شوق سے
مرے پاس آئیں گے وہ کبھی، جنہیں اک سحر کی تلاش ہے

بروز اتوار 21 ربیع الاوّل 1431ھ 7 مارچ 2010ء

چشمِ عبرت!

سوال یہ ہے کہ تمام تر تگ و تاز سے امریکیوں نے کیا حاصل کیا، فساد، خوف، توہین اور ایک ایسی عالمگیر شکست کا اندیشہ جس کے بعد کوئی فتح حاصل نہیں ہو گی اور تاریخ میں ایک ایسی نامراد قوم کا ذکر باقی رہ جائے گا جسے ایک مسلمہ سرداری سمیت سب نعمتیں حاصل تھیں۔ ان سب نعمتوں کو جو امریکی عوام نے دو صدیوں میں مقابلے کی کھلی آزادی اور جمہوری نظام اور انصاف عطا کرنے والی بے باک عدالتوں کے بل پر حاصل کیں (ڈاکٹر عافیہ کے مقدمے میں یہ عدالتی صلاحیت بھی مشکوک ہو گئی ہے) جس کو طاقت کی ننگی نمائش پر تلی امریکی قیادت نے گنوا دیا۔ مؤرخ کو لکھنا ہو گا کہ تیس کروڑ امریکی عوام بتدریج دلدل میں اترتے چلے گئے مگر ان کا ہاتھ نہ پکڑ سکے جو چھوٹی زیادتیوں کے جواب میں اور اس سے بھی زیادہ محض مفروضوں اور اندیشوں کی بناء پر کرۂ ارض کی متعدد قوموں پر چڑھ دوڑے، ان کی عورتوں، بچوں بوڑھوں اور معصوم شہریوں کو ہلاک اور گرفتار کرنے لگے۔ ان کی توہین پر تل گئے اور اس طرح کروڑوں ایسے انسانوں کو انہوں نے اپنے خلاف متحرک کر لیا جو موت کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جتنا کہ ہر حال میں زندہ رہنے کی آرزومند زندگی کو۔ مؤرخ اس کے سوا اور کیا لکھے گا؟ کہ تاریخ بالآخر سب کھوٹا کھرا الگ کر دیتی ہے۔

سیدھی اور سچی بات یہی ہے اور کوئی بھی شخص جو اللہ پر، اللہ کے آخری رسول ﷺ پر اور آخری الہامی کتاب پر یقین رکھتا ہے، انکار نہیں کر سکتا کہ جہاں کہیں بے گناہ شہریوں کو قتل کیا گیا چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہلواتے ہوں، انہوں نے غلط کیا بلکہ بھیانک جرم کا ارتکاب کیا۔ محمد ﷺ ان پر اور ان کی آل پر سلامتی ہو، اطاعت کی بیعت کرنے والوں کے سامنے نمودار ہوئے تھے اور انہوں نے یہ کہا تھا:

اپنے جھنڈے دلیر ہو کر بلند رکھو، اللہ فتح دے تو ناشکری نہ کرو، ہتھیار ڈالنے والوں کے لہو سے اپنی تلواروں کو ہرگز رنگین نہ کرو اور نہ بچوں بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھاؤ۔ کھجور اور دوسرے پھل دار درخت نہ کاٹو اور نہ ہی دشمن کے گھر جلاؤ، صرف وہی کچھ لو جس کی ضرورت ہے، بربادی نہ قیدیوں اور دوسرے رحم طلب کرنے والوں پر رحم کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔ دشمن کے ساتھ اپنے عہد سے ہرگز غداری نہ کرو اور نہ دروغ پھیلاؤ۔ گوئی کو جگہ دو۔ ہر بات میں وفاداری، صداقت اور شرافت کا ثبوت دو، عہد کا پاس کرو، راہب کو نہ چھیڑو، نہ ہی اس کے مسکن کو برباد کرو۔

جن افراد نے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ساتھ زیادتیاں کیں ہیں، اپنے ہی بھائیوں کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اس کو جہاد کا نام دے رہے ہیں دراصل وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے انحراف کر رہے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جن کے دل ایمان سے خالی ہو چکے ہیں اور انہیں اللہ اور رسول ﷺ کی امت سے دور کا واسطہ بھی نہیں اور جو محض اس لئے مسلمان کہلوانے پر آمادہ ہیں کہ اس کے سوا کوئی چارۂ نہیں اور دوسری طرف وہ بھی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو مغرب سے خوف زدہ ہو کر سمٹ جانے اور امریکا کے اشارۂ ابرو پر سجدہ ریز ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ طاقت کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے اور اس منطق کو مان لینا چاہئے۔ تاریخی شعور سے بے بہرہ ادنیٰ لذتوں اور عارضی عافیت کی آرزو میں ذہناً آزادی سے دستبردار ہو جانے والے لوگ جو سامنے کی یہ حقیقت بھلا دیتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک سپر پاور ہلاک ہوتی

اور تاریخ کے کوڑے دان میں ڈال دی جاتی ہے یا وہ محتاط "مفکر" جن کی احتیاط بزدلی کی پڑوسن ہے اور اس سے متاثر اور مرعوب.....وہ سیاستدان جنہیں ہر حال میں اقتدار اور اثر رسوخ عزیز ہے، عالمِ اسلام کے وہ حکمران جو اپنے عوام سے خوفزدہ ہیں وہ اب اپنی عافیت طلبی میں اللہ کی بجائے عملاً امریکا کو اپنا معبود ماننے لگے ہیں۔

ریزہ ریزہ امریکا اب ٹوٹ رہا ہے، اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ عراق میں امریکی شہریوں کے قاتلوں سمیت سب باغیوں کو عام معافی دینے کا بالآخر فیصلہ دینا پڑا، اور اب ایسا ہی فیصلہ افغانستان کے بارے میں بھی ہونے والا ہے۔ اسرائیل، بھارت اور روس سمیت سب طاقتوں کو یہاں سے نکلنا ہو گا ،اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں لیکن اگر اس فیصلے میں کوئی تاخیر ہوئی تو وقت گزرنے کے بعد فیصلہ تاریخی عوامل کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور پھر مقتدر انسانوں سے عنان نوچ لی جاتی ہے۔

قصرِ سفید کا سابقہ فرعون جارج بش مسلسل یہ دہائی دیتا ہوا رخصت ہو گیا کہ حضرت ابراہیم کے ماننے والوں کو متحد ہو جانا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کس چیز پر؟ مقاصد کیلئے سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے مگر کن کے ساتھ جو اپنا اعتبار ہر حال میں کھو بیٹھے ہیں؟ اگر ایسا معاہدہ مطلوب ہے جو امریکا کو بالادستی اور مسلمانوں کو دائمی غلامی عطا کرے تو کون اسے قبول کرے گا؟ عالم اسلام کے حکمران اسے مان بھی لیں تو عوام کیسے مانیں گے؟ فرض کیجئے عوام تھک جائیں تو وہ سربکف کیسے مانیں گے جن پر آبرومندانہ زندگی کے سارے راستے مسدود کئے جا چکے، جو موت کیلئے اس قدر پر عزم ہیں جتنے تم اپنی زندگی کیلئے!

امریکا، برطانیہ، روس، بھارت اور اسرائیل نے انہیں حقیر جانا تھا مگر اب پاکستان کے علاوہ دوسرے مسلمان ممالک میں بھی تم اپنا یوم آزادی نہیں منا سکتے بلکہ اب تو قونصل خانے کی عمارتیں بھی شہریوں کیلئے مستقل بند کر دی گئیں ہیں۔ اسرائیل اور بھارت عدم استحکام کے خطرے سے دوچار ہیں اور دوچار رہیں گے..... نہیں، طاقت اس مسئلے کا حل نہیں، مسئلے کا حل بات چیت میں ہے ،ایک آزادانہ ماحول میں مذاکرات۔ ان پیچیدگیوں اور زیادتیوں کا تعین جو برہمی پیدا کرتی اور احساسِ محرومی پیدا کر کے دو ہاتھ دو پاؤں کے عامیوں کو میزائلوں اور بموں سے زیادہ خطرناک بنا دیتی ہے۔

اب تک کی تگ و تاز سے تو امریکا اور اس کے ہم نفسوں نے کیا حاصل کیا؟ فساد، خوف، توہین اور ایک عالمگیر شکست کا اندیشہ جس کے بعد کوئی فتح نہ ہو گی اور یہی بات بھارت کی سمجھ میں نہیں آ رہی، اب وہ ایک دفعہ پھر چانکیہ کی مکاری کا سہارا لیتے ہوئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ ایک طرف وہ پاکستان کے ساتھ ڈائیلاگ کا عندیہ دیتے ہوئے پاکستان کو اپنی مخصوص بد دیانتی کی بناء پر دباؤ میں رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے اور دوسری طرف بھارتی وزیر مملکت برائے وزارتِ خارجہ،، ششی تھارور،، جو کہ آجکل من موہن سنگھ کے ساتھ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر ہیں، سعودی عرب کو دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت میں ملوث ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔

دراصل بھارت اور اسرائیل ایک طرف تو پوری کوشش کر رہے ہیں کہ امریکا افغانستان میں مزید الجھتا چلا جائے تا کہ گریٹر اسرائیل اور مہابھارت کا سہانا خواب پورا ہو سکے لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے بھی وہ واقف ہو گئے ہیں کہ اب امریکا اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے رختِ سفر کی مکمل تیاری کر لی ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکی اور نیٹو افواج کے کمانڈر ایک دفعہ پھر ہلمند میں پورا زور لگانے کے بعد پاکستان کو ایک تاریخی کردار ادا کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ شائد امریکا اور اس کے حواریوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ طاقت کوئی چیز نہیں اور دراصل انصاف، ایثار، خیر خواہی اور معرفت ہی وہ قوت ہے جس سے قوموں اور ملکوں کو فتح کیا جا سکتا ہے لیکن بظاہر ہنود و یہود ان صفات سے محروم ہو چکے ہیں اور یہ سبق جس قدر جلد بھارت و اسرائیل سیکھ لیں اسی قدر دنیا کا امن جلد واپس لوٹ سکتا ہے۔

بھارت کی اس خطے میں تشویش اس لئے بھی بڑھ رہی ہے کہ امریکی پسپائی سے دراصل بھارت میں ان محکوم قوموں کو بھی ایک واضح پیغام ملے گا کہ جہاں امریکا جیسی سپر طاقت اپنے سارے جبر کے ساتھ نہ ٹھہر سکی وہاں بھارت ان قوموں کو مزید غلام بنا کر نہیں رکھ سکے گا!

رہے نام میرے رب کا جس نے ہر انسان کو آزاد پیدا فرمایا ہے!

گلہ ہے سارے زمانے سے چشمِ عبرت کو
کہ اک زمانے سے نیزے پر سر نہیں آیا

بروز سوموار 22 ربیع الاوّل 1431ھ 8 مارچ 2010ء

چشمِ تماشہ

نمرود، شداد، ہامان، فرعون دنیا کے بڑے ظالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ نیرو دنیا پر ظلم کرنے نکلا تو بیت المقدس پہنچ کر یہودیوں کو تباہ و تاراج کر دیا اور ہیکل سلیمانی کو آگ لگا دی۔ پھر وطن پہنچا تو اپنی رعایا پر بے پناہ ظلم کرتا رہا۔ جب ایتھنز ہر طرف سے آگ کی لپیٹ میں آ گیا تو یہ ظالم مزے سے اپنے محل میں بانسری بجاتا رہا۔ ایک اور رومن شہنشاہ بیدیاں نے 133ء میں بیت المقدس کو ڈھا کر پورے شہر میں ہل چلوا دیا۔ بخت نصر نے فلسطین کے علاقے پر حملہ کیا تو راستے کی تمام آبادیوں میں انسانی خون بہاتا گیا اور جب بیت المقدس پہنچا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ایک بھی گھر تباہی سے نہیں بچا، جوان بچے بوڑھے اور عورتیں سب ہی تہہ تیغ کر دیئے گئے اور جوان عورتیں باندیاں بنالی گئیں۔ سکندر فاتح بن کر نکلا تو ایک دنیا کو پامال کر گیا، پھر چنگیز اور ہلاکو کا دور آیا۔ انہوں نے اللہ کے لاکھوں بندوں کو خون بہایا، ان کی کھوپڑیوں کی مینار کھڑے کر دیئے۔ اللہ کے بندوں کو قتل کرنا ان ظالموں کا مشغلہ تھا۔ معصوم کسان دہقان، غریب غرباء مرد عورتیں ہلاکت کا نشانہ بنے، جس بستی سے وہ ہو کر گزرے اور اسے تباہ و تاراج کر گئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جرمنی کا آمر ہٹلر ایک ظالم کے روپ میں ابھرا، اس نے بیسیوں شہر تباہ کر دیئے۔ رہتی دنیا تک یہ طالع آزما ظالم ہی کہلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو محترم قرار دیا ہے۔ کسی کو اجازت نہیں دی گئی کہ وہ بے گناہ کو چاہے وہ کسی رنگ و نسل کا ہو، ہلاک کرے۔ حکمراں یا سیاسی جماعتیں جو تخت و تاج کیلئے انسانی خون بہاتی ہیں، سخت پکڑ میں آئیں گی۔ دنیا کئی صدیوں سے گزر کر بیسویں صدی میں آئی تو سائنسی ہتھیاروں کا استعمال شروع ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں اللہ کے بندوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ چنگیز اور ہلاکو نے اگر سینکڑوں کو مارا تھا تو اس ایٹم بم گرانے والے ظالم ٹرومین نے ہزروں نہیں لاکھوں کو چشمِ زدن میں بھسم کر دیا، صرف قتل ہی نہیں کیا بلکہ علاقے کی زمینوں مکانوں چشموں تالابوں کھیتوں کھلیانوں کو بھی صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

اکیسویں صدے کے دوسرے سال میں 11 ستمبر کو اس دور کا ایک قیامت خیز واقعہ رونما ہوا۔ ٹوئن ٹاور کو ایک خطرناک منصوبے کے مطابق مسافر جہازوں سے تباہ کر دیا گیا اور طویلے کی بلا بندر کے سر ڈال کر کروسیڈ کا نعرہ لگایا گیا۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا اعلان تھا۔ طالبان اور القاعدہ دو بڑی جہادی تنظیموں کو دہشت گرد اور قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔ اسامہ بن لادن کو نشانہ ملامت بنایا گیا اور صدام کا تخت و تاج لوٹ کر عراقیوں کے خون کی ہولی رچائی گئی حالانکہ اس سے پہلے پچھلی پانچ دہائیوں سے فلسطینی اسرائیلی تباہ کار حملوں کا مقابلہ کر رہے تھے جو ہنوز جاری ہیں۔

صلیبی جنگیں 1096ء (489ھ) سے 1292ء (691ھ) تک مسلسل دو سو برس تک لڑی گئیں۔ 1096ء میں صلیبی لشکر نے یورپی ممالک کی فوجوں کے ساتھ جس میں انگلستان، جرمنی، ڈنمارک، سسلی، اٹلی اور فرانس وغیرہ کے بڑے بڑے فوجی دستے پورے جنگی سازوسامان کے ساتھ شامل تھے، اپنے خوفناک اور بہیمانہ قتل و غارت گری کے مشن کا آغاز کیا۔ دس لاکھ ہتھیار بند فوجوں کا سب سے بڑا لشکر تھا جو

نے (Peter The Hermit)اس وقت کی تاریخ میں کبھی دیکھا نہ گیا تھا۔اس لشکر کو تیار کرنے کیلئے عیسائیوں کے سب سے بڑے راہب پطرس اپنے کندھوں پر ڈالنے کیلئے لکڑی کی ایک صلیب بنوالی اور گدھے پر بیٹھ کر یورپ کے حکمرانوں کے درباروں میں دہائی دینے پہنچ گیا اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کی آگ بھڑکانے لگا۔وہ حکمرانوں کے سامنے دھاڑیں مار مار کر روتا اور انہیں بیت المقدس میں اپنی فوجیں داخل کرنے کیلئے اشتعال دلاتا تھا۔وہ کہتا تھا کہ یسوع مسیح کی قبر کی حفاظت کرو۔اسے اس پرچار کیلئے اربن ثانی کی مکمل تائید حاصل تھی۔مغربی یورپ کے لوگ اپنے گناہ بخشوانے کیلئے بیت المقدس اور فلسطین جانا چاہتے تھے اسی لئے پوپ اربن ثانی اس علاقے میں عیسائی اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا۔

مسلمان حضرت عمر کے دور 16ھ سے بیت المقدس پر قابض تھے ۔یہودی ان لڑائیوں میں عیسائیوں کے ساتھ تھے اور ہر طرح مدد کررہے تھے ۔ پطرس جس کی اپنی ازدواجی زندگی ناکام ہو چکی تھی اور بیوی کے ساتھ دن رات کے جھگڑوں سے بیزار ہو کر وہ،، محافظ، قبر مسیح،،بن گیا تھا،جب اس کی کوششوں سے یورپی حکمرانوں نے فلسطین میں اپنی چار ریاستیں بنالیں اور مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو چن چن کر بے رحمی سے ذبح کر چکے تو فلسطین کو چار ریاستوں میں سے ایک ریاست کے والی کو،، قبر مسیح کے محافظ،،کالقب دیکر مامور کر دیا گیا۔یورپین مؤرخ خود لکھتے ہیں کہ جس بیدردی سے اس موقع پر انہوں نے یہاں کے مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔انہوں نے حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے، معصوم بچوں کو سنگینوں میں پرو کر علم بلند کئے، مردوں کو صلیبوں پر لٹکایا، مسجدوں کے اماموں اور خطیبوں کو تیل چھڑک کر زندہ جلادیا گیا، مسجدوں کے صحن میں مسلمانوں کے خون کے تالاب بن گئے تھے۔

اسٹینلے لین پول لکھتا ہے کہ مسلمانوں کو اتنی بڑی تعداد میں ہلاک کیا گیا کہ ان کے خون سے بھری سڑکوں پر ان ظالموں کے گھوڑے گھٹنوں تک ڈوب جاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے شیر خواروں کو ٹانگوں سے پکڑ کر چیر دیا جاتا تھا یا مسجدوں کی دیواروں پر انہیں دے مارتے تھے۔ماؤں کی گودوں سے یہ معصوم بچے چھین کر گھروں کی چھتوں اور فصیلوں سے نیچے پھینک دیا جاتا اور سفاکی کی انتہا تو یہ تھی کہ اس عمل کو ان کے ماں باپ کے سامنے دہرایا جاتا تاکہ ان کو مارنے سے پہلے اس اذیت سے بھی گزارا جائے۔ مشہور فرانسیسی مؤرخ،، موسیو لیبان،، نے چشم دید گواہوں "رابرٹ اور ریمانڈ" کے حوالے سے عیسائی افواج کی درندگی کے جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔فوجی بھرتی کی وجہ سے یورپ کے شہر اس زمانے میں سنسان ہو گئے تھے۔حضرت مسیح علیہ السلام کے نام پر اس خونریزی، بربریت، لوٹ مار اور اجتماعی عیاشیوں کے جو مظاہرے ہوئے وہ تاقیامت انسانیت کے چہرے پر شیطانیت کے داغ بن گئے ہیں۔حضرت عیسی علیہ السلام کی تو یہ تعلیم تھی کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو اسے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

ان شیطانی حربوں کے بعد مسلمانوں کے ہوش ٹھکانے آئے تو اللہ نے نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی صورت میں مسلمانوں کو دو بڑے نجات دہندہ اور فاتح عطا فرمائے۔انہوں نے اللہ کا نام لیکر جوابی کاروائی کی اور صلیبی لشکروں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کیلئے مسلمانوں نے عیسائی عورتوں بچوں اور بوڑھوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔یہ وہ حقیقت ہے جس کا تذکرہ "ڈبلیو بی سٹیونسن" اپنی کتاب میں برملا اقرار کرتا ہے اور گبن جیسا معروف مؤرخ بھی اپنی مشہورِ زمانہ تاریخی کتاب "رائز اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" میں ان حقائق کا اعتراف کرتا ہے جسے آج

"جینوا کنونشن" کا نام دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کو بنانے والے اور ان پر عمل کرنے والے سلطان زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی تھے جنہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ اصول بنائے اور اللہ کے رسول ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کر کے اپنے بدترین دشمنوں کو دکھایا۔

لین پول نے اپنی کتاب،، صلاح الدین ایوبی،، میں اور لیبان نے اپنی کتاب،، تمدن عرب،، میں میدانِ جنگ میں بھی مسلمانوں کے حسنِ سلوک کا بار بار اعتراف کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے دوسرے سال ۱۱ ستمبر کے خونی واقعے کے بعد اسرائیلی اور امریکی حکومتوں کے گٹھ جوڑ سے ایک مرتبہ پھر صلیبی جنگ کا نعرہ لگایا گیا۔ اس میں برطانیہ بھی پوری طرح شریک ہو گیا اور دیگر یورپی ریاستوں کو بھی شریک ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ جس طرح افغانستان میں قیامت خیز بمباری صلیبی جنگ کے نئے علمبردار اور،، محافظ قبر عیسیٰ،، مہاراج بش نے کی ہے، اس نے دنیا کی تمام پچھلی خونریزیوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ آج کی مہذب دنیا کے نام لیوا سب سے بڑے جابر حکمران ثابت ہوئے اور آج ایک دفعہ پھر پچھلے ایک ہفتے سے ایسی ہی ہولناک کاروائی افغانستان کے صوبے ہلمند میں جاری ہے اور ایک خاص منصوبے کے تحت دنیا کے تمام میڈیا کو اس کی خبر دینے سے منع کر دیا گیا ہے۔

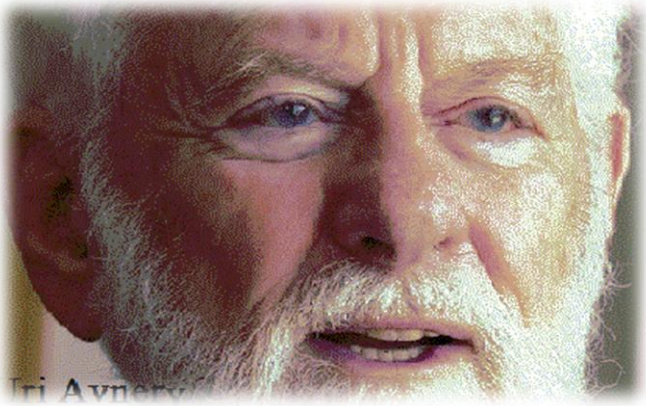

اس نئی صلیبی جنگ کا آغاز کرنے والا جارج بش اور اس کا والد عیسائیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ 21ویں صدی میں حضرت عیسیٰ زمین پر آنے والے ہیں اس لئے مشرقِ وسطیٰ میں ان کو خود مختار ریاستیں قائم کرنی ہیں۔ اس جنگ کے آغاز میں ان صلیبی جنگوں کے کارندے کولن پاؤل اور رمز فیلڈ کے حکم پر امریکی افواج کے مقامی کمانڈرز نے فلسطین عراق میں مسلمانوں کی بے گناہ آبادیوں پر جو ظلم توڑے ہیں وہ گیارھویں صدی کی صلیبی جنگوں کی بربریت اور خوں آشامی سے کہیں بڑھ کر تھے اور حیرت ہے کہ ان سیاہ کاریوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو بزعم خود دنیا کے نجات دہندہ اور خدائی فوجدار سمجھتے تھے اور ان کے رخصت ہونے کے بعد آج بھی ان ریاستوں کے حکمرانوں کی پالیسیوں میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آرہا۔

امریکی کمانڈروں کا مسلمان مردوں عورتوں کے ساتھ ننگ انسانیت بے رحمانہ سلوک ایک بار پھر انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ مسلمان قیدیوں کو کتوں کے پنجروں میں قید کر کے لایا جاتا رہا، انہیں داغا گیا، بجلی کے جھٹکے دیئے گئے، ان کے جسموں چاقوؤں سے چھیدے گئے اور ان کی بوٹیاں نوچ لی گئیں، کتوں کی طرح ان کے گلے میں زنجیریں ڈال کر کھلے عام کتوں کی طرح چاروں ہاتھ پیر چلاتے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں پھرایا گیا۔ دنیا بھر کے ٹی وی چینل نے ان مظالم کی تصاویر دکھائیں لیکن زبردست کا ٹھینگا ابھی تک سر پر ہے۔ جنگی قیدیوں کے اصولوں کا چرچا کرنے والے آج اپنی اصل شکل میں نمودار ہو رہے ہیں لیکن اس کے باوجود یہودی نواز میڈیا اپنے مخصوص پراپیگنڈہ میں مصروف ہے۔

اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری القاعدہ اور طالبان کے نام دنیا پر دنیا کے ہر خطے میں ہر مسلمان کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ اب یہ صرف مظلوموں کی چیخ و فریاد نہیں رہی بلکہ اس طاغوتی ٹولے کے شریک بھی "اپنوں" کے ننگ انسانیت کردار کو دیکھ کر چیخ اٹھے ہیں۔ امریکی کانگرس ڈونالڈ

رمز فیلڈ اور امریکی کمانڈروں کا بری طرح محاسبہ کر چکی ہے لیکن اب بھی ڈھاک کے وہی تین پات۔ نیویارک ٹائمز کے نمائندے جولین بورگر کی رپورٹ کے مطابق بش حکومت کے امریکی سینٹ کے ۹ ارکان حکومت کے باغی ہو گئے تھے اور بعد میں پارٹی میں بھی پھوٹ بھی پڑ گئی تھی جس کی بناء پر بعد میں انتخابات میں بھی بری طرح شکست ہو گئی تھی۔ مشہور امریکی سینیٹر،، کے پال فنڈلے ،، کی تازہ ترین کتاب کا ایک اقتباس پڑھئے، جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

وہ اپنی کتاب "سائیلنٹ نو مور؛ کنفرنٹنگ امریکن فالس امیج آف اسلام" میں لکھتے ہیں کہ "14 / اپریل 2004ء کو بش نے اسرائیل کے فلسطین اراضی پر بزور شمشیر جبراً قبضہ کی حمائت کا اعلان کیا، درحقیقت اقوامِ متحدہ کے منشور اور بین الاقوامی قانون میں اس قسم کی فتوحات اور قبضہ کی ممانعت ہے اور امریکا اور اسرائیل دونوں ہی اس کے پابند ہیں۔ بش نے یہ اعلان وائٹ ہاؤس کی ایک پریس کانفرنس میں کیا کہ اسرائیل سے ان بڑی بڑی یہودی بستیوں کے انخلاء پر اصرار نہیں کیا جائے گا جو اس نے گزشتہ برسوں میں فلسطینی علاقوں میں غیر قانونی طور پر قائم کی ہیں۔ امریکی حکومت آئندہ حقِ ملکیت کی حمائت ترک کر دے گی، جسے بین الاقوامی قانون تسلیم کرتا ہے یعنی فلسطینیوں کا اپنی نجی املاک کی بازیابی کا حق جسے یہودی مسلح افواج نے جبراً قبضہ کر کے چھین لیا تھا، درست تسلیم کیا جائے گا۔ ایک مظلوم قوم کے اہم اور جائز قانونی حقوق کی پامالی کو ہمارے صدر کی طرف سے سرسری معاملے کی طرح نظر انداز کرنا انتہائی افسوسناک ہے اور اس پالیسی میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی آج بھی اسرائیلی وزیر اعظم کا امریکی صدر کی بغل میں بیٹھ کر مسکراتا ہوا چہرہ گویا ان زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے۔

مسلمانوں کے دلوں پر زہریلے نشتر چلانے کیلئے صدی کے سب سے بڑے ظالم اور جابر شیرون جو کہ جنگی جرائم میں ملوث ہونے کی بناء پر مقدمے کا حق دار تھا اس کو امریکا نے عزت کا حقدار ٹھہرایا حالانکہ چند سال پہلے ایک اسرائیلی تحقیقاتی بورڈ نے اسے بیروت کے مہاجر کیمپوں میں 1982ء میں معصوم اور بے گناہ ہزاروں فلسطینیوں کے قتل عام کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس قتل و غارت کی ہولی میں جو اسلحہ ،ہوائی جہاز اور توپیں استعمال ہوئی تھیں وہ امریکا کا عطیہ تھا۔ جب وہ اسرائیل کا وزیر اعظم بنا تو اس نے مجرمانہ طور پر مجبور و مقہور فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دیئے اور اقوامِ متحدہ کی تمام قراردادوں کا کھلا مذاق اڑایا۔ اس کے حکم پر فلسطین کے ایک بزرگ احمد یٰسین جو فالج کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بھی معذور اور تقریباً بصارت سے بھی محروم تھے مسجد سے نماز پڑھ کر اپنی ویل چیئر پر باہر نکلے تھے، امریکی فراہم کردہ گن شپ ہیلی کاپٹر سے نشانہ بنا کر ان کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ اس پر مستزاد جارج بش دانستہ طور پر شیرون ایسے بدمعاش کی عزت افزائی صرف مسلمانوں کو نیچا دکھانے کیلئے کرتا ہے"۔

ٹوئن ٹاور کو ایک خطرناک منصوبے کے مطابق مسافر جہازوں کے ٹکرانے سے تباہ کر دیا گیا جو کہ یقیناً ایک غیر قانونی، کینہ پرور عمل ہے اور یہودیت سمیت ہر مذہب کی تعلیمات کے منافی ہے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی سخت مذمت بھی کی گئی ہے لیکن امریکی قومی مفادات کے نکتہ نظر سے اس تماشے کا تعین اوقات ناقابلِ فہم ہے۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے مشرقِ وسطیٰ کے حقائق سے چشم پوشی نے فلسطین پر کیا کم ظلم ڈھائے تھے کہ اب عراق اور افغانستان کو بھی تہہ تیغ کر دیا گیا ہے اور پچھلے چند برسوں میں ظلم و ستم کا وہ بازار گرم کیا گیا ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال

نہیں ملتی۔ ابھی چند برس پہلے اسرائیل نے بیروت پر بمباری کر کے اٹھارہ ہزار لبنانی شہید کر دیئے لیکن وہاں کی مٹھی بھر حزب اللہ کے مجاہدوں نے بہادری کی وہ تاریخ رقم کی ہے کہ ساری دنیا ششدر رہ گئی ہے اور اسرائیل سمیت امریکا کو بھی انتہائی ہزیمت اٹھانا پڑی۔

دنیا بھر کے امریکا مخالف مظاہرین اور عالم اسلام میں بسنے والا ہر مسلمان امریکی حکومت کو اسرائیلی صہیونی طاقت کا مہرہ سمجھتا ہے یعنی ننھی منی سی اسرائیلی حکومت کا بے دام غلام! اسرائیلی عوام تو کھلے عام یہ بڑھکیں مارتے ہیں کہ آج بھی امریکی ایوانِ نمائندگان (کانگرس) اور قصرِ صدارت پر اسرائیل کا مکمل کنٹرول ہے لیکن شائد پہلی مرتبہ امریکا میں اس بات کا شدید ادراک پیدا ہو رہا ہے کہ اس قدر بے پایاں جنگی اخراجات سے امریکا تباہی کے گڑھے میں غرق ہوتا جا رہا ہے جس سے اب امریکا کی سلامتی کو شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب تک امریکا کی ایک سرکاری اطلاع کے مطابق اس جنگ میں تقریباً دس کھرب ڈالر کی خطیر رقم خرچ ہو چکی ہے، ڈیڑھ ملین عراقی اور 22 لاکھ سے زائد افغانی مسلمان جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ امریکا کی سرکاری اطلاع کے مطابق عراق میں 4698/امریکی فوجی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور افغانستان میں 1667/امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اتنی ہی تعداد میں اتحادیوں کے فوجی بھی اس جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ زخمیوں اور اس جنگ میں عمر بھر کیلئے معذوروں کی ایک کثیر تعداد امریکا کے ماتھے پر ایک کلنک کا ٹیکہ بن کر واپس پہنچ چکی ہے۔

ایک اسرائیلی امن پرچارک یہودی یوری ایونری کے بقول "امریکا تمام دنیا کو کنٹرول کرتا ہے اور اسرائیل امریکا کو کنٹرول کرتا ہے۔" کیا ان روشن اور حقیقت پر مبنی دلائل کے بعد وہ وقت نہیں آ گیا کہ ہم بھی اس امریکی سامراج اور ان کے گماشتوں سے اپنی جان چھڑائیں جنہوں نے اسرائیلی مفادات کی تکمیل کیلئے ہمارے وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ کشمیر، فلسطین عراق اور افغانستان کے بعد پاکستان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن اب تو یہ طے ہے کہ ظلم، فسق و فجور اور جبروت کے دن گنے جا چکے ہیں۔ عیار دشمن اس طاق میں ہے کہ امریکا کو اس خطے میں مزید مصروف رکھا جائے تاکہ اس جنگ کی آڑ میں اپنے ناکام عزائم کی تکمیل کریں لیکن اب بازی پلٹ گئی ہے اور معاملات کی باگ ڈور ان مظلوموں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ ان مظلوم مجبور و مقہور لوگوں نے اپنے صبر و استقامت اور قربانیوں سے ان جابر قوتوں کو دنیا میں رسوا کر کے رکھ دیا ہے اور ان کو اس بات کا مکمل ادراک ہو گیا ہے کہ اگر امریکا جیسی سپر طاقت بھاگنے کے راستے ڈھونڈ رہی ہے تو بھارت اور اسرائیل کو تو دنیا میں کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی انشاء اللہ!

رہے نام میرے رب کا جس کا ہر وعدہ سچا ہے!

میری وحشت کیلئے چشمِ تماشہ کم ہے
اور اگر دیکھنے لگ جائے تو دنیا کم ہے

بروز بدھ 24 ربیع الاوّل 1431ھ 10 مارچ 2010ء

عظیم مغالطہ

اللہ کے آخری سولﷺ نے اپنے پیارے چچا کو راز کی بات بتادی تھی۔ اللہ کی اس بے کراں کائنات میں حیات کا سفینہ کسی خلل کے بغیر کیونکر رواں رہتا ہے؟ محترم شعیب بن عزیز نے کیا خوب کہا:

رواں ہیں تیرے کاکلوں کی لگن میں
وگرنہ ستاروں کے دل ٹوٹ جائیں

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی میں
قدم بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

شاعروں کی بات اور ہے، جو چاہیں کہیں، وہ آسمان پر قدم رکھ سکتے اور ستاروں پر حکم چلا سکتے ہیں!

سچ تو صرف یہ ہے کہ عدل ہی زندگی کی روح اور زندگی کی اساس ہے۔ ان گنت دنیاؤں میں، زمینوں، آسمانوں اور کہکشاؤں میں ہر چیز اپنا وظیفہ انجام دیتی اور اپنے اپنے مدار میں متعین کردہ راستوں پر چلتی رہتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوائیں اور بادل، فرشتے، شجر اور ہجر، چوپائے، کیڑے مکوڑے اور پرندے، بلندیوں پہ آفتاب کی تمازت برف پگھلاتی ہے اور ندیوں میں بہتا پانی میدانوں میں پھول کھلا دیتا ہے، وہ کھیتوں اور باغوں کو سینچتا ہے، ہوا انہیں لوریاں دیتی ہے، سورج کی روشنی گندم کے خوشے کو سنہری رنگ عطا کرتی اور پھلوں کو رس اور رنگ و روپ بخشتی دیتی ہے۔ تقریباً ایک ارب قسم کی مخلوقات ہیں۔ ان سب کی حیات اور بقاء کا انحصار رزق کے ان تنوع اسباب پر ہے، زمین پر حیات کی نمود کے ساتھ ہی خود بخود بروئے کار آ گئے اور وہ سب ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ ایک خود کار نظام جو تقریباً چھ ارب سال سے قائم ہے اور اس وقت تک قائم رہے گا جب اسے سمیٹنے کا حکم صادر کر دیا جائے گا۔

الْقَارِعَةُ مَاالْقَارِعَةُ وَمَاأَدْرَاكَ مَاالْقَارِعَةُ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ فَأَمَّامَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَفِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَأَمَّامَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ وَمَاأَدْرَاكَ مَاهِيَهْ نَارٌحَامِيَةٌ

"عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ، تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہونگے وہ دل پسند عیش میں ہو گا اور جس کے پلڑے ہلکے ہونگے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہو گی اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ۔،،(سورۃ القارعیہ۔1-11)

سب جانتے ہیں، پہاڑ اور پرندے جانتے ہیں، سمندر اور ساحل کو معلوم ہے، درختوں اور پتھروں کو خبر ہے، تتلیوں اور کہکشاؤں کو پتہ ہے، انار اور آلوچے کے شگوفے جانتے ہیں کہ انہیں ثمر بننا ہے، سورج کی کرنیں خبر رکھتی ہیں کہ نمود اور فروغ کے عمل میں ان کا وظیفہ کیا ہے، بس ایک آدم زاد

ہی نہیں جانتا، وہ ان سب سے بلند ہے، ان سے ممتاز اور مختلف بھی! اسے سماعت وبصارت بخشی گئی، ارادہ اور اختیار دیا گیا، فکر رسا، سیدھا راستہ اور اس کی نشانیاں۔ بس وہی گمراہی کا انتخاب کرتا ہے، وہی بھلا دیتا ہے کہ زندگی کی اساس عدل کے سوا کچھ نہیں اور متعین راستے سے بھٹک جانے میں خرابی ہے" قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔۔۔ اے نبی ﷺ ان سے کہو، کیا ہم

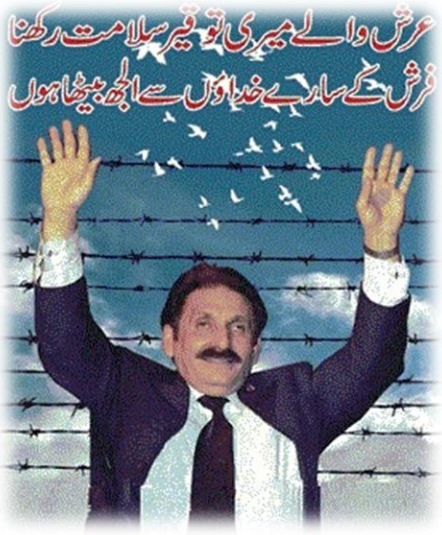

تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام اور نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی راہِ راست سے دور رہی اور وہ یہ گمان کرتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔"(سورۃ کہف 103۔104)

ملکوں اور قوموں کے مسائل کیا ہیں؟ آدمیت خرابی سے دوچار کیوں ہے، زمین فساد سے کیوں بھر گئی؟؟ لوگ قتل کیوں کر دیئے جاتے ہیں، وہ ستائے، روندے اور پامال کیوں کر دیئے جاتے ہیں؟؟؟ کہیں وسائل کی افراط نے وحشت کی لگامیں توڑ ڈالیں ہیں اور قوت واقتدار کے ارتکاز میں رقصِ ابلیس جاری ہے۔ ادھر کچے گھروندں اور لاچار بستیوں میں انسان ایک لقمے ہی کو نہیں، حوا کی بیٹیاں تن ڈھانپنے کیلئے پیرہن تک کو ترستی اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔

لیڈروں کے ریوڑ میں جو اس طرح برسرِ پیکار ہیں، اس بغض حسد رقابت اور عناد کے ساتھ کہ درندوں کو دماغ عطا ہوتا تو حیرت اور رنج سے چیختے۔ ایک ایک گلی، ایک ایک گاؤں، ایک ایک دفتر سے لیکر دنیا بھر کے ایوان ہائے اقتدار تک، آسمان سے باتیں کرتی رفیع الشان عمارتوں میں اقوام اور ممالک کی قسمتوں کے فیصلے کرنے کا سیاسی، مالیاتی اور ابلاغی ایوانوں تک اور تو سب کچھ ہے، انصاف کہیں نہیں ہے۔ سلطانیٔ جمہور کے نام پر سازشیں، تہذیب کے نام پر خوشنما الفاظ کے پردے میں سکندری، چنگیزی اور تیمور خانی کی نمود اور پرداخت، مذہب کے نام پر ریاکاری اور طاقت طلبی، اقوام اقوام کا، ملک ملکوں کا، علاقے علاقوں اور ایک نسل کے لوگ دوسری نسل کے لوگوں کا لہو پینے اور ہڈیاں نوچنے پر آمادہ۔ آدمی نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے بندوں کو بھلا دیا ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا، کوئی شخص اپنے ساتھ انصاف نہیں کرتا، اپنے خاندان کے ساتھ بھی نہیں۔ کوئی گروہ دوسرے گروہ اور کوئی قوم دوسری قوم کے ساتھ عدل پر آمادہ نہیں۔ تب ان کے مالک نے گویا یہ کہا"تم اپنے معاملات اب خود ہی فیصل کرو، میری تو تمہیں ضرورت ہی نہیں، اور آسمانوں سے جیسے آواز آتی ہے، اے میرے بندو تم پر افسوس"!

کیا عظیم مغالطہ ہے جس میں ساری آدمیت گرفتار ہے کہ اسے ترقی اور خوشحالی کی ضرورت ہے، نہیں صرف رزق کی عافیت کی، اور یہ سب کچھ عدل کے بغیر ممکن نہیں۔ ممکن بھی ہو تو عارضی ہے، مستقل نہیں۔ خوشحالی اور آسودگی کیا معنی؟ یہ تو ایک عارضی مستقر ہے۔ مسافر کو سایہ درکار ہوتا ہے، محل نہیں۔ شعیب پھر ایک دفعہ یاد آگئے!

خوب ہو گی یہ سرا دہر کی لیکن اس کا
ہم سے کیا پوچھتے ہو، ہم کو ٹھہرنا کب ہے

جنابِ عباس بن عبد المطلب، سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آسودگی کیلئے دعا کی التجا کی۔ فرمایا: اے میرے چچاؤ! جب سے آدمی اس دنیا میں آیا ہے، اس نے عافیت سے بہتر کوئی دعا نہیں مانگی۔ پھر یہ دعا تعلیم کی "اے میرے معبود! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں، میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرتا ہوں"۔

جی ہاں! دعا، دعا ہی آدمی کا پہلا اور آخری ہتھیار ہے، اللہ سے اس کا سب سے بڑا رشتہ! لیکن یہاں تو دعا مانگنے کی بھی فرصت نہیں۔ جو لوٹ مار کر کے مال جمع کیا اس کو اپنی ذہانت پر معمول سمجھ کر خود کو کسی بھی انصاف سے مبرا گردانا گیا۔ دنیا جو عدل و انصاف کی متمنی ہے، افراد جو عدل و انصاف کیلئے دہائی دے رہے ہیں اور جو اس کیلئے اپنی جانوں سے گئے تھے اب ان سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ تاریخ کے پہیئے کو واپس جانے کیلئے راستہ دیں، وہ خود کو ہر قسم کے احتساب سے بھی بری الذمہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کا قانون ان کو ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ کیا وہ بھول گئے کہ آقائے نامدار ﷺ سے ایسی ہی سفارش کی گئی تھی کہ مجرم ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس سے نرمی اختیار کی جائے جس کے جواب میں ایک ایسا تاریخی فیصلہ آیا جس نے انسانیت کو فرش سے عرش تک پہنچا دیا۔ "خدا کی قسم اگر یہ چوری فاطمہ (رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر) بھی کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا"۔

اس کے بعد اور کیا دلیل باقی رہ جاتی ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں کا سیلاب جس نے عدل کے حصول کیلئے اس عدلیہ کو بحال کروایا اور اب افتخار محمد چوہدری اپنے سترہ رکنی ساتھیوں کے ساتھ اس میدان میں اترا ہے۔ انسان کا وصف ہے کہ یہ کبھی اپنی آزادی واپس نہیں کرتا، اس لئے اب یہ ہماری آزادی بھی واپس نہیں ہو گی۔ اب اس ملک کو آگے بڑھنا ہے اور انصاف کے قائم ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ صاحبِ اقتدار اپنے پاس لکھ کر رکھ لیں کیونکہ عدلیہ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ قوم کی امنگوں پر پورے اتریں گے اور وہ یہ کر کے رہیں گے اور وہ یہ کر سکتے ہیں!

رہے نام میرے رب کا جس کا سارا نظام عدل پر قائم ہے!

بروز جمعتہ المبارک 26 ربیع الاوّل 1431ھ 12 مارچ 2010ء

عالمِ شہود

آج بیٹی نے پہلا حرف لکھنا سیکھ لیا ہے۔ باپ چشمِ تصور سے بیٹی کو ننھی ننھی انگلیوں میں قلم تھامے دیکھ رہا ہے۔ اس کے آنسو ہیں کہ تھمنے کو نہیں آ رہے۔ خدشات، آرزوئیں اور امیدیں، پانی کے ان قطروں میں دائروں کی طرح ابھرتی اور مٹتی ہیں۔ خدشات اس مستقبل کے بارے میں جو ابھی پردۂ غیب میں ہے، وہ غیب جس کی کنجیاں صرف اس عالم پروردگار کے پاس ہیں۔ آرزو اور امید جو اس دن سے باپ کے ہمسفر ہے جب اس کے آنگن میں یہ کونپل پھوٹی تھی اور جسے،،صبا،، کا نام دیا گیا تھا۔ ابھی اس کے آنگن میں یہ کونپل پھوٹی بھی نہیں تھی تو میاں بیوی نے اس کلی کا نام،،صبا،، سوچا تھا۔ یہ نام اس کے سوا کیا ہے کہ اپنے دامن میں امیدوں کا ایک ہجوم لئے ہوئے ہے۔

مستقبل جو پردۂ غیب میں ہے اور غیب جو خدشات کو جنم دیتا ہے، اسے اپنے رب پر چھوڑ دینا چاہئے جو بندے سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہے جیسے وہ اپنے رب کے بارے میں گمان کرتا ہے اور امید کا دامن تھام لینا چاہئے جو خدشات پر مقدم اور انسان کی سعی وجہد کا ماخذ حقیقی ہے۔ امید نہ ہو تو قدم اٹھنے رک جائیں، ہاتھ غیر متحرک ہو جائیں اور ذہن خوابیدہ ہو جائے۔ گویا زندگی کسی ایک لمحے کی گرفت میں محبوس ہو جائے۔ یہی حبس اور ٹھہراؤ موت کا دوسرا نام ہے۔ آرزو امید سے جدا نہیں، اس کی ہم جھولی ہے، اس کے ساتھ جنم لیتی ہے، اس کے ساتھ پلتی بڑھتی، اس کے ساتھ کھیلتی، اٹھکیلیاں کرتی اور اس کے ساتھ ہی جوان ہوتی ہے۔ آرزو امید کی ہم زاد ہے، یہ امید ہے جو دراصل آرزو ہے۔ اس مقام پر شاہد و مشہود کی تفریق بے معنی ہے اور یہاں غالب کی ہم نوائی کے سوا کوئی چارۂ نہیں۔

یہی امید باپ کے ہم رکاب ہے اور وہ چاہ رہا ہے کہ اس کی بیٹی کے قلم سے نکلنے والا یہ پہلا حرف عالمِ شہود میں ا س "ن" کے ہم معنی ہو جائے جس کے معنی ان تمام عالموں کے پروردگار کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہاں! ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ رب نے جب قلم کی قسم اٹھائی تو پہلے "ن" کا ذکر کیا۔ باپ چاہتا ہے کہ یہ پہلا حرف کسی کلمے میں ڈھلے تو وہ "اقرا" کے مثل ہو۔ "اقرا" کیا ہے؟ یہ وہ راز ہے جو صاحبِ وحی کیلئے بھی اس وقت تک غیب ہے جب تک کہ عالمِ الغیب اس سے پردہ نہ اٹھا دے "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ" (اے محمد ﷺ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا"

باپ کے آنسو امید میں ڈھلتے ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ بیٹی کو اپنی ماں..... تمام کے تمام مومن مردوں اور عورتوں کی برگزیدہ ماں..... سیدہ عائشہ کے قدموں میں بیٹھنے کا سلیقہ آ جائے، جن کے حضور میں کلام اور منطق پانی بھرتے اور جن کے دروازے پر حضرت عمر ابن خطاب جیسے صاحبانِ علم سوالی بن کر کھڑے ہوتے تھے۔ جو اس بیت کی اہل تھیں جہاں سیدنا جبرائیل علیہ السلام وحی کے ساتھ اترتے تھے اور جنہیں اللہ نے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ اس گھر میں نازل ہونے والے دین کا دنیا کے سامنے چرچا کریں (الحجرات 33-34) باپ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی کا شمار اپنی ماں کے علم و

کردار کے وارثوں میں ہو جن کی تعداد افسوس کہ اس امت میں سمٹتی جاتی ہے۔ مردوں میں تو شائد چند نام تلاش کئے جا سکیں لیکن امت کی پوری تاریخ ایسی خواتین سے الا ماشاء اللہ خالی ہے جنہیں قرآن فہمی اور حدیث شناسی میں اپنی ماں سے کوئی نسبت ہو.....باپ کی خواہش ہے کہ پہلے حرف کی کتابت سے شروع ہونے والا یہ سفر ہر موڑ پر اسی نسبت کا اعادہ ہو۔

باپ اپنے آنسوؤں میں اس مسلمان عورت کی تصویر بھی دیکھتا ہے جسے اس عہد میں جینے کا عذاب سہنا پڑا جسے کبھی مذہب، کبھی روایت اور کبھی رسوم کے عنوان سے قتل کیا گیا۔ وہ عورت جو جنسی تشدد کا نشانہ بنے تو اہل مذہب مطالبہ کرتے ہیں،، پہلے وہ چار بالغ، عاقل اور نیک سیرت گواہ لاؤ جنہوں نے تمہیں اس عمل سے گزرتے دیکھا ہے ورنہ ہم تمہیں پتھر مار مار کر مار ہی ڈالیں گے،، وہ عورت جو جیون ساتھی کے انتخاب میں آزادئ رائے کا اظہار کرے تو خود ساختہ غیرت کی تلوار سے اس کی گردن اڑا دی جائے اور اس کے لہو کے داغ ان کے دامن پر ہوں جن کیساتھ کھیلتے وہ جوان ہوئی ہے اور جن کے ساتھ وہ ایک ہی ماں کی چھاتیوں سے زندگی کشید کرتی رہی ہے۔ وہ عورت جسے آزادی کے نام پر جنس بازار اور مرد کی ہوس ناک نگاہوں کیلئے سامانِ تعیش بنا دیا گیا ہے جو برہنگی کو اپنا لباس سمجھتی ہے اور جس کیلئے شرم وحیا عہد رفتہ کے بے معنی لفظ ہیں۔

باپ کی آرزو ہے کہ بیٹی کا علم ایسی عورت اور ایسے مذہب ،روایت اور آزادی کے درمیان ڈھال بن جائے۔ باپ کے میں کہیں آنسوؤں میں آرزو اور امید کے ان ان گنت دائروں کہیں خدشات کا دائرہ بھی ابھرتا ہے۔ بیٹی کو جس عہد میں جینا ہے وہ اس کے علم کیلئے ساز گار ہے نہ کردار کیلئے۔ علم آج معاش کا اسیر ہے ، علم کی حیثیت کا تعین اس قیمت سے ہے جو اہل بازار اس کیلئے لگاتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس یہ "بازاری علم" ہے تو اس پر وزارت اور پھر وزارتِ عظمٰی کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں، ترقی خود زینہ بنتی اور اس کے قدموں تلے بچھتی چلی جاتی ہے، رہا حقیقی علم تو اس کی بے توقیری اس عہد کے نامہ اعمال میں سب سے نمایاں ہے۔

کردار کی کنجی تربیت ہے اور تربیت کی کنجی پہلے مرحلے میں ماں باپ کے پاس ہے۔ بیٹی کا باپ کیسا ہے، کیا وہ جانتا ہے اس کے فرائض کیا ہیں؟ کیا وہ اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق سے واقف ہے؟ وہ اپنے ساتھ جینے والوں کے حقوق کی خبر رکھتا ہے؟ وہ گھر کے ملازمین کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتا ہے یا ان کی انسانیت کا احترام کرتا ہے؟ کیا وہ باخبر ہے کہ اللہ نے مخلوق کو اپنا کنبہ قرار دیا ہے اور وہ اللہ کے اس کنبے کا خیال رکھتا ہے؟ کیا وہ اپنی معاشرتی ذمہ

داریوں سے واقف ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ اس کی بیٹی جو لقمہ کھاتی ہے وہ رزقِ حلال ہے؟ کیا بیٹی کی ماں اسے بتاتی ہے کہ انسانی طاقت کا اصل سرچشمہ اس

کا کردار ہے؟ کیا وہ اسے سکھاتی ہے کہ اللہ نے سب انسانوں کو ایک جیسا بنایا ہے؟ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری نہیں؟ کیا وہ اسے بتاتی ہے کہ انسان کی سب سے بڑی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور اس کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اپنا تزکیہ کرتے ہیں؟

تربیت کا دوسرا میدان معاشرہ ہے۔ باپ یہاں تک پہنچتا ہے تو خدشات کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دوسرے سب دائرے اس میں گم ہو گئے ہیں لیکن اچانک اس کی کوکھ سے امید کا دائرہ ابھرتا ہے، ایسے ہی جیسے اس عالم کا پروردگار موت سے زندگی، زندگی سے موت اور پھر موت سے زندگی کو جنم دیتا ہے۔ بس ایسے ہی امید پھر ایک لہر کی طرح اٹھتی اور ایک دائرے میں بدل جاتی ہے اس پیغام کے ساتھ کہ خدشات زندگی کے ہم سفر ہوں تو پاؤں میں ناامیدی کی زنجیر ڈال دیتے ہیں۔ باپ کو تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کی آرزو اور اس کے عمل نے کتنی ہم آہنگی ہے۔ وہ بیٹی کو جس طرح کا دیکھنا چاہتا ہے اس کیلئے ایک خاص طرح کا باپ چاہئے، کیا وہ ایک ایسا باپ ہے؟ اگر نہیں تو ایسا باپ بننے کیلئے اسے کیا کرنا ہے؟ اسے تو صرف اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔

امید کا سفر یہاں پہنچتا ہے تو ایک دعا میں ڈھل جاتا ہے اور باپ اپنے رب کے دامن کو تھام لیتا ہے،، پروردگار میری بیٹی کو ویسا ہی بنا جیسا میں چاہتا ہوں ۔اے میرے رب! میری چاہت اور تیری رضا میں کوئی تفاوت نہ ہو، پروردگار! پہلے حرف سے شروع ہونے والے اس سفر کو "ن" اور "اقرا" کی روایت سے جوڑ دے۔" آنسو اس مرحلے پر آواز اور نگاہ دونوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ باپ کو لفظ اب دکھائی نہیں دیتے اور وہ قلم رکھ دیتا ہے۔ رہے نام میرے رب کا جس نے بیٹیوں کی پرورش پر جنت کا وعدہ فرمایا!

(عائشہ گرلز اسکول کے سالانہ یومِ والدین کے موقع پر یہ مقالہ پڑھا گیا)

بروز ہفتہ 27 ربیع الاوّل 1431ھ 13 مارچ 2010ء

عزتِ نفس

میڈیا کی آزادی اب زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونا شروع ہو گئی ہے۔ چند سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر سرعت کے ساتھ معاشرے میں ہونی والی برائی یا کوئی ایسا خفیہ گوشہ آن کی آن میں ساری دنیا کے سامنے آجائے گا اور مہذب معاشروں میں اس کا خاطر خواہ رد عمل بھی ہو گا لیکن حیرت ہے ان افراد کی سوچ پر جو آج بھی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کوئی پرواہ کئے بغیر اپنی اسی پرانی روش کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی تازہ مثال اپنے ٹی وی سیٹ پر ہر ایک لمحے میں دیکھ رہے ہونگے کہ کس طرح ملک کے وہ ادارے جن کا سلوگن ہی،، عوام کی خدمت،، ہے وہ کس طرح اس ملک کے عوام کی عزتِ نفس کو پامال کر رہے ہیں۔ لفظ،، چھترول،، ایک خالصتاً پولیس تھانوں کی زبان میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی عملی تصویر میڈیا نے پیش کر کے ملک کے عوام کو اس سے متعارف کروا دیا ہے۔ این آر او پر عدلیہ کے فیصلے کے بعد اب چھترول اس ملک کا گویا سب سے بڑا موضوع بن گیا ہے اور شائد کچھ دنوں کیلئے ایوان صدر پر جو چھترول ہو رہی تھی اس میں کچھ کمی ہو جائے۔

لیکن کبھی آپ نے اپنے معاشرے پر غور کیا ہے کہ اس ملک میں ہر قدم پر انسانوں کی عزتِ نفس پر جو چھترول ہو رہی ہے اس میں ہمارا کردار کیا ہے ؟ آیئے میں آپ کو اسی معاشرے کے چند کرداروں سے ملواتا ہوں جو ہر لمحے آپ کی آنکھوں کے سامنے سرزد ہوتے ہیں اور ہم نے اب اس کو ایک معمول سمجھ کر اس پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

اکثر آپ نے گھومتی ہوئی کرسیوں، بڑی بڑی میزوں، آراستہ دفاتر اور دروازوں پر کھڑے دربانوں میں بیٹھے ہوئے یہ لوگ جن کے چہروں پر ہر دوسرے لمحے موسم بدلتے ہیں، کبھی مسکراہٹ اور خوشامد کا موسم اور کبھی غصے اور حقارت کی رت دیکھی ہو گی۔ یہ لوگ ذلت سہنا بھی خوب جانتے ہیں اور موقع ملے تو کسی کی تذلیل سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم نے بچپن سے لیکر آج تک ان کو ہر زاویے سے دیکھا ہے، ان کی تیز گزرتی گاڑیوں کی دھول بھی کھائی ہے، ان کے دروازوں پر گھنٹوں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر بھی دیکھا ہے، ان کے ساتھ ایک عام شہری کی طرح گفتگو، سوال و جواب کا منظر بھی ازبر ہے، ان کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے مزاجوں اور چند ثانیوں میں تبدیل ہوتے لہجوں کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اس سارے گورکھ دھندے میں مجھے صرف ایک چیز پاؤں میں روندتی ہوئی نظر آتی ہے صرف ایک متاع ہے جو زخم زخم ہوتی ہے اور وہ ہے انسان کی عزتِ نفس، آیئے میں اس کھلونے کے ساتھ کھیلتے ہوئے چند منظر ناموں میں لئے چلتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اس سفر میں آپ کو دل تھام کر خاموشی سے ان کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کرنا ہو گا۔

یہ ایک سائل ہے جو کئی گھنٹوں سے باہر کھڑے چپڑاسی کی جھڑکیاں کھاتا، صاحب کے پی اے کی خوشامدیں کرتا اور بعض اوقات ان کی مٹھی گرم کر کے بالآخر دفتر میں افسر کے سامنے کانپتے ہاتھوں سے درخواست آگے بڑھاتا ہے۔ صاحب قلم سے کچھ لکھنے لگتا ہے، اتنے میں وہ فریادی لہجے میں زبان کھولتا ہے تو صاحب کی غصے بھری آواز اس کا خون خشک کر دیتی ہے "تمہیں کس نے کہا بولنے کو، میں نے پوچھنا ہو گا تو خود پوچھ لوں گا" درخواست پر

ہلکے سے دستخط کر کے ایک طرف پھینک دی جاتی ہے۔ سائل کچھ کہنے کیلئے منہ کھولتا ہے تو پھر وہی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے "بس اب جاؤ، جان چھوڑو،" "لیکن سر آپ میری بات تو سنیں" میں نے پڑھ لیا ہے جو تم نے اس درخواست میں لکھا ہے"۔ "صاحب! میں کہاں سے پتہ کروں کہ میرا کام ہوا ہے کہ نہیں؟ "صاحب کے چہرے کا رنگ فوراً بدلتا ہے، الٹے ہاتھ پر لگی ہوئی گھنٹی پر صاحب کی انگلی لگنے کی دیر ہے کہ چپڑاسی اندر داخل ہوتا ہے ،صاحب کا مزاج آشنا ہے، وہ اس سائل کو بازو یا کندھے سے پکڑتا ہے اور یہ کہتا ہوا کہ آؤ میں بتاتا ہوں، باہر لیجاتا ہے۔ باہر کی دنیا جہاں اس جیسے کئی اور سائل اسے اس ذلت اور رسوائی سے باہر آتے ہوئے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

دفتر کی ایک مخصوص "گھنٹی" پر ایک کلرک فائلوں کا ایک انبار لئے ہوئے میز کی بائیں جانب ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ سامنے خالی ٹرے میں تمام فائلوں کو ایک ترتیب سے رکھ کر صاحب کے اشارۂ ابرو پر ایک فائل کے کچھ صفحات دکھانے کی جرأت کرتا ہے، کسی ایک صفحے پر صاحب کی آنکھ میں ذرا سی غصے کی چمک آتی ہے تو اس بیچارے کے ہاتھ تھر تھرانے لگتے ہیں، محنت سے ترتیب دی ہوئی فائل ہاتھوں سے پھسل کر گرا چاہتی ہے۔ بڑی مشکل سے ضبط کر کے وہ فائل سنبھالتا ہے اور پھر صاحب کے سامنے اپنا کیا ہوا کام رکھنے لگتا ہے۔ سامنے چند ایک معززین یا دوست بھی موجود جو کافی یا چائے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اچانک کاغذات کی ترتیب، فائل کی تھوڑی سی بے ہنگمی یا پھر کسی کاغذ کے چند سیکنڈ ڈھونڈنے پر موجود نہ ہونے کی وجہ سے صاحب کو غصہ آتا ہے ،عینک اتار کر میز پر پٹخ دی جاتی ہے، ہاتھوں میں پکڑی فائل ہوا میں لہراتی ہے اور کبھی کبھی سخت غصے میں ساتھ کھڑے شخص کے منہ پر ماردی جاتی ہے اور کبھی سامنے رکھی لمبی میز سے پھسلتی ہوئی قالین پر ورق ورق ہو جاتی ہے۔

معافیاں مانگتا اور آئندہ بہتر کام کرنے کا وعدہ کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن غصہ کم خوف سے کانپتا، گالیاں سنتا، اپنے مستقبل سے مایوس وہ اہلکار کاغذ سمیٹتا، نہیں ہوتا اور پھر ان سب لوگوں کے درمیان ذلت اور رسوائی کا داغ لیکر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ ایسے میں کبھی کوئی اس شخص کے دل کے اندر جھانک کر دیکھے تو اس میں ایک ہی خواہش ہو گی کہ اس کی آنکھوں کے کونوں میں جو آنسو چھلک رہے ہیں دریا بن کر امڈ پڑیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے، کسی گوشہ تنہائی میں کسی ایسے شخص کے سامنے جو اس کا درد جانتا ہو، اسے شرمندہ نہ کرے اور وہ اس کے روبرو اپنا درد بیان کر سکے، اپنا دکھڑا رو سکے، اپنی ذلت کا مداوا کر سکے۔

یہ مناظر آپ کو ہر صاحبِ اختیار کے دفتر میں ملیں گے۔ یہ لوگ اپنے سے جونیئر افراد پر برستے ہیں، غصے میں گرجتے ہیں، انہیں کھڑے کھڑے یہ سب سننا پڑتا ہے اور کبھی بھری میٹنگ میں سب کے روبرو، ایسے لمحوں میں کوئی نہیں سوچتا کہ اس کی آنکھوں میں جو ضبط کے آنسو ہیں، اس کے ماتھے پر جو شرمندگی کا پسینہ ہے، یہ سب اسے کس ذلت سے دوچار کر رہا ہے۔ اپنے ہی ساتھیوں کے سامنے اپنے ہی زیرِ سایہ کام کرنے والوں کے روبرو، یہ

منظر صرف دفتر تک محدود نہیں ہیں، اگر کبھی کسی افسر اعلیٰ کو دفتر سے باہر نکل کر چند سیکنڈ کیلئے گاڑی کا انتظار کرنا پڑ جائے تو رات دن شٹل کی طرح کام کرنے والے ڈرائیور کی شامت آجاتی ہے۔ ہم کتنے نازک مزاج ہیں کہ دفتر سے نکلنے سے پہلے گھنٹی بجا کر اعلان کیا جاتا ہے، گاڑی لگواؤ۔ گاڑی سٹارت ہوتی ہے اور پھر ہماری سواری دفتر سے باہر نکلتی ہے۔ میز پر چائے کا کپ غلط رکھنے والے کو، چائے اگر تھوڑی سے پرچ میں گر جائے اس پر، باتھ روم میں تولیہ ڈھنگ سے نہ رکھا ہوا ہو اس پر، کسی کلب میں سروس دیر سے ہے اس کی پاداش میں ہم لوگوں کو سر عام ذلیل ورسوا کر دیتے ہیں اور پھر بڑے فخر سے گردن پھلا کر یہ اعلان کرتے ہیں اگر ان سے محبت سے پیش آؤ تو یہ سر چڑھ جاتے ہیں۔

یہ ذلت ورسوائی ہماری سڑکوں اور چوراہوں پر بھی اس قوم کے عام آدمی کا مقدر ہے۔ آپ کی گاڑی کے سامنے سے کوئی شہر کی اقدار سے ناآشنا بڑھیا یا بے ضرر بچہ گزر جائے تو گاڑی روک کر اسے گالیاں دی جاتی ہیں اور اگر بس چلے تو ذلت کی انتہا کیلئے دو چار تھپڑ بھی رسید کر دیئے جاتے ہیں۔ موٹر سائیکل پر سوار شخص خواہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہو یا بیوی کے ساتھ، ہم اس کی غلطی پر اسے معاف نہیں کرتے، اسے بے عزت کر کے چھوڑتے ہیں۔ آپ نے ٹانگے والے یا ساتھ بیٹھے ہوئے بیٹے کے سامنے ذلیل ہوتے رسوا ہوتے لوگوں کو دیکھا ہو گا لیکن میڈیا کی آزادی کی وجہ سے ہم نے شائد پہلی مرتبہ ٹیلیویژن کی اسکرین پر پولیس کے ہاتھوں اس ملک کے عوام پر چھترول کے مناظر دیکھے ہیں اور ہر آنکھ انسان کی ایسی تذلیل پر شرمسار ہے لیکن یہ تو جسمانی چھترول تھی لیکن پچھلے نو سال سے تمام صلیبی طاقتیں امریکا کی قیادت میں مسلمانوں کی غیرت وحمیت پر جو چھترول کر رہی ہیں اور اس میں ہمارے حکمران اس دستے کا کردار ادا کر رہے ہیں جو چھتر کی دم میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور یہ دستہ امریکا نے بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے اور دوسری جانب حکومت کی طرف سے بدامنی، مہنگائی اور بیروزگاری کی چھترول میں دن بدن شدت آتی جارہی ہے اور عوام اب دونوں ہاتھ جوڑ کر اس حکومت سے پناہ مانگ رہے ہیں جس طرح چنیوٹ کا نوجوان چھترول کے دوران ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا لیکن حکومت شدت سے یہ کہہ رہی ہے کہ ابھی تمہیں مزید تین سال یہ چھترول برداشت کرنا ہو گی!

یہ ذلتوں کے مارے اسی دنیا میں سانس لیتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس مجروح کرنے والے بھی اسی دنیا میں، لیکن ایک بات طے ہے کہ جب عام آدمی ذلیل ورسوا ہوتا ہے تو چند لوگوں کے دل ضرور خون کے آنسو روتے ہیں، ان کی آنکھیں نم ہوتی ہیں لیکن باسٹھ سالہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی مغرور، متکبر اور لوگوں کی عزت نفس کو مجروح کرنے والی آفت ومصیبت آئی، نوکری گئی، گرفتاری ہوئی تو پھر کوئی آنکھ رونے والی نہیں تھی، کوئی دل دھڑکنے والا نہیں تھا، سب یوں آنکھیں پھیر گئے جیسے یہ تو اس کا مقدر تھا، ایسا تو اس کے ساتھ بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔

رہے نام میرے رب جس کے ہاتھ میں ذلت ورسوائی اور عزت عافیت ہے!

بروز اتوار 28 ربیع الاوّل 1431ھ 14 مارچ 2010ء

عزّت توقیر کی داستان

ان کی دھرتی نے سب سے پہلے امریکی فوج، امریکی طاقت اور امریکی چالبازی کا مزا چکھا تھا۔ آج سے ایک صدی قبل امریکا کی فوج ان کی بندرگاہوں پر یہ کہہ کر لنگر انداز ہونا شروع ہوئی تھی کہ ہم تمہیں اسپین کی غلامی سے آزادی کروائیں گے۔ صدیوں سے مار کھاتے ظلم سہتے یہ لوگ اس وقت کیسے مسکرائے ہونگے، وہ جن کی کمریں اسپین کے فوجیوں کے ظلم سہتے سہتے دہریں ہو گئیں تھیں۔ جو ذرا بھی بولتا، غصے میں سینہ پھلاتا، اسے سمندر کے کنارے بنے ہوئے ایک تاریک جیل کے تہہ خانے میں پھینک دیا جاتا۔ زندہ بچ نکلتا تو ایک دن بڑے پادری کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ بپتسمہ کیلئے تیار ہوتا تو ایک آزاد غلام کی حیثیت سے فلپائن کے بازاریں زندگی گزارتا ورنہ موت اس کا مقدر ہوتی۔

منیلا کے ساحل کے ساتھ اس جیل کو یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس جیل کے تہہ خانوں کی سیڑھیاں اترتے ہوئے سیلن سے رچے خون کی بدبو اور نہائت نیچی چھت سے ٹکراتی چیخوں کی بازگشت سے سانس بند ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ جونہی ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچتے ہیں جہاں اس قوم کی آزادی کا ہیرو اور بانی رزال ایک لمبے عرصے تک قید رکھا گیا تھا تو اس کمرے کے در و دیوار مغرب کے مشرق پر ظلم و بربریت کے قصے سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ وہی بند کمرہ ہے جہاں رزال کی ماں نے ایک لیمپ کسی طرح رشوت دے کر بھجوایا تھا کہ اس کا بیٹا شاعر اور ناول نگار ہے ،اسے پڑھنے میں مدد دے گا۔ جیل والوں نے کہا کہ اس میں تیل تم خود ڈال کر لایا کرو گی، ہم تیل کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہر صبح ماں وہ لیمپ لے جاتی، سارا دن اس سے اسے اپنے بیٹے کی خوشبو آتی رہتی۔ شام کو وہ اسے صاف کر کے اس میں تیل بھر کر واپس لے آتی۔ اسی لیمپ میں اس کی ماں نے ایک خفیہ خانہ بنا رکھا تھا جس میں خالی کاغذ رکھ دیتی تھی اور صبح تک رزال ان پر اپنی شاعری اور اپنا افسانہ لکھ کر بھیجتا رہتا اور یوں جس دن وہ یہ تنگ و تاریک سیڑھیاں چڑھ کر پھانسی کی سزا پانے کیلئے جا رہا تھا پورا فلپائن اس کے ناول میں لکھے گئے باغیانہ فقروں سے گونج رہا تھا۔

ایسی غلامی میں امریکی فوج انہیں آزادی اور جمہوریت کا درس دیتی ہوئی داخل ہوئی۔ مسکراتے فلپائنی جب تھوڑی سی دیر کے بعد جاگے تو ان کی دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ اس زندگی سے انہیں وہ تکلیف دہ موت زیادہ بہتر لگتی تھی جس میں عزت و غیرت تھی، شرم و حیا تھی۔ امریکی فوج نے جہاں ان کی ہر بندرگاہ اور ہر بڑے شہر پر تسلط کیلئے اور اس علاقے میں اپنی جگا گیری کیلئے چھاؤنیاں بنائیں وہیں منیلا کے بازاروں میں ان کی کمسن عورتوں کا بازار سجانے کیلئے ایک پوری یونٹ ایک کرنل کی نگرانی میں مستعد اور چاق و چوبند وہاں متعین کر دی جہاں سب سے پہلے یہ فوجی خود اپنی سفلی پیاس بجھاتے اور دور دراز متعین امریکی فوجی اپنے بھائی بندوں کی نگرانی میں عیاشی کا مزہ لوٹتے۔

ان سے زیادہ کون جانتا ہو گا ان زخموں کو جو امریکی سپاہیوں اور عیاش سیاحوں نے ان کی معصوم اور سادہ زندگی پر لگائے۔ مکاتی، پاسگ اور منیلا کے بڑے بڑے بازاروں میں آج بھی امریکی فوج کے بنائے ہوئے یہ بازار موجود ہیں۔ اس قوم سے زیادہ کس کو خبر ہے کہ ان پر بدترین آمروں کو کون مسلط کرتا

رہا ہے۔ اسی قوم کے حکمرانوں سے زیادہ کون جانتا ہے کہ جتنی دیر کیلئے وہ امریکا کیلئے کارآمد رہتے ہیں، ڈکٹیٹر مارکوس کی طرح حکومت کرتے ہیں اور جب
ناکارہ ہو جاتے ہیں تو پردیس میں ذلت ورسوائی کی موت مرتے ہیں۔

یہ ملک آج بھی امریکا اور امریکی فوج کا دستِ نگر اور محتاج ہے، آج بھی امداد کے ٹکڑے اور فوجی سازوسامان کی بھیک اسے امریکا سے ملتی ہے، آج بھی اس کی سرزمین امریکی اڈوں سے آباد ہے، وہی اڈے جہاں سے پورے مشرقِ بعید پر حکمرانی کی جارہی ہے۔ امریکی پالیسیوں میں گھٹا ہوا یہ ملک آج بھی اس قدر غریب ہے کہ اس کے ۸۰ لاکھ مرد اور عورتیں پوری دنیا کے گھروں میں آیاؤں، ڈرائیوروں اور دوسرے معمولی ملازمتوں پر بھاری مشقتوں کو جھیل کر اپنے ملک کی معیشت کو سہارا دیتے ہیں۔

کہتے ہیں غیرت کا کوئی ٹھکانہ اور وقت نہیں ہوتا۔ یہ کبھی بھی محکوموں کے دماغ میں جاگ اٹھا کرتی ہے اور ایسا ہی پانچ سال پہلے ہوا جب اس ملک کا ایک عام شہری، ایک معمولی ڈرائیور انجیلو ڈی لاکروز عراق میں اغوا ہوا۔ اغواکاروں نے کہا اپنی فوجوں کو فوراً عراق کی سرزمین سے واپس لے جاؤ۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ امریکا کی محتاج اور دستِ نگر یہ حکومت جو آج بھی مندباؤ کی بغاوت کچلنے کیلئے امریکی فوج کی محتاج ہے، یوں گویا ہوگی کہ دنیا پر انسانی جان کی قیمت کا احساس گونجنے لگا۔ اس حکومت کے ترجمان نے کہا "یہ ڈرائیور ہمارے لئے فلپائن کے ہر جیتے جاگتے انسان کا ہے۔" اس نے "استعارہ کہا" اے فلپائنی قوم آؤ، اسے بچانے کیلئے ہمارا ساتھ دو۔" پھر تاریخ نے نظر بھر کر دیکھا کہ فلپائن نے عراق سے اپنی تمام فوج کو واپس بلا لیا۔ امریکا گرجا، برطانیہ نے غصہ دکھایا، آسٹریلیا نے دباؤ ڈالنے کی پوری کوشش کی لیکن حکومت کا جواب آئندہ آنے والی تاریخ میں قومی مفاد کے معانی مرتب کر گیا۔ انسان کی،، عزت و توقیر " کی داستان رقم کر گیا۔ حکومت نے کہا خارجہ پالیسی سے زیادہ انسانی جان اہمیت رکھتی ہے۔

حکومت تو اسے ملے گی جو ہمارا بہتر کام کرے گا

مجھ پر اس بیان سے جو بیتنا تھی وہ بیت رہی ہے اور میرا ضمیر اس کو بھگت بھی رہا ہے لیکن میں سوچتا ہوں جب ایک انسان کی قیمت کا علم ان کو ہوگا جو افغانستان اور عراق کی جیلوں، گوانتاناموبے کے قید خانوں میں خارجہ پالیسی پر قربان ہوگئے تو وہ کیا سوچیں گے۔ مجھے ایک لاکھ سے زائد ان روحوں کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں جو آزادی کے پروانوں کی طرح کشمیر کے قبرستانوں میں گھر بسا گئیں۔ کاش کوئی ایک آواز، کوئی ایک ترجمان، کوئی ایک بیان صرف اتنا کہہ دے کہ نہیں، خارجہ پالیسی، کیری لوگر بل کی شکل میں مالی امداد قرضے کی معافی، فوجی سازوسامان سے نہیں بنتی، انسانوں کی جان ومال

کی حرمت سے بنتی ہے۔ فلپائن کے پاس تو صرف ایک ڈرائیور تھا، صرف ایک انسان تھا مثال دینے کو، ہمارے پاس تو سینکڑوں، ہزاروں ہیں! لیکن ہم نے اپنے ضمیر کو کہاں غرق کر دیا؟

آمنہ مسعود جنجوعہ اب بھی ہزاروں گمشدہ افراد کی فہرست سینے سے لگائے حکومت کے ہر دروزے پر دہائی دے رہی ہے کہ ان کے پیاروں کا کوئی پتہ بتائے جنہیں اس ملک کے ڈکٹیٹر مشرف نے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں خود پکڑ کر اپنے آقاؤں کے زندان آباد کئے ہیں۔ ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک جسدِ قومی بم دھماکوں، دہشت گردی کی وارداتوں اور ڈرون حملوں کے زخموں سے چور چور ہے، شہریوں کے اعضاء بری طرح شل ہو چکے ہیں، اعلیٰ عدالتوں کی بے توقیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن اپنے آقاؤں کے احکام کی تعمیل میں پرانی تنخواہ پر ہی خدمات بجالا رہے ہیں۔ فلپائن کی طرح ہماری قومی زندگی میں امریکا کہاں نہیں؟ اس ملک کی حکومتوں کی تخلیق سے لیکر تقریباً سارے سیاستدانوں پر "امریکا" کی مہر لگی ہوئی ہے اور کئی سیاسی جماعتیں اب بھی امریکا کی سیاسی موسیقی پر رقص کناں ہیں۔

ہماری معیشت امریکا کے مالیاتی ادارے چلا رہے ہیں، امریکی ماہرین ہمارا قومی بجٹ ترتیب دیتے ہیں، ہماری خارجہ پالیسی کے قلب میں امریکی مفادات کا پرچم لہرا رہا ہے اور ہماری داخلہ پالیسی امریکی ترجیحات پر مرتب ہوتی ہے۔ امریکا کے حکم پر تعلیمی نصاب کو آغا خان بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا ہے تاکہ امریکا کی مداخلت براہِ راست نظر نہ آئے۔ میرا ماتھا تو اسی دن کھٹکا تھا جب پاکستان کے امشہور اخبار "دی نیوز" میں 24 دسمبر 2009ء کو یو ایس ایڈ کی طرف سے ایک اشتہار چھپا تھا جس میں اگلے چار سال کیلئے پاکستان میں بچوں کیلئے ٹیلی ویژن پروگرام بنانے کیلئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں اور امریکا پاکستان میں ان فلموں پر ڈیڑھ ارب پاکستانی روپے کی خطیر رقم صرف کرے گا۔ امریکا کو ہمارے بچوں سے آخر ایسی کون سی محبت ہو گئی ہے؟ دراصل امریکا اب ہمارے بچوں کیلئے مقامی ابلاغی قتل گاہیں تعمیر کرنے کی منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح ہمارے حکمرانوں نے امریکی ڈروں حملوں کی اجازت دے رکھی ہے، جس طرح جیکب آباد اور پسنی کے ہوائی اڈوں پر امریکی قبضہ تسلیم کیا ہوا ہے اسی طرح امریکا اب اس منصوبے کے تحت ہماری آنے والی نسل کو تباہ و برباد کرنے کے پروگرام پر بڑی تیزی کے ساتھ عمل کر رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے ہاں روسی اور بھارتی ایجنٹوں کی شناخت واضح تھی لیکن اب تو ہم غلامی کی ان حدوں میں داخل ہو گئے ہیں کہ ایسے منصوبہ سازوں کو امریکی تھنک ٹینک یا این جی اوز کہہ کر شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دیکر اپنی عافیت ڈھونڈتے رہتے ہیں!
رہے نام میرا رب کا جو بہترین منصوبہ ساز ہے!

فقر بدنام نہ ہوتا جو فقیر
ایک ہی بابِ طلب تک رہتا

بروز سوموار 29 ربیع الاوّل 1431ھ 15 مارچ 2010ء

زمیں کی رات

بنی اسرائیل کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کنعان میں حضرت کنعان میں حضرت یعقوب اور ان کا خاندان آباد تھا۔ وہاں قحط سالی کی وجہ سے اور حضرت یوسف کے مصر میں وہاں کی حکومت پر مؤثر اثر ورسوخ کی وجہ سے یہ لوگ کنعان سے مصر آئے۔ مصر میں حضرت یوسف نے ان کیلئے ایک علیحدہ انتظامات کئے۔ ان کے معاشی استحکام اور ثقافتی تحفظ کیلئے عام مصریوں سے الگ،، گوشن،، نامی علاقہ آباد کیا۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر پر فرعونوں کی حکومت تھی اور وہ بنی اسرائیل کو لیکر بحر قلزم کے کنارے آئے جہاں فرعون کے وقت غرق ہونے کا تاریخی واقعہ پیش آیا۔ حضرت موسی جزیرہ نمائے سینا میں انہیں لے کر داخل ہوئے۔ اس وقت فلسطین اور اردن میں ایک ظالم اور جابر قوم حکمران تھی۔ ان کے خلاف بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم ہوا مگر یہ خود پسند اور ضدی قوم تھی جس نے جہاد سے منہ موڑتے ہوئے کہا؛

قَالُوا يَامُوسَىٰ إِنَّالَن
نَّدْخُلَهَاأَبَدًّامَّادَامُوا فِيهَافَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّاهَاهُنَاقَاعِدُونَ"وہ بولے کہ موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جاسکتے (اگر لڑنا ہی ضرور ہے) تو تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے (المائدہ5:24)

اس پر اللہ تعالیٰ نے ارضِ فلسطین کو ان پر حرام کر دیا اور سالہا سال سے یہ صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے۔ بعد میں یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین میں آئے۔ حضرت موسی کے دور میں ان کا عالم یہ تھا کہ کبھی بت پرستی کی باقاعدہ اجازت طلب کرتے، کبھی اللہ سے من وسلویٰ کا مطالبہ کرتے اور حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سونے کے بچھڑے کی پوجا کرنے لگ جاتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کی منتخب کردہ قوم ہیں جنہیں ساری دنیا میں منتشر ہونے ، دنیا بھر میں پھیل جانے کا حکم ملا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی بعثت ہوئی تو یہودیوں نے ان کی مخالفت اور ان کے خلاف پروپیگنڈے کا محاذ گرم کر دیا۔ حضرت مریم کے بارے میں غلیظ زبان استعمال کرتے رہے۔ روم میں جاکر آباد ہوئے تو اپنی فتنہ پردازیوں کا بازار وہاں بھی گرم رکھا۔ حجاز میں آئے تو اس زعم میں مبتلا تھے کہ نبی آخری الزماں ﷺ انہی کی نسل سے ہوں گے۔

عربی رنگ میں مکمل رنگے گئے تھے اور عربوں پر اپنا مکمل تسلط جمائے ہوئے تھے، خصوصی طور پر مدینہ منورہ کے ارد گرد ان کی بستیاں آباد تھیں۔ یہ جنگ وفساد کی آگ بھڑکانے میں ماہر تھے۔ اوس وخزرج انہیں کی لگائی ہوئی آگ کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف برسوں تک برسرِپیکار رہے ۔ ظاہر اُخود امحاذ آرائی اور جھگڑے سے اجتناب کرتے مگر دو قبائل دو حکومتوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسر، پیکار رکھتے۔ غزوہ بنو قریضہ، خیبر، فدک، وادئ القریٰ اور تیماء کے معرکوں کے بعد ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئے مگر یہ عہد شکنی، سازشوں اور اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے میں انتہائی ماہر قوم ہے۔ قریب تر تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو جنگِ عظیم اوّل انہی یہودیوں کی بچھائی ہوئی وہ بساط تھی جس میں شطرنج کے مہروں کی طرح برطانیہ اور امریکا استعمال ہوئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہونے والی ان کی منظم تحریک "زاؤنسٹ" تحریک تھی۔ یہ ایک ایسی صہیونی تحریک تھی جس نے تہذیب وشائستگی

کے معیارات بدل کر رکھ دیئے۔ ہر وہ چیز جو یہودی مفاد میں ہو وہ جائز اور اچھائی کی سند رکھتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی اصل وجہ یہودیوں کی حکومت کا قیام تھا مگر فلسطین میں ان کی حکومت کا قیام ان کی منزل نہیں بلکہ دنیا سے تمام مذاہب کا خاتمہ، تمام غیر یہودی اقوام کو اپنا دستِ نگر اور غلام بنانا ان کا منشور ہے جس کیلئے وہ کسی بھی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا ذمہ دار عام طور پر ہٹلر کو قرار دیا جاتا ہے مگر در حقیقت اس کے پیچھے بھی یہ یہودی سوچ کہ ہمارے مفادات جرمن قوم کی مکمل تباہی سے مشروط ہیں، کار فرما تھی۔

امریکا میں ان کا سیاسی اثر ورسوخ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ امریکی صدر ماضی میں ان کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے اور اب بھی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ یہ اتنی ہوشیاری اور عیارانہ کردار سے امریکا کے پورے ریاستی ڈھانچے پر اثر انداز ہو رہے ہیں، جس کو چاہے بامِ عروج تک پہنچا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں پاتال کی گہری کھائیوں میں اتار دیتے ہیں۔ یہ در حقیقت اسلام کے ہی نہیں بلکہ عیسائیت، بدھ مت اور ہر غیر یہودی مذہب کے خلاف اپنے اندر کینہ رکھتے ہیں۔ ہندو مت ان کے درمیان بہت سی عیارانہ عادات میں حیران کن مماثلت ہے۔ مثلاً سودی کاروبار میں ہندو مہاجن اور یہودی ایک جیسا مزاج رکھتے ہیں، گائے کے تقدس کو دونوں ایک جیسا مذہبی احترام رکھتے ہیں، گیروے لباس پر ایک جیسا مذہبی اعتقاد اور چانکیہ کی پوری سیاسی حکمت عملی کا مطالعہ کریں تو ان صیہونی سیاسی سازشوں کی ایک مکمل تصویر نظر آئے گی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان جو جرمنی کا ساتھ دے رہا تھا اس نے امریکی مفادات پر کوئی ضرب نہیں لگائی تھی مگر اس کی سپلائی لائن کو کاٹ کر حالات اس طرح کے بنا دیئے گئے کہ وہ پرل ہاربر پر حملہ کرے اور امریکا جنگ میں کودنے میں مجبور ہو جائے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں دن دہاڑے اسرائیل کی گن بوٹس نے امریکی جہاز یو ایس لبرٹی ڈبو کر الزام عربوں پر لگا دیا۔ نائن الیون کے سانحے کے بارے میں ایمانداری سے تحقیقات کی جائیں تو اس میں بھی اصل ہاتھ ان یہودی پالیسی ساز کا ہے جنہوں نے ایک دفعہ پھر کمال عیاری سے افغانستان اور عراق کی تباہی کے ذریعے عالمِ اسلام کی اجتماعی حیثیت کے مکمل خاتمے کے سلسلے کا آغاز کر دیا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں اصل جنگ معیشت کے میدان میں لڑی جا رہی ہے اور اس میدان کے سب سے ماہر کھلاڑی یہودی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک جائز اور ناجائز کا تعین یہودی مفاد سے وابستہ ہے۔ ہر وہ کام جس سے صیہونیت کا مفاد ہے، وہ جائز اور باقی سب ناجائز۔ یہ دولت کمانے کے تمام ہنر بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور انہیں استعمال کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ سود خوری ان کی خاص صفت ہے جس کے ذریعے بتدریج کمزوروں کو اپنے چنگل میں پھنسا لینا اور تابعداروں میں اضافہ کرنا انہیں خوب آتا ہے۔ کسی بھی ملک میں مقامی لوگوں کو قرضوں کے ذریعے زمین اور اراضی سے محروم

کر دیتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت جرمنی کی تمام صنعتیں یہودیوں کی ملکیت تھیں۔ دوران جنگ مزدوروں کی ہڑتالوں کے ذریعے اندرون ملک جرمنی میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ جنگ ہار گئے۔

یہودی بینکاروں نے ان کے تمام سرمائے کو امریکا اور برطانیہ منتقل کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے جرمن بدترین معاشی حالات کا شکار ہو گئے، انہی حالات نے ہٹلر کو وجود دیا۔ جنگوں کے دوران یہودیوں کو اپنا سرمایہ دونوں فریقین پر لگانا خوب آتا ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی خود شکست کا شکار نہیں ہوتے اور ہمیشہ نفع میں رہتے ہیں۔ امریکا جیسی سپر طاقت کو بھی اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں کیونکہ صہیونی سرمایہ کاروں نے تجارت پر مکمل قبضہ کیا ہوا ہے۔ امریکا کی صنعتی، تجارتی اور پیداواری قوتوں اور ذرائع پر ان کا مکمل کنٹرول اور بالادستی حاصل ہے۔ قرضوں کے نظام میں دنیا کا امیر ترین ملک بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ یہودیوں کی پالیسی یہ ہے کہ مزدوروں اور محنت کشوں کو اعلیٰ معاوضہ اس انداز سے دو کہ انہیں قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس کیلئے اپنی تیار کردہ اشیاء اور سازوسامان کی قیمتوں میں بھی غیر معمولی اضافہ کر دو۔

ان کا معاشی اثر ورسوخ ہر ملک کے سیاسی حالات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور تہذیب وثقافت پر بھی۔ بعض مسلمان ریاستوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جنہیں منی یورپ کہا جاتا ہے، اسلامی ملک کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ تہذیب وثقافت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ ڈیویلپمنٹ کے نام پر صہیونی سرمایہ کاروں نے سٹی سینٹر کے جال بچھا دیئے ہیں کہ چھوٹے تاجر اور سرمایہ کاروں کو اپنی بقاء مشکل نظر آتی ہے۔ چند سال پہلے معاہدہ واشنگٹن کے ذریعے " نیولبرل آزاد تجارت،، کی اصطلاح سامنے آئی ہے اور اس آزاد تجارت کے اندر ترقی پذیر ممالک کی مکمل معاشی تباہی چھپی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا آکٹوپس ہے جس کا شکار ارجنٹائن اور برازیل ہو چکے ہیں۔ یہ وہ کھلی دھاندلیاں ہیں جن کے خلاف عالمی کریمنل کورٹ بھی بے بس نظر آرہی ہے۔

یہ ان صیہونی سرمایہ کاروں کی وہ سازش ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے پاس فصلوں کے ڈھیر بھی لگے ہوئے ہوں تو برآمد نہیں کر سکتے ہیں۔ بغیر بارود اسلحے کے دنیا پر ناجائز قبضے کی ایک اور صورت ہے کہ معاشی دیوالیہ پن قوموں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ ملک پاکستان کپاس اور شکر سازی میں اسی آزاد تجارت کا نشانہ بنا ہوا ہے مگر ہمارے برسرِ اقتدار طبقے کو ابھی ہوش ہی نہیں آرہا۔ ان کی دن رات یہ کوشش ہے کہنہ صرف ملک کے وسائل کو لوٹ کر اپنی تجوریوں کو غیر ملکوں میں محفوظ کیا جائے بلکہ پہلے سے لوٹی ہوئی دولت کو بھی محفوظ کریں چاہے اس کیلئے ملک کے تمام اداروں کو تباہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

یہودی قوم شروع سے پروپیگنڈہ کرنا خوب جانتی ہے۔ افواہیں پھیلانا، کسی مخالف کے خلاف اسکینڈلز کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کرنے کا فن بھی انہیں خوب آتا ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی قد آور شخصیات ان کی مٹھی میں رہتی ہیں۔ انیسویں صدی میں یہودی میڈیا پر اتنا کنٹرول رکھتے تھے کہ انہوں نے جرمن قوم کو دنیا کے سامنے خونی بھیڑیا بنا کر پیش کیا، ہر طرح سے ان کی کردار کشی کی بالکل اسی طرح جس انداز سے تمام اسلام پسند قوتوں کو آج دہشتگرد قرار دیا جارہا ہے۔ یہی لوگ برطانیہ اور امریکا میں ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں اور عوام کے ذہنوں اور خیالات کو اپنی مرضی سے کوئی رخ دینے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔ ان کی مرضی ومنشاء کے بغیر کوئی بات عوام تک مؤثر انداز سے پہنچانا مشکل ہے لیکن ان تمام حالات کے باوجود کشمیر میں

بھارتی فوج کے ہاتھوں چار ہزار بے گناہ کشمیریوں کی اجتماعی قبروں کی نشاندہی ایک سان فرانسسکو کی انڈین امریکن پروفیسر انگنا چترجی نے اپنے ایک امریکی ساتھی پروفیسر رچرڈ شیفر کی مدد سے اپنی حالیہ رپورٹ میں کی ہے جس کیلئے اس نے درجنوں بار کشمیر کا دورہ کیا اور اب امریکی کانگرس کے رکن ڈین برٹن نے امریکی ایوان نمائندگان میں،، کشمیر کا کس،، قائم کرنے کا اعلان کیا ہے جہاں بھارت سے اس سنگین جرم کی باز پرس کی جا سکے۔ کیا ہمارے موجودہ حکم رانوں کو اس بات کی خبر ہے؟

رہے نام میرے رب کا جو جبار بھی ہے قہار بھی!

اداس میں ہی نہیں، شہر میں کہ میری طرح
زمیں کی رات بھی شامل ہے سوگواروں میں

بروز منگل 30 ربیع الاوّل 1431ھ 16 مارچ 2010ء

قائد کی ذہانت اور قراردادِ پاکستان

قوم ہر سال 23 مارچ کو قراردادِ پاکستان بڑے جوش و جذبے اور عقیدت واحترام سے مناتے ہیں۔ میڈیا میں اس دن کے حوالے سے بہت سیر حاصل معلومات پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں اور اسی حوالے سے اسلامیانِ برصغیر کے متفقہ، جرأت مند اور بے داغ کردار کے مالک قائداعظم نے قیامِ پاکستان کی صورت میں جو عظیم اور تاریخی کارنامہ انجام دیا، اس پر خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

بی بی سی کے زیرِ اہتمام ایک عالمی سروے میں قائداعظم کو جنوبی ایشیا کا عظیم ترین رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی عظمت کے کئی پہلو ہیں، جن کا اعتراف دنیا کے تمام انصاف پسند حلقوں نے کیا ہے حتیٰ کہ منصف مزاج ہندو مصنفین اور دانشوروں نے بھی ان کی جرأت واستقامت، بالغ نظری، دور اندیشی ،جمہوریت و قانون پسندی اور دیانت وامانت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور بعض ہندو رہنماؤں نے یہ تک کہا کہ کانگرس میں ایک قائداعظم ہوتا تو برصغیر کی تقسیم نہ ہوتی۔

قائداعظم نے علیحدہ وطن کا مطالبہ اس وقت کیا جب سفیر اتحاد کی حیثیت سے برصغیر کی دونوں قوموں کو اکٹھا رکھنے اور ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت کے سیاسی واقتصادی حقوق جمہوری اصولوں کے مطابق تسلیم کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور انتہا پسند، تنگ نظر اور مسلم دشمن کانگریسی قیادت نے ثابت کر دیا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں ماضی کی حکمران مسلمان قوم کا وجود برداشت کرنے اور آزادی کے بعد اسے عزت واحترام کے ساتھ اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں۔ قائداعظم نے ایک گولی چلائے بغیر اپنی باعزم قیادت اور اسلامیانِ برصغیر کی جمہوری جدوجہد کے ذریعے آزاد خود مختار ریاست حاصل کی جس کے بارے میں وہ بار بار یقین دلا چکے تھے کہ نئی ریاست اسلام کا قلعہ ہو گی اور اس کے سنہری اصولوں کا احیاء کرے گی، جمہوری پارلیمانی نظام کے تحت کام کرے گی اور جدید تقاضوں کے مطابق صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست ہو گی۔

اقبال نے دو قومی نظریہ کے تحت ایک آزاد مسلم ریاست کو جو تصور پیش کیا اور جسے قائداعظم نے حاصل کرنے کیلئے مردانہ وار جدوجہد کی، اس کے بارے میں بانی پاکستان نے بار بار واضح کیا کہ وہ مسلمانوں کے معاش اور روزگار کا مسئلہ حل کرے گی۔ ایک موقع پر انہوں نے کھل کر یہ کہا کہ مجھے ایسے پاکستان میں کوئی دلچسپی نہیں جو جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے حقوق کا محافظ ہو۔ قائداعظم نے اپنی زندگی میں پاکستان کیلئے اسلامی جمہوری پارلیمانی نظام پسند کیا، آئین کے بارے میں واضح طور پر کہا کہ اسلام کے جمہوری اصولوں کے مطابق مدون ہو گا۔ نئی ریاست میں اقلیتوں کو مکمل حقوق حاصل ہونگے جو اسلام نے انہیں عطا کئے ہیں اور فوج کا کردار منتخب جمہوری حکومت کے ایک ماتحت ادارے کا ہو گا۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ قائد کی زندگی ہی میں فوج کے انگریز کمانڈر انچیف نے حکم عدولی کی اور قائداعظم کے احکامات کے تحت پاکستان کی شہ رگ کشمیر میں فوجی دستے بھیجنے سے انکار کیا جب کہ بھارت کے فوجی کمانڈر انچیف نے جواہر لال نہرو کے احکام کی مکمل اطاعت کی اور سرینگر ائیر پورٹ پر قبضہ

کر کے مجاہدین کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔

قائداعظم کی وفات کے صرف دس سال بعد جنرل ایوب خان نے جمہوری نظام کی بساط لپیٹ کر ملک میں فوج کی حکمرانی کا اصول متعارف کرایا جو کسی نہ کسی شکل میں مروج ہے اور آج زرداری صاحب بھی جمہوریت کی آڑ میں سترھویں ترمیم کے تحت فوجی ڈکٹیٹر کے تمام اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ موجودہ صدر نے فوجی یونیفارم نہیں پہنا ہوا بلکہ جمہوریت کا لبادہ اوڑھے ڈکٹیٹر کے سارے اختیارات کے ساتھ قوم پر حکمرانی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ ملک اقبال اور قائداعظم کی تعلیمات کے مطابق نہ تو جدید جمہوری پارلیمانی ریاست بن سکا اور نہ اسلامی فلاحی معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکی ہے البتہ فوجی حکمرانی اور ہمارے سیاسی لیڈروں کی غلط حکمت عملی کے نتیجے میں پاکستان کا اکثریتی حصہ جدا ہو گیا اور باقی ماندہ ملک میں لسانی، نسلی فرقہ واریت، صوبائی تعصبات اور اس خطے میں امریکی مداخلت نے ملک کو ایسے خطرات سے دوچار کر رکھا ہے کہ ملک کی سلامتی کی ہر وقت فکر رہتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل کو تاریخ کے حوالے سے بتایا جائے کہ کن مشکل حالات میں پاکستان کو حاصل کیا گیا اس کا اندازہ ہمیں قائداعظم کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے 25 ستمبر 1944ء کو یعنی ملاقاتوں کے آخری دنوں میں گاندھی جی کو لکھا۔ قائداعظم لکھتے ہیں "کہ آپ پہلے ہی قرارداد لاہور کے بنیادی اصولوں کو مسترد کر چکے ہیں، آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمان ایک قوم ہیں، آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو حقِ خود اختیاری ہے اور وہی اسے استعمال کر سکتے ہیں، آپ یہ نہیں مانتے کہ پاکستان دو خطوں اور چھ صوبوں پر مشتمل ہے..... آپ سے خط و کتابت اور بحث کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انڈیا کی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کی آواز صرف آپ کے لبوں پر ہے، یہ آپ کے دل کی آواز نہیں۔" گاندھی کے اس رویے سے ناکامی اس بات چیت کا مقدر بن گئی۔

29 ستمبر 1944ء کو ویول نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مجھے (اس گفت و شنید سے) بہتر نتیجے کی توقع تھی۔ اس سے ایک لیڈر کے طور پر گاندھی کی شہرت کو شدید دھچکا لگا ہے۔ جناح کا کام بہت آسان تھا، انہیں گاندھی جی سے صرف یہ کہتے رہنا تھا کہ تم بکواس کر رہے ہو اور یہ بات ٹھیک بھی تھی لیکن انہوں نے یہ بات گستاخانہ انداز میں کی..... میرے خیال میں اس سے اپنے پیروکاروں میں جناح کی عزت تو شائد بڑھ گئی ہو لیکن اس معقول آدمیوں کے درمیان ان کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔، ویول اور دیگر انگریز حکمرانوں کی نظر میں معقول آدمی وہ ہے جو ان ہی کے دماغ سے سوچے اور اس پر عمل کرے۔ ان کی معقولیت کی ڈکشنری میں آزادانہ فکر و عمل کی کوئی گنجائش نہیں!

مذاکرات کی ناکامی کے بعد قائداعظم نے 4/اکتوبر 1944ء کو ایک پریس کانفرنس میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی۔ ایک اخباری نمائندہ نے ان سے پوچھا کہ کیا مستقبل قریب

میں گاندھی جی سے آپ کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟ قائداعظم نے مزاحاً کہا کہ مسٹر گاندھی جی کہتے ہیں کہ اس کا انحصار ان کے دل کی آواز پر ہے ،چونکہ میری وہاں تک رسائی نہیں، اس لئے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کی نیت معاملات کو طے کرنے کی تھی ہی نہیں۔ قائد اعظم سے گفت وشنید کے دوران ہی انہوں نے راجکو پال اچاریہ سے کہا تھا کہ اس بات چیت سے میرا اصل مقصد جناح کے منہ سے یہ کہلوانا ہے کہ پاکستان کا تصور ہی غلط اور لغو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو قائداعظم کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں تھا اس لئے ان کی تمام تدابیر غیر مؤثر رہیں۔

1945ء میں قائداعظم کو نظر آرہا تھا کہ اب برطانوی حکومت کو ہندوستان میں الیکشن کرانے ہی پڑیں گے چنانچہ انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہوئے 16/اگست 1945ء کو بمبئی سے ایک بیان میں کہا کہ مسٹر گاندھی جی جب مناسب سمجھیں وہ کسی کے بھی نمائندے نہیں ہوتے، وہ ذاتی حیثیت میں بات کرتے ہیں، وہ کانگرس کے چار آنے کے بھی رکن نہیں۔ وہ اپنے آپ کو صفر کر لیتے ہیں اور اپنی اندرونی آواز سے مشورہ کرتے ہیں ،تاہم جب ضرورت پڑے تو وہ کانگرس کے سپریم آمر بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو سارے ہندوستان کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ مسٹر گاندھی ایک معمہ ہیں..... مسلمانوں اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرس میں اتنا زہر اور تلخی ہے کہ انہیں نیچا دکھانے کیلئے وہ ہر سطح سے نیچے گر سکتی ہے اور تمام اصولوں کو ترک کر سکتی ہے۔

10/اکتوبر 1945ء کو کوئٹہ مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ عام میں انہوں نے گاندھی جی کی سیاست کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ "لیڈری حاصل کرنا، پولیس لاٹھی چارج کے موقع پر بکری کی طرح بیٹھ جانا، پھر جیل چلے جانا، پھر وزن کم ہونے کی شکائت کرنا اور پھر اس طرح رہائی حاصل کر لینا، میں اس قسم کی جدوجہد پر یقین نہیں رکھتا لیکن جب آزمائش کا وقت آئے تو سب سے پہلے میں اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا"۔ 21 نومبر 1945ء کو پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس کو پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنا ہو گا یا مسلمانوں کو کچلنا ہو گا لیکن اب کوئی طاقت دس کروڑ مسلمانوں کو کچل نہیں سکتی۔ 24 نومبر کو انہوں نے اسی شہر میں کہا کہ ،،جب تک میں زندہ ہوں مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بھی بے فائدہ نہیں بہنے دوں گا، میں مسلمانوں کو کبھی بھی ہندوؤں کا غلام نہیں بننے دوں گا..... انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بالکل واضح ہے کہ ہمیں ان دونوں سے لڑنا ہے..... ہم ان کی متحدہ طاقت سے لڑیں گے اور انشاءاللہ کامیاب ہوں گے۔"

3 دسمبر 1945ء کو گاندھی جی کی بنگال کے گورنر "کیسی" سے ملاقات ہوئی تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ "جناح ایک جاہ پسند آدمی ہیں اور ان کی سوچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے درمیان رابطہ قائم کریں، میں نہیں سمجھتا کہ جناح اپنے ان خوابوں سے باہر آسکتے ہیں"۔ دراصل گاندھی جی الیکشن کے نتائج اور اس کے متوقع اثرات کا اندازہ ہو رہا تھا اس لئے قیامِ پاکستان سے پہلے ہی انہیں اسلامی یکجہتی کی فکر پریشان کر رہی تھی، واضح رہے کہ یہ وہی گاندھی جی ہیں جو مسلمانوں میں بھی اپنی لیڈر شپ قائم کرنے کیلئے تحریکِ خلافت کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے، اب وہ بنگال کے پاکستان مخالف گورنر کے ذہن کو مزید زہر آلود کرنے کیلئے اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کر رہے تھے۔

23مارچ 1946ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔3/اپریل1946ء کو گاندھی جی کی مشن سے گفتگو ہوئی،انہوں نے صرف ایک دھوتی باندھی ہوئی

تھی اور بہت صحت مند دکھائی دے رہے تھے۔ گاندھی جی نے مشن سے کہا کہ جناح کو ملک کی پہلی (عبوری) حکومت بنانے دیں،وزراء ملک کے منتخب نمائندوں میں سے ہوں،جناح جس کو چاہیں لیں لیکن وزراء کو اپنی اپنی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لینا پڑے گا۔ اگر جناح حکومت بنانے سے انکار کر دیں تو پھر کانگرس کو یہی پیشکش کی جائے۔ آپ نے گاندھی جی کا انداز دیکھا کہ وزیر اعظم جناح صرف ان لوگوں کو چن سکیں گے جن پر ان کی اسمبلیاں اعتماد کا اظہار کریں۔ اپنی آبادی کی وجہ سے مسلم اقلیتی صوبوں کی اسمبلیوں میں ہندوؤں کی بڑی بھاری اکثریت تھی،ادھر عوام میں انتہائی مقبولیت کے باوجود، مسلم اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نشستیں نہ ملنے پر مسلم لیگ کو قطعی اکثریت حاصل نہ تھی اس لئے مجبوراً اسے تقریباًسارے کے سارے کانگریسی ہندو یا غیر لیگی مسلمان وزیر رکھنے پڑتے۔ ایسی پیشکش کو قائداعظم کیوں قبول کرتے اور اس کے بعد حکومت خود بخود کانگرس کے پاس چلی جاتی۔ یہ تھی گاندھی جی کی پیشکش قائداعظم کیلئے!

بروایں دام بر مرغ دگر نہ

کہ عنقارابلند است آشیانہ

پیتھک لارنس نے گاندھی جی سے کہا کہ اس طرح تو جناح کے زیادہ تر وزراء غیر لیگی ہی ہونگے، گاندھی جی نے کہا کہ اس سے تو گریز نہیں،ایسی بات کو کون آگے بڑھاتا۔

لارڈماؤنٹ بیٹن نے متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے کے طور پر24مارچ کو حلف اٹھایااور فوراً بعد سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں ۔ گاندھی جی نے31مارچ سے 14 اپریل1947ء تک ہر روز لارد ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ یکم اپریل کی ملاقات میں گاندھی جی نے تجویز کیا کہ

مسٹر جناح کو متحدہ ہندوستان کا وزیر اعظم بنادیا جائے اور جب تک وہ ہندوستانی عوام کے مفاد میں کام کرتے رہیں گے، کانگرس ان کے ساتھ پورے خلوص کے ساتھ تعاون کرے گی.....اس بات کا فیصلہ کہ وہ عوام کے مفاد میں کام کر رہے ہیں یا نہیں،صرف اور صرف لارڈماؤنٹ بیٹن ہی کریں گے،اگر جناح یہ تجویز نہ مانیں تو پھر کانگرس کو یہی پیشکش کی جائے۔ماؤنٹ بیٹن تسلیم کرتے ہیں کہ میں گاندھی کی یہ تجویز سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ انہوں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ اس تجویز کے بارے میں مسٹر جناح کا کیا تاثر ہو گا؟ گاندھی جی نے جواب دیا اگر آپ انہیں یہ کہیں گے کہ یہ تجویز گاندھی کی طرف سے آئی ہے تو جناح کہیں گے "مکار گاندھی"۔ماؤنٹ بیٹن نے مزے لے لے کر پوچھا"غالباًیہ بات درست ہو گی"۔ اس پر گاندھی جی بڑے جوش سے کہا"نہیں نہیں میں یہ تجویز پورے خلوص سے پیش کر رہا ہوں"۔

قائداعظم سے بات کرنے سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے اسی دن یہ بات نہرو کو بتائی تو یہ سن کر ان کے مہاتما (گاندھی) ان کی جگہ قائدِاعظم کو وزیراعظم بنانے کی پیشکش کر رہے ہیں، نہرو کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ گزشتہ برس گاندھی جی کیبنٹ مشن کے سامنے بھی ایسی ہی تجویز پیش کی تھی لیکن یہ مسئلے کا ایک غیر حقیقی حل ہے۔ گاندھی جی کو دہلی میں چند دن اور رہنا چاہئے کیونکہ چار مہینے تک مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے وہ تیزی سے معاملات سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ نہرو کی رائے سننے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اگر ماؤنٹ بیٹن قائداعظم سے یہ بات کر بھی لیتے کیا ہوتا؟ وہ اپنی ذات کیلئے قوم کو داؤ پر لگا دینے والے ہرگز نہیں تھے، اس قسم کی پیشکش کو وہ بغیر کسی تامل کے ٹھکرا دیتے۔

ان چند واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی نیت اور طریقِ کار کو قائداعظم خوب سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کا ہر لحاظ سے مناسب جواب دیا! رہے نام میرے رب کا جس نے پاکستان کو ایک خاص مبارک رات کو ایک بہت بڑے مقصد کیلئے بنایا!

بروز جمعرات 2 ربیع الثانی 1431ھ 18 مارچ 2010ء

اندھیری رات کے مسافر

بجلیاں ہیں، قہر ہے، آلام ہے۔ کتنی وادیاں اور چھوٹی بڑی بستیاں ان کی زد میں ہیں۔ اضطراب اور بے چینی کی لہر نے سارے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ قبائلی علاقے جہاد کے ثمرات کا تلخ ذائقہ مسلسل چکھتے چلے آرہے ہیں اور اب ایک دفعہ پھر اس کا رد عمل بڑی عیاری کے ساتھ ملک کے بڑے شہروں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا سب سے اہم شہر لاہور ایک دفعہ پھر مقتل گاہ بنا دیا گیا ہے۔ جمعتہ المبارک کے دن شدید بدترین قسم کی دہشت گردی نے ایک ہی دن میں چھ بم دھماکوں جس میں دو خودکش حملے بھی شامل ہیں، نے ملک کے باسیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آخر ہم کب تک شہنشاہ دوران کی خوشنودی کی خاطر جو فصل ہمارے حکمرانوں نے بوئی ہے، بے گناہ عوام اپنی جانوں کی قربانی سے اس کو کاٹتے رہیں گے۔ شائد جرمِ ضعیفی کی یہی سزا ہوتی ہے، نہ اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے۔

روس کو افغانستان سے بھگانا تھا تو یہی مجاہدین کے محترم نام سے پہچانے جاتے تھے، تمام مغرب کی آنکھوں کے تارے تھے۔ بنجارہ لاد گیا، اشتراکی روس کی بساط لپیٹ دی گئی، امریکا واحد سپر پاور بن گیا۔ بجائے عید منانے کے طاقت کے نشے میں چور عقامی دانشوروں نے نیا حریف ڈھونڈ نکالا جسے سیاسی (انقلابی) اسلام کا نام لیکر مغربی تہذیب کیلئے خطرہ قرار دیا۔ ان کے بھاگوں گیارہ ستمبر کا سانحہ ہو گیا۔ نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر زمین بوس ہوا اور انقلابی اسلام کے خلاف طبل جنگ بج گیا، کہنے کو دہشت گردی دشمن قرار پائی مگر حملہ افغانستان پر ہوا جہاں ملا عمر کی قیادت میں طالبان اپنی طرز کا اسلامی نظام رائج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روس کے خلاف برسرپیکار ملکی اور غیر ملکی مجاہدین ان کے ہمنوا تھے۔ طالبان سے اقتدار چھن گیا تو ان کے شانہ بشانہ روسی فوج سے لڑنے والوں کو جہاں جگہ ملی سر چھپانا پڑا، کچھ ہمارے قبائلی علاقوں میں آگئے مگر امریکا کو یہ منظور نہ تھا۔ کہا گیا کہ نئی افغان حکومت کو ان سے خطرہ ہے۔

اب چراغ رخِ زیبا لیکر ہم ان دشمنوں کو ڈھونڈنے اپنے ہی گھروں کی تلاشی لے رہے ہیں۔ کہیں سراغ ملتا ہے تو آتشبازی ہو جاتی ہے، دونوں طرف کے شہیدوں کو دیکھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، گردشِ ایام پیچھے کو لوٹ جاتی ہے۔ جنگ جمل میں بھی یہی ہوا تھا، اپنے ہی آمنے سامنے صف آراء تھے ۔ وہ جنہیں جیتے جی جنت کی بشارت دی گئی تھی، اختلاف باہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ تلواریں چلیں تو بوڑھا آسمان بھی رویا ہو گا، جنگ صفین کے موقع پر بھی اس نے آنسو بہائے ہونگے اور کربلا میں جو آفت ٹوٹی تھی اس پر تو خلقِ خدا صدیوں سے ماتم کرتی چلی آرہی ہے۔ حوادث زمانہ نے پھر سے ہمیں اسی موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ بگڑی بنانے کی فکر تو سب کو ہے مگر مقامی سطح پر اعتماد کی فضا پیدا کرنے کا اہتمام نہیں ہو پا رہا۔ ٹوٹے ہوئے پلوں کی از سر نو تعمیر نہیں ہو پا رہی۔ مقامی سطح پر وہ مزدور اور مستری موجود نہیں جو یہ کار خیر کر پائیں، اگر ہیں تو انہیں چارۂ گری کا موقع نہیں مل رہا۔

ذرا اور جنوب کو آیئے، یہ وسیع و عریض خطہ بلوچستان ہے۔ ہر سو انتشار پھیلا ہوا ہے۔ شکوہ شکائت تو پرانی ریت ہے، عوام سے وہاں مہربانی تو کیا ، انصاف تک کبھی ہوا نہیں۔ وہی چال اپنی بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ آبادی کا خاصا حصہ دور دراز پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں آباد ہے۔ وہ

نہیں جانتے حکومت کس سونے کی چڑیا کا نام ہے، اپنی محنت سے جو بن پڑے پیدا کر لیتے ہیں، اس سے جیا جا سکے تو ٹھیک و گرنہ قحط، بیماری اور بے بسی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ نہ اسکول، نہ ہسپتال اور نہ اور کوئی سہولت، زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔ واسطہ پڑتا ہے تو سردار، ٹکری اور معتبر سے اور بالعموم یہ تینوں معززین اپنا بھلا پہلے سوچتے ہیں اور غریب برادری کا بعد میں۔ سرداری نظام ڈھیلا پڑنے کے باوجود قائم ہے۔ ہر خاندان کا ایک بڑا ہوتا ہے جسے عام طور پر،، معتبر،، کہتے ہیں۔ قبیلے کی ہر شاخ ٹکر کہلاتی ہے جس کا سربراہ،، ٹکری،، ہوتا ہے اور سارے قبیلے کا سردار تو ماشاءاللہ قوم کا راج دلارا ہوتا ہے۔

روائتی طور پر یہی وڈیرے قیادت فراہم کرتے ہیں، ووٹ انہیں کے ہیں، رائے ان کی ہے، باندھنا چھوڑنا انہی کے بس میں ہے۔ اسمبلیوں میں بڑے سرداروں کی اجارہ داری ہے تو بلدیاتی ادارے معتبرین کی دستبرد میں رہتے ہیں، بالعموم وہی کامیاب ہوتے ہیں جنہیں اس علاقے کے سرداروں کی بھرپور حمائت حاصل ہو۔ ہر سطح پر اقتدار غالب طبقے کے پاس گروی رہتا ہے جو اسے اپنے مفاد میں برتتا ہے۔ امریکا کے عظیم صدر ابراہام لنکن نے جمہوریت کو ایسا طرزِ حکومت قرار دیا تھا جس سے لوگ خود اپنے مفاد میں اپنے اوپر راج کرتے ہیں۔ جہاں جہاں سرداری اور قبائلی نظام ابھی چل رہا ہے وہاں انتخابات ہوں نہ ہوں، سردار وڈیرے اور معتبر اپنے مفاد میں عوام پر حکومت کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سرکار بڑے منصوبوں پر زر کثیر خرچ کر رہی ہے تو انہیں اپنی حالتِ زار کا خیال ستانے لگتا ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں کہ سرکار اتنی مالدار ہے تو ہمارا خیال کیوں نہیں رکھتی۔

ان کی یہ سوچ غیر روایتی بھی نہیں، انگریز کے زمانے سے یہی دستور چلا آیا ہے، سرکاری عملداری میں یہ شریک رہے ہیں۔ باقاعدہ درجہ بندی کے تحت باقاعدہ سرداروں اور ٹکریوں کے وظائف مقرر تھے، انہیں مخصوص مراعات حاصل تھیں۔ وفاداری بشرطِ استواری پر انعامات و کرامات ملا کرتے تھے۔ ان کے علاقے میں ترقیاتی کام تک ان کے مشورے اور رضامندی سے ہوا کرتے تھے۔ وہاں کس کو کیا ملنا ہے، ان کی مشاورت سے طے ہوتا تھا۔ اس کے عوض وہ اپنے علاقے کا پورا ذمہ لیتے تھے کہ وہاں سرکار مخالف کسی قسم کی کوئی کاروائی نہیں ہوگی۔ یہ نظام آزادی کے بعد بھی چلتا رہا مگر اس کی چولیں ڈھیلی ہوتی گئیں۔ بڑی وجہ طاقت کے توازن میں بگاڑ تھا۔ قبائلی انتظامی ڈھانچہ کا بنیادی اصول سادہ اور واضح تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ یا ڈپٹی کمشنر ضلع میں حکومت کا نمائندہ ہوتا تھا۔ وہ باہر سے آتا تھا، اس کیلئے غیر جانبدار ہونا لازم تھا۔ لوگوں کے درمیان نہ اسے صرف انصاف کرنا ہوتا تھا بلکہ بڑے سے بڑے جابر مجرم کو بھی کٹہرے میں کھڑا کرنا ضروری تھا تاکہ قانون کے بالاتر ہونے پر کسی کو شک و شبہ نہ رہے، یہ تبھی ممکن تھا جب اسے نہ صرف اختیارات حاصل ہوں بلکہ جائز سرکاری احکامات کو نافذ کرنے کی طاقت بھی حاصل ہو، اسی لئے سکاؤٹ، لیویز اور پولیس اس کے حکم کے تابع تھے۔ کسی سردار میں اس کے مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ خفیہ فنڈ اس کے علاوہ تھے، ان کے دانشمندانہ استعمال سے بڑے

سے بڑے کام نکلتے تھے۔ ہوتے ہوتے وسائل کی فراہمی کم ہوتی گئی، اسکاؤٹ اور پولیس آزاد ہوتی گئی، سردار وزارتوں میں پہنچے تو ان کا قد آسمانوں کو چھونے لگا، جن مراعات کے وہ محتاج ہوا کرتے تھے وہ ان کو اپنے ہاتھوں خیرات کی طرح بانٹنے لگے، رہی سہی کسر بھٹو کے دور میں نکل گئی ، سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان ہوا، وظائف بند ہو گئے اور سرکار نے یوں انہیں ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا۔

اصلاحات کا ایک نیا ریلا آیا جو ڈپٹی کمشنر کے ادارے کو ہی بہالے گیا۔ اب ضلع کی سطح پر سرکار کا کوئی نمائندہ نہیں جو بگڑتے حالات کو سنبھالا دینے کا پابند بھی ہو اور اہل بھی، انتظامی خلاء پیدا ہو گیا ہے جس نے سماجی پسماندگی کے شکار علاقوں میں بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ ان علاقوں میں جو کچھ ڈپٹی کمشنر یا پولیٹیکل ایجنٹ کرتے تھے اب وہ اسلام آباد میں نورتن کر رہے ہیں۔ ہماری موجودہ حکومت نے سارے ملک کو امریکا کے حوالے کر دیا ہے بالکل اسی طرح جیسے سردار پاکستان بننے سے پہلے غیر ملکی آقاؤں کی خدمات بجالاتے تھے یا کچھ سال پہلے ہمارے حکمران ان علاقوں پر سرداروں سے جو کام لیتے تھے۔ پہلے ڈپٹی کمشنروں کو خفیہ فنڈ دیئے جاتے تھے اب امریکا اپنے مفادات کی تعمیل میں کیری لوگر بل کی مد میں رقم فراہم کرتا ہے اور اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو ہم اس کے عوض ملک میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیکر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات پاکستانی عوام کی سلامتی اور خوشحالی کی بجائے اب اس پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے کہ سپریم کورٹ کے احکامات کا کس طرح مذاق اڑایا جائے یا پاکستانی آئین کی رو سے کس طرح ایسا استثنیٰ حاصل کیا جائے کہ لوٹی ہوئی ملکی دولت کو نہ صرف محفوظ بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا جا سکے۔

پچھلے دنوں چغہ پوش مسخرہ کرزئی نے اعلانیہ طور پر بھارت کو اپنا سب سے بڑا دوست کہہ کر اپنی غلامانہ اوقات یاد دلائی ہے۔ اس وقت امریکا بشمول اپنے اتحادیوں طالبان کے خلاف ایک بہت بڑی سازش میں مصروف ہے کہ بیرونی افواج کے جانے کے بعد طالبان کو ہر قیمت پر اقتدار سے باہر رکھا جائے جس میں ہمارے موجودہ حکمران بھی پوری طرح شامل ہو گئے ہیں۔ پاکستان کے ذریعے حکمت یار اور ملا برادر کو طالبان سے الگ کرنے کی کوششیں جاری ہیں ۔ گزشتہ ماہ اسی سلسلے میں مالدیپ میں ایک خفیہ میٹنگ کا اہتمام کیا گیا جس میں حکمت یار کے داماد ڈاکٹر غیرت بہیر، حامد کرزئی کا بھائی، ملا برادران اور خود امریکی گماشتے شامل تھے۔ اس میٹنگ کا مقصد یہ تھا کہ کسی بھی طور طالبان کو تقسیم کیا جائے یا دھونس یا دھاندلی کے ذریعے طالبان کو اپنی شرائط پر بات چیت کیلئے رضامند کیا جائے۔ یہ ایک ایسا خطرناک کھیل ہے جس سے پاکستان کی سلامتی کو داؤ پر لگا دیا گیا ہے اور لاہور کے دھماکے اس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں۔

قانون بیچارہ تو ہر جگہ یتیم اور مسکین بنا دیا گیا ہے۔ لیاری جو کراچی کا جگر ہے مختلف مافیا کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ پنجاب میں وزیر اعلیٰ کو نازوں پلی پولیس سے شکوہ ہے کہ عوام میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کی بجائے چھترول سے ساری اصلاحات کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ ہم گھپ اندھیری رات کے وہ مسافر ہیں جو صحرا میں راستہ بھول گئے ہیں۔ بے سمت چلے جا رہے ہیں، منزل کہاں ہے کچھ معلوم نہیں۔ نہیں جانتے کس ٹوکری میں کتنے انڈے رکھنا ہیں؟ کیا سب کچھ ان گنے چنے ہاتھوں ہاتھوں میں رہنا ہے یا محروم طبقوں کو شریک نعمت کرنا ہے؟ کب تک قوم اسی طرح بھٹکتی رہے گی اور منزل سے دور ہوتی چلی جائے گی؟

رہے نام میرے رب کا جو اپنے مجبور و مقہور بندوں کی فریاد سنتا ہے!

بروز ہفتہ 4 ربیع الثانی 1431ھ 20 مارچ 2010ء

وارثانِ قلم و قرطاس

کاش ریاست ہائے متحدہ امریکا کا شہنشاہِ عالی مقام جان پاتا کہ ہم نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں صرف اپنی زمین، اپنی فضائیں اور اپنے پانی ہی نذر نہیں کئے، ہماری وفاکشی واطاعت گزاری کا اصل پہلو یہ ہے کہ ہمارے نومولود فقیہ، اہل قلم اور ارباب دانش نے بھی اپنا سب کچھ ہدیہ جاناں کر دیا ہے اور امریکی مہم کے بے ننگ ونام خاکے میں ایسے ایسے دلائل کی میناکاری کر رہے ہیں کہ خود دانش بھی انگشت بدنداں ہے اور قلم کی آنکھیں بھی اپنی کم نصیبی پر اشکبار ہیں کہ ہمارے مقدر میں کیسے ہاتھوں کی چاکری لکھ دی گئی ہے۔ وہ کہ جن کے ذہنوں میں سرِ شام کنکھورے رینگنے لگتے ہیں، جن کے افکار میں رات بھر چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں، جن کے دلوں میں چھچھوندروں نے گھر بنا رکھے ہیں اور جن کی روح میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے ہیں، وہ بھی سحر دم مروان صفا کی طرح سفیلہ ارشاد پر بیٹھ کر وعظ و تلقین کی پوٹلیاں کھول لیتے ہیں۔

ایک ایسے ہی افلاطونی قلمکار کے قلم اور سیاسی فقیہ نے تازہ ابکائی کی ہے کہ "کروسیڈ" کے وہ معنی ہیں جو پاکستان کے احمق لوگ سمجھ رہے ہیں۔ کاش! قصر سفید سے رخصت ہونے والے فرعون جارج بش کو خبر ہوتی کہ پاکستان نامی ملک میں انگریزی ادب کے کیسے کیسے ماہر، شارح اور مفسر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ ان سے رجوع کر لیتا تو اسے ،، کروسیڈ ،، کا لفظ واپس لینے کی ضرورت پیش نہ آتی اور وہ اپنے ہونٹوں پر مخصوص رعونت آمیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہہ دیتا کہ ،، کم سمجھ لوگو! تمہیں کروسیڈ کا مطلب ہی نہیں آتا۔ "اسی بش نے ٹیلیویژن پر اسامہ بن لادن کے بارے میں کہے گئے جملے "ہم اسے پکڑ کر رہیں گے، زندہ یا مردہ" پر بھی معذرت کر لی تھی، حالانکہ اندازِ سخن زیادہ شائستہ نہیں تھا" میں جونہی گھر پہنچا، میری بیوی لارا نے بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا" بش کو کیا معلوم کہ اب بھی ارضِ پاکستان میں ایسے صاحبانِ قلم و قرطاس بھی بستے ہیں جن کے دلوں میں اس کیلئے "لارا" سے بھی زیادہ محبت و فریفتگی پائی جاتی ہے۔ اگر بش کو خبر ہوتی کہ کرۂ ارض کے اس حصے میں ایسی ایسی "کونڈالیزا رائسیس" موجود ہیں تو وہ الفاظ واپس لینے کی رسوائی سے تو بچ جاتا۔

تازہ ارشاد یہ ہے کہ " عراق میں تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہ ملنے کا اعلان دراصل امریکی چہرے کا روشن تریں رخ ہے اور اس رخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں نہ جھوٹ کا رواج ہے نہ منافقت کا ،، خوئے غلامی کا سب سے ہولناک پہلو یہی ہے کہ وہ ہر قطرۂ خوں میں گھر کر لیتی اور عشق کا ایسا رنگ اختیار کر لیتی ہے کہ محبوب کا چیچک زدہ چہرہ بھی چودھویں کے چاند جیسا روشن، اس کی یرقان زدہ آنکھیں بھی مئے کے چھلکتے پیمانے اور اس کے سوکھے سڑے ہونٹ بھی گلاب کی پنکھڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ امریکی چوکھٹ پر سجدہ ریز ان نور تنوں کو کون بتائے کہ امریکا اتنا معصوم نہیں۔ اسے بہت پہلے سے معلوم تھا کہ عراق کے پاس ایسا کوئی ہلاکت آفریں ہتھیار موجود نہیں۔ ایک ہزار جاسوس بھیجنے اور ڈیڑھ کھرب ڈالر پھونکنے سے قبل بھی وہ جانتا تھا کہ اسے کس روز کوئی سا اعلان کر کے اپنے عشاق کو اپنے چہرے کے روشن عارض ورخسار دکھانے ہیں۔ پچھلے ساٹھ ستر سالوں کی تاریخ پر ہی نظر ڈال لی جائے تو امریکا دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے، منافق اور سب سے مکروہ ملک کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو ہر آن جمہوریت، انسانیت اور انسانی

حقوق کے معنی تبدیل کر تا رہتا ہے۔ ابو غریب جیل سے گوانتاناموبے تک،، شرفِ انسانیت،، کی نئی تاریخ رقم کرنے والے عفریت کو ایسی سندِ فضیلت تو امریکا یا برطانیہ کی کسی دانش گاہ سے بھی نہیں ملیں۔ اقبال نے کیا الہامی بات کہی تھی:

ترے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی

یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو

کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

شکاری کا کام تو شکار کرنا ہی ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود شکار کے دل میں بھی تیر کھانے کی آرزو انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اپنی تاریخ و روایات کو "نسیم حجازیت" کا نام دیکر "نشانہ تمسخر" بنانا اور مکروہ ترین نامہ اعمال رکھنے والوں کے گلے میں ہار ڈالنا، مری ہوئی قوموں کے مرے ہوئے دانشوروں کا شیوہ رہا ہے۔

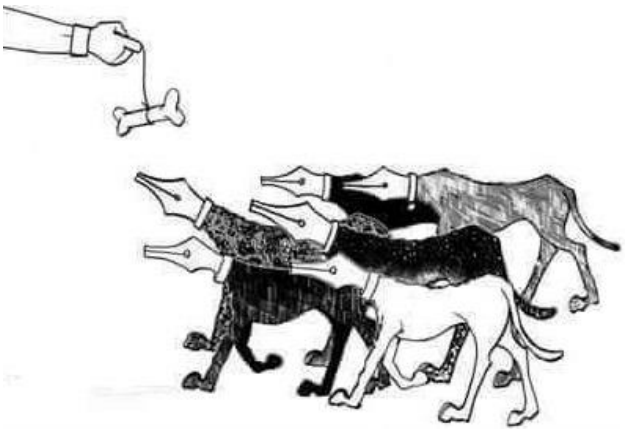

فرماتے ہیں کہ "دور اوّل کے مسلماں ظلم و ستم سہتے رہے لیکن اف تک نہ کی، وہ تیاری کرتے رہے اور پھر 313 جانباز پہلے معرکے کیلئے میدان بدر میں اترے،، یہ تاریخ سے بے خبری ہے۔ 313 جانباز کسی جنگ کیلئے نہیں، ابوسفیان کے تجارتی قافلے کا راستہ روکنے نکلے تھے، پھر انہیں قریش مکہ کے ایک آراستہ پیراستہ لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دشمن کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں ہر ایک کے پاس ساز و سامان جنگ کی فراوانی تھی۔ یہ 313 تھے جن میں سے 70 کے پاس اونٹ تھے اور دو کے پاس گھوڑے اور جن کے ہاتھوں میں تیز دھار تلواریں بھی نہ تھیں۔ جانبازوں کی اس سپاہ کو سیاہ رنگ پرچم کیلئے حضرت عائشہ صدیقہ کی چادر استعمال کرنا پڑی۔ تب ان کی صفوں میں زمینی حقائق اور عسکری قوت کے اسرار و رموز سمجھانے والا کوئی عالی دماغ نہ تھا جو نعرہ لگاتا کہ،، پہلے تیار کرو" 313 میں سے کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ جب تک ہم ایک ہزار نہیں ہو جاتے، جب تک ہمارے پاس طرار گھوڑے، طرحدار اونٹ اور آبدار تلواریں نہیں آجاتیں، ہمیں مزاحمت نہیں کرنی چاہئے اور ابوجہل کے سامنے سر جھکا دینا چاہئے۔

کوئی نہیں کہتا امریکا سے ٹکرا جاؤ لیکن خدا کیلئے ایسی دلیلیں نہ تراشو جس سے گھن آتی ہے اور ایسے بیمار فلسفے کا پرچار نہ کرو جس کی بساندھ سے متلی آنے لگتی ہے۔،، تیاری،، ضرور کرو لیکن جب آنے والے پچاس برسوں میں تمہاری تیاری مکمل ہو گی تو کیا امریکا کی تیاریوں کا پہیہ جام رہے گا؟ کیا وہ بھی

پچاس سال لمبی جست نہیں لگائے گا؟ان فکری بالشتیوں اور سامراجی فقیہوں کو کون سمجھائے کہ اس نوع کی،، تیاری،، کی نہیں، غیرت و حمیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ جوہر موجود ہو تو وہ اپنی پرانی بندوقوں، اپنی زنگ آلود تلواروں، اپنی لاٹھیوں، اپنے ناخنوں، اپنے دانتوں اور اپنی جانوں کے بل پر جنگ آزما ہوتے ہیں اور اگر یہ جوہر مر چکا ہو تو ان کے ایٹم بم بھی ان کی مردہ رگوں میں مزاحمت کی چنگاری نہیں سلگا سکتے، نہ ان کے صاحبانِ دانش اور وارثانِ قلم و قرطاس پر کپکپی کا مداوا کر سکتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جو سینوں کے راز سے بھی واقف ہے!

خوابوں کو بیکار نہ سمجھو
لفظوں کو دیوار نہ جانو
آنے والے سارے لمحے
سارے دن اور سارا سال
ہر موجودہ ساعت میں
کس نے بھلا کب دیکھے ہیں
خواب مگر دکھلاتے ہیں
لفظ مگر سمجھاتے ہیں
آؤ استقبال کریں
آنے والے دن کی خاطر
سکھ اپنا برباد کریں
ممکن ہوتی تعبیروں سے
خوابوں کو ہمراز کریں
دکھ سے ہاتھ ملائیں ہم
ورنہ کل کی حیرت میں
کون ہمیں پھر جانے گا
گردش تو یہ دائم ہے
اس کے لرزاں رستے پر
آج کے زندہ رکھنے کو
خواب ہی تو اک طاقت ہے!

بروز سوموار 6 ربیع الثانی 1431ھ 22 مارچ 2010ء

وسیع تر قومی مفاد

پہلا منظر ملاحظہ کیجئے!

یہ 16 دسمبر 1971ء کا بڑا ہی تکلیف دہ دن ہے، صبح کا وقت ہے، سورج ڈھاکہ ایئرپورٹ کی شکستہ دیواروں سے اوپر اٹھ رہا ہے، ہوائی اڈے پر تباہی کا عالم ہے، ٹوٹے ہوئے رن وے پر چند فوجی کھڑے ہیں، آسمان پر ایک نقطہ ابھرتا ہے، یہ نقطہ پھیلتا پھیلتا ہیلی کاپٹر کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ہیلی کاپٹر ایئرپورٹ کا ایک چکر کاٹتا ہوا رن وے کے ایک محفوظ کونے پر آہستہ سے اتر جاتا ہے۔ پنکھے کی ہوا سے فوجی وردیاں پھڑ پھڑاتی ہیں، دروازہ کھلتا ہے، بھارتی فوجی وردی میں ملبوس ایک سکھ جرنیل باہر نکلتا ہے۔ رن وے پر کھڑا پاکستانی جرنیل آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہے، دونوں ایک اعلیٰ لگژری کار کی طرف بڑھتے ہیں جہاں کار کے پچھلے دونوں دروازے کھول کر کھڑے چاک وچوبند فوجی منتظر ہیں۔ فوجی بوٹوں کی دھمک کے ساتھ مشینی انداز میں سلیوٹ کے ساتھ جرنیلوں کو بیٹھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ کار رن وے پر دوڑتی ہے اور دوڑتے دوڑتے گرد وغبار میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کار میں بھارت کی فاتح فوج کا جرنیل جگجیت سنگھ اروڑا اور پاکستانی فوج کا مفتوحہ جرنیل امیر عبداللہ خان نیازی عرف ٹائیگر نیازی سوار ہیں۔

اب دوسرا منظر ملاحظہ کیجئے!

صبح کے نو بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ ڈھاکہ ریس کورس گراؤنڈ کے درمیان میں لکڑی کی ایک سادہ سی میز پڑی ہے اور میز کے گرد صرف دو کرسیاں دھری ہیں۔ گراؤنڈ میں ہزاروں بنگالی جمع ہیں، بنگالیوں کے آگے پیچھے بھارتی فوج کے سینکڑوں جوان کھڑے ہیں۔ کار گراؤنڈ میں داخل ہوتی ہے، عین میز کے سامنے کار رکتی ہے، دو جوان آگے بڑھ کر دروازے کھولتے ہیں، دونوں جرنیل باہر نکلتے ہیں، جونہی سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں تو دونوں کے سٹاف آفیسرز ان کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں، میز پر ایک فائل رکھی جاتی ہے، دونوں جنرل باری باری اس فائل کے کھلے صفحے کی تحریر کے آخر پر آمنے سامنے دستخط کرتے ہیں۔ جنرل نیازی کھڑے ہوتے ہیں، ہولسٹر سے اپنا پستول نکالتے ہیں خالی کرتے ہیں اور گولیاں اور پستول جنرل اروڑا کے حوالے کرتے ہیں۔ بھارتی فوج کا ایک جوان آگے بڑھتا ہے اور جنرل نیازی کے سینے پر لگے سارے تمغے اور کندھوں پر جملے رینکس اتار لیتا ہے۔ جنرل نیازی تھکے قدموں کے ساتھ اپنی جیپ کی طرف بڑھتے ہیں، گراؤنڈ میں ہزاروں بنگالی ان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں، وہ چہرہ چھپاتے ہوئے تیزی کے ساتھ جیپ میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔ بھارتی جوان ٹائیگر نیازی کی جیپ کو اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ فلم ختم ہو جاتی ہے۔

یہ فلم بھارتی ٹیلیویژن نے سینکڑوں مرتبہ اسی طرح دکھائی جس طرح آج کل ہمارا ایک ٹیلیویژن چینل پاک بھارت کے درمیان دوستی "آشا اور امن" کی تلاش کیلئے چلا رہا ہے۔ پاکستان میں ایسے صرف دو مواقع آئے، ایک موقع 16 دسمبر کی شام کو آیا جس کے ساتھ یہ خبر نشر ہوئی "دو مقامی جرنیلوں نے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا اور دوسری بار یہ فلم بھٹو نے 20 دسمبر 1971ء کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حلف اٹھانے کے بعد چلوائی لیکن آرمی اور عوام کی طرف سے اتنا شدید ردعمل آیا کہ اس پر تاحیات پابندی لگا دی گئی۔

اب تیسرا منظر بھی ملاحظہ کیجئے!

20 دسمبر 1971ء کو یحییٰ خان کے چیف آف سٹاف لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید نیشنل ڈیفنس کالج میں داخل ہوتے ہیں۔ جونیئر آفیسرز انہیں دیکھتے ہیں غصے سے بے قابو ہو جاتے ہیں، ان کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا ہو، انہیں گالیاں دی جاتی ہیں اور وہ بے بسی کے ساتھ ان جونیئر آفیسرز کو دیکھتے ہیں اور چپ چاپ ہال سے باہر نکل جاتے ہیں۔

اب چوتھا منظر ملاحظہ کیجئے!

دس اپریل 1974ء کو ٹائیگر نیازی بھارت کی قید سے چھوٹتے ہیں، واہگہ سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور چند روز بعد وہ افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف سے شکوہ کرتے ہیں کہ "میں فوج کا لیفٹیننٹ جنرل ہوں، میری گاڑی پر پاکستانی جھنڈا نہیں لگایا جاتا، یہ رولز کی خلاف ورزی ہے"!

اب پانچواں منظر ملاحظہ کیجئے!

نو اگست 1980ء کو آغا محمد یحییٰ خان کا تابوت باہر نکلتا ہے، تابوت پر پاکستانی جھنڈا لپٹا ہے، جنازہ ہوتا ہے، تابوت کو سلامی دی جاتی ہے، بینڈ بجتا ہے اور پورے فوجی اعزازات کے ساتھ انہیں دفن کر دیا جاتا ہے!

اب چھٹا منظر ملاحظہ کیجئے!

بھٹو صاحب تمام سیاسی جماعتوں کو ساتھ ملا کر ملک کا ایک آئین بناتے ہیں جس میں خود ہی اپنے اقتدار اور اختیارات کو دوام دینے کیلئے کچھ آئینی ترامیم بھی منظور کروا لیتے ہیں۔ پوری تحقیق اور تسلی کے بعد چھٹے نمبر کے جونیئر جرنیل ضیاء الحق کو فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کرتے ہیں اور اسی اسمبلی کے فلور پر بڑے تیقن کے ساتھ پاکستان میں فوجی مارشل لاء کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کرنے کا اعلان کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اسی جرنیل کے ہاتھوں نہ صرف اقتدار سے فارغ کر دیئے جاتے ہیں بلکہ پھانسی کے تختے پر جھول جاتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں سرخ ریچھ ہمارے پڑوسی ملک افغانستان پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس کو اپنی طاقت کا اس قدر گھمنڈ ہوتا ہے کہ وہ گرم پانیوں تک رسائی کو چند دنوں کا کھیل سمجھتا تھا لیکن دنیا کی اس سپر طاقت کو اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی اور اسی ملک سے دنیا کی چھ نئی مسلم ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں۔ جنرل ضیاء الحق جو اس خطے میں ایک نئے اور انتہائی مضبوط اسلامی بلاک کا خواب دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کا طیارہ فضا میں تباہ کر دیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ملک کے کئی جنرل موت کی آغوش میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔

ساتواں منظر ملاحظہ کیجئے!

پاکستان میں یکے بعد دیگرے دو سیاسی جماعتوں کی حکومتیں قائم ہوتی ہیں لیکن کوئی بھی اپنی آئینی مدت پوری نہیں کر پاتی۔ ملک کی سیاسی جماعت مسلم لیگ (ن) جو دو تہائی اکثریت کے ساتھ ملک میں حکومت کر رہی ہوتی ہے کہ اچانک ایک دفعہ پھر ایک فوجی کمانڈو جنرل پرویز مشرف اور اس کے ساتھی منتخب حکومت کو معزول کر دیتے ہیں اور منتخب حکمرانوں کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے اور گیارہ سال اس ملک کے نہ صرف تمام اداروں کو تباہ برباد کر دیتا ہے بلکہ اپنے ناجائز اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے ملک کی خود مختاری کو بھی امریکا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ اس ملک کے ہزاروں بیٹوں اور بیٹیوں کو ڈالروں کے عوض امریکا کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے اور بالآخر اقتدار کی غلام گردشوں کا شکار ہو کر آخری گارڈ آف آنر کے بعد ملک سے رخصت ہو جاتا ہے اور اس ملک کو ان کے حوالے کر دیتا ہے جن کے خلاف ملک کی اعلیٰ عدالت میں کرپشن کے کئی مقدمات زیرِ سماعت ہیں۔

اب آخری آٹھواں منظر ملاحظہ کیجئے !

میں اپنے چھوٹے بیٹے کے سامنے دنیا کا نقشہ بچھائے بیٹھا ہوں۔ میں پانیوں میں گھرے ایک جزیرے کے ارد گرد پنسل پھیرتا ہوں، پنسل گھماتا ہوا کراچی کے ساحل پر لا کر کہتا ہوں "بنگلہ دیش چالیس سال پہلے پاکستان کا حصہ تھا، پاکستان شروع ہی یہاں سے ہوتا تھا،، میرے پوتے کی آنکھوں میں حیرت امڈ آتی ہے اور نہائت معصومیت سے پوچھتا ہے، "لیکن وہ اب پاکستان کا حصہ کیوں نہیں ہے "میں بتاتا ہوں "یہ ملک اس وقت چند ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو اس نعمت کے قابل نہیں تھے، انہوں نے ملک توڑ دیا" وہ تھوڑی دیر سوچتا ہے اور پھر پوچھتا ہے "کیا ان لوگوں کو کوئی سزا دی گئی ؟" میں اپنے پوتے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں، میں اس کے کانوں پر جھکتا ہوں اور اسے پیار سے کہتا ہوں "نہیں بیٹا، وسیع تر قومی مفاد نے ہمارے ہاتھ روک لئے تھے "میرا پوتا میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہوں، میں جانتا ہوں میں اس کے مزید سوالوں کا جواب نہیں دے سکوں گا لیکن یہ منظر یہ آٹھواں منظر میرے حافظے سے چپک کر رہ جاتا ہے اور میں بار بار سوچتا ہوں یہ ہاتھ اس بچے کے منہ پر کب تک رہے گا، جب اس کے بازوؤں میں طاقت آجائے گی، جب یہ بڑی آسانی سے میرا ہاتھ جھٹک دے گا، جب اس کے سارے سوال بول پڑیں گے تو اس وقت میرا ردعمل کیا ہو گا، اس وقت میں کہاں جاؤں گا، اس وقت میرے پاس کیا جواب ہو گا۔

میں سوچتا ہوں کاش! اس بچے کے بڑے ہونے سے پہلے میں دنیا کے سارے نقشے جلا سکوں، میں تاریخ کی ساری کتابیں دریا برد کر سکوں، میں وقت کو، تاریخ کو، حالات کو اور ساری حقیقتوں کو نئے نام، نئے لفظ دے سکوں، میں شکست کو فتح میں تبدیل کر سکوں، میں اپنی بزدلی، اپنی خاموشی کو نظریئے کی شکل دے سکوں، میں اپنے آپ کو مطمئن کر سکوں، کاش اے کاش!

رہے نام میرے رب کا جس نے حق و باطل کی واضح تفریق کھول کھول کر بتا دی ہے!

بہت اداس تھا منظر چراغ بجھنے کا
لپٹ کے رو دیا، میں بھی ہوا کے جھونکے سے

بروز بدھ 8 ربیع الثانی 1431ھ 24 مارچ 2010ء

ہوئے بے توفیق فقیہانِ حرم!

کاش ریاست ہائے متحدہ امریکا کا شہنشاہِ عالی مقام جان پاتا کہ ہم نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں صرف اپنی زمین، اپنی فضائیں اور اپنے پانی ہی نذر نہیں کئے، ہماری وفاکشی واطاعت گزاری کا اصل پہلو یہ ہے کہ ہمارے نومولود فقیہ، اہل قلم اور ارباب دانش نے بھی اپنا سب کچھ ہدیہ جاناں کر دیا ہے اور امریکی مہم کے بے ننگ ونام خاکے میں ایسے ایسے دلائل کی میناکاری کر رہے ہیں کہ خود دانش بھی انگشت بدنداں ہے اور قلم کی آنکھیں بھی اپنی کم نصیبی پر اشکبار ہیں کہ ہمارے مقدر میں کیسے ہاتھوں کی چاکری لکھ دی گئی ہے۔ وہ کہ جن کے ذہنوں میں سرِ شام کنکھورے رینگنے لگتے ہیں، جن کے افکار میں رات بھر چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں، جن کے دلوں میں چھچھوندروں نے گھر بنا رکھے ہیں اور جن کی روح میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے ہیں، وہ بھی سحر دم مروان صفا کی طرح سفیلہ ارشاد پر بیٹھ کر وعظ و تلقین کی پوٹلیاں کھول لیتے ہیں۔

ایک ایسے ہی افلاطونی قلمکار کے قلم اور سیاسی فقیہ نے تازہ ابکائی کی ہے کہ "کروسیڈ" کے وہ معنی ہیں جو پاکستان کے احمق لوگ سمجھ رہے ہیں۔ کاش! قصر سفید سے رخصت ہونے والے فرعون جارج بش کو خبر ہوتی کہ پاکستان نامی ملک میں انگریزی ادب کے کیسے کیسے ماہر، شارح اور مفسر بیٹھے اگر وہ ان سے رجوع کر لیتا تو اسے "کروسیڈ" کا لفظ واپس لینے کی ضرورت پیش نہ آتی اور وہ اپنے ہونٹوں پر مخصوص رعونت آمیز ہوئے ہیں۔ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہہ دیتا کہ "کم سمجھ لوگو! تمہیں کروسیڈ کا مطلب ہی نہیں آتا۔" اسی بش نے ٹیلیویژن پر اسامہ بن لادن کے بارے میں کہے گئے جملے "ہم اسے پکڑ کر رہیں گے، زندہ یا مردہ" پر بھی معذرت کر لی تھی، حالانکہ اندازِ سخن زیادہ شائستہ نہیں تھا" میں جونہی گھر پہنچا، میری بیوی لارا نے بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا" بش کو کیا معلوم کہ اب بھی ارضِ پاکستان میں ایسے صاحبانِ قلم و قرطاس بھی بستے ہیں جن کے دلوں میں اس کیلئے "لارا" سے بھی زیادہ محبت و فریفتگی پائی جاتی ہے۔ اگر بش کو خبر ہوتی کہ کرۂ ارض کے اس حصے میں ایسی ایسی "کونڈالیز ارائسیس " موجود ہیں تو وہ الفاظ واپس لینے کی رسوائی سے تو بچ جاتا۔

تازہ ارشاد یہ ہے کہ،، عراق میں تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہ ملنے کا اعلان دراصل امریکی چہرے کا روشن تریں رخ ہے اور اس رخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں نہ جھوٹ کا رواج ہے نہ منافقت کا،، خوئے غلامی کا سب سے ہولناک پہلو یہی ہے کہ وہ ہر قطرۂ خوں میں گھر کر لیتی اور عشق کا ایسا رنگ اختیار کر لیتی ہے کہ محبوب کا چیچک زدہ چہرہ بھی چودھویں کے چاند جیسا روشن، اس کی یرقان زدہ آنکھیں بھی مئے کے چھلکتے پیمانے اور اس کے سوکھے سڑے ہونٹ بھی گلاب کی پنکھڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ امریکی چوکھٹ پر سجدہ ریز ان نورتنوں کو کون بتائے کہ امریکا اتنا معصوم نہیں۔ اسے بہت پہلے سے معلوم تھا کہ عراق کے پاس ایسا کوئی ہلاکت آفریں ہتھیار موجود نہیں۔ ایک ہزار جاسوس بھیجنے اور ڈیڑھ کھرب ڈالر پھونکنے سے قبل بھی وہ جانتا تھا کہ اسے کس روز کوئی سا اعلان کر کے اپنے عشاق کو اپنے چہرے کے روشن عارض ورخسار دکھانے ہیں۔ پچھلے ساٹھ ستر سالوں کی تاریخ پر ہی نظر ڈال لی جائے تو امریکا دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے، منافق اور سب سے مکروہ ملک کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو ہر آن جمہوریت، انسانیت اور انسانی

حقوق کے معنی تبدیل کر تا رہتا ہے۔ ابو غریب جیل سے گوانتاناموبے تک،، شرفِ انسانیت،، کی نئی تاریخ رقم کرنے والے عفریت کو ایسی سندِ فضیلت تو امریکا یا برطانیہ کی کسی دانش گاہ سے بھی نہیں ملیں۔ اقبال نے کیا الہامی بات کہی تھی:

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی

یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو

کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

شکاری کا کام تو شکار کرنا ہی ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود شکار کے دل میں بھی تیر کھانے کی آرزو انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اپنی تاریخ و روایات کو "نسیم حجازیت" کا نام دیکر "نشانہ تمسخر" بنانا اور مکروہ ترین نامہ اعمال رکھنے والوں کے گلے میں ہار ڈالنا، مری ہوئی قوموں کے مرے ہوئے دانشوروں کا شیوہ رہا ہے۔

فرماتے ہیں کہ "دور اوّل کے مسلماں ظلم و ستم سہتے رہے لیکن اف تک نہ کی، وہ تیاری کرتے رہے اور پھر 313 جانباز پہلے معرکے کیلئے میدان بدر میں اترے،، یہ تاریخ سے بے خبری ہے۔ 313 جانباز کسی جنگ کیلئے نہیں، ابوسفیان کے تجارتی قافلے کا راستہ روکنے نکلے تھے، پھر انہیں قریش مکہ کے ایک آراستہ پیراستہ لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دشمن کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں ہر ایک کے پاس ساز و سامان جنگ کی فراوانی تھی۔ یہ 313 تھے جن میں سے 70 کے پاس اونٹ تھے اور دو کے پاس گھوڑے اور جن کے ہاتھوں میں تیز دھار تلواریں بھی نہ تھیں۔ جانبازوں کی اس سپاہ کو سیاہ رنگ پرچم کیلئے حضرت عائشہ صدیقہ کی چادر استعمال کرنا پڑی۔ تب ان کی صفوں میں زمینی حقائق اور عسکری قوت کے اسرار و رموز سمجھانے والا کوئی عالی دماغ نہ تھا جو نعرہ لگاتا کہ،، پہلے تیار کرو" 313 میں سے کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ جب تک ہم ایک ہزار نہیں ہو جاتے، جب تک ہمارے پاس طرار گھوڑے، طرحدار اونٹ اور آبدار تلواریں نہیں آجاتیں، ہمیں مزاحمت نہیں کرنی چاہئے اور ابوجہل کے سامنے سر جھکا دینا چاہئے۔

کوئی نہیں کہتا امریکا سے ٹکرا جاؤ لیکن خدا کیلئے ایسی دلیلیں نہ تراشو جس سے گھن آتی ہے اور ایسے بیمار فلسفے کا پرچار نہ کرو جس کی بساندھ سے متلی آنے لگتی ہے۔،، تیاری،، ضرور کرو لیکن جب آنے والے پچاس برسوں میں تمہاری تیاری مکمل ہو گی تو کیا امریکا کی تیاریوں کا پہیہ جام رہے گا؟ کیا وہ بھی پچاس سال لمبی جست نہیں لگائے گا؟ ان فکری بالشتیوں اور سامراجی فقیہوں کو کون سمجھائے کہ اس نوع کی "تیاری" کی نہیں، غیرت و حمیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ جوہر موجود ہو تو وہ اپنی پرانی بندوقوں، اپنی زنگ آلود تلواروں، اپنی لاٹھیوں، اپنے ناخنوں، اپنے دانتوں اور اپنی جانوں کے بل پر جنگ آزما ہوتے ہیں اور اگر یہ جوہر مر چکا ہو تو ان کے ایٹم بم بھی ان کی مردہ رگوں میں مزاحمت کی چنگاری نہیں سلگا سکتے، نہ ان کے صاحبانِ دانش اور وارثانِ قلم و قرطاس پر کپکپی کا مداوا کر سکتے ہیں۔

بروز جمعرات 2 ربیع الثانی 1431ھ 18 مارچ 2010ء

نفسیاتی روگ

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے غالب نے ایک عجیب اضطراب کے عالم میں اللہ کو پکارا تھا!

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے ؟

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

مسلمانوں نے بلادِ اسلامیہ ہند میں اپنے ہزار سالہ دورِ اقتدار میں جو بے مثال اسلامی کلچر پیدا کیا تھا غالب کی پیش بیں نگاہوں نے اس کے آثار کو مٹتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایسا شاندار کلچر دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مٹانے کی کوشاں قوتوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ کہ اس منفرد اسلامی کلچر کی نہ تو آج کی دنیا میں کوئی اور مثال موجود ہے اور نہ ہی آئندہ ہو گی، پھر بھی وہ اسے حرفِ غلط کی طرح مٹاڈالنے میں سرگرم عمل تھیں۔ جارحانہ ہندو احیاء کی علمبردار یہ قوتیں اپنے احساسِ کمتری کے باعث اس کلچر کے نام ونشاں تک کو مٹاڈالنے میں عافیت محسوس کرتی ہیں۔ وہ برصغیر کی مسلمان اقلیت سے کچھ اس درجہ خائف چلی آرہی ہیں کہ مسلمانوں کو تو فقط تعداد کے اعتبار سے اقلیت سمجھتی ہیں مگر خود کو نفسیاتی اقلیت کے روگ میں مبتلا پاتی ہیں۔ اس نفسیاتی روگ میں مبتلا ہندو اکثریت کے آزار سے بچنے اور اپنے منفرد اسلامی کلچر کی بقاء اور ترقی کی راہوں پر گامزن رہنے کی خاطر ہی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں جداگانہ مسلمان قومیت کا جدید تصور منکشف کرتے وقت اس حقیقت کی جانب بھی اشارہ کیا تھا کہ متحدہ ہندوستانی قومیت کا سرے سے کوئی وجود نہیں اس لئے کہ وہ مختلف اور متنوع تہذیبی گروہ جو صدیوں سے برطانوی ہند میں آباد ہیں اس روحانی یگانگت سے اب تک محروم چلے آرہے ہیں جس سے جدید معنوں میں قوم تشکیل پاتی ہے:

"It is however ،painful to observe that our attempts to discover such a principle of internal harmony have so far failed. Why have they failed? Perhaps we suspect each other،s intention and inwardly aim at dominating each other. Perhaps in the higher interest of mutual cooperation we cannot afford to part with the monopolies which circumstances have placed in our hands and conceal our egoism under the clock of nationalism outwardly as narrow-minded as a caste or a tribe. Perhaps we are unwilling to recognize that each group has a right to free development according to its own cultural tradition."

یہاں اقبال نے عدم یگانگت کے چار اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ اوّل یہ کہ برطانوی ہند میں آباد مختلف تہذیبی گروہ ایک دوسرے کی نیتوں پر شکوک میں مبتلا چلے آرہے ہیں۔ دوم یہ کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر غلبہ پانے میں کوشاں چلا آرہا ہے۔ سوم یہ کہ اتفاقاتِ زمانہ نے جن مخصوص مفادات کو اجارہ داریاں بخش رکھی ہیں وہ ان اجارہ داریوں سے محروم نہیں ہونا چاہتے اور اپنی ہوا وہوس کو ایک ایسے نام نہاد نیشلزم کے پردوں میں چھپانے کے خوگر ہیں جو ذات پات اور چھوت چھات کے نظام کی مانند ناروا داری، تنگ نظری اور تعصب سے عبارت ہے۔ چہارم یہ کہ ہم اپنے گروہ کے سوا

دوسرے گروہوں کو ان کی اپنی تہذیبی روایات کے مطابق زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق نہیں دینا چاہتے۔ اقبال اس صورتِ حال پر گہرے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ:

"Experience however has shown that the various caste-units and religious units in India have shown no inclination to sink their respective individualities in a larger whole. Each group is intensely jealous of its collective existence.

ذات پات اور چھوت چھات کی دیوتائی تقسیم پر مبنی طبقاتی اکائیوں کو تو اپنا الگ نسلی وجود قائم رکھنے کی مجبوری ہے مگر مختلف مذہبی اکائیاں بھی اپنا علیحدہ وجود قائم رکھنے پر مصر چلی آرہی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ سارے ہندوستانی تو درکنار خود ہندو اس روحانی یگانگت سے محروم ہیں جس سے عصرِ حاضر میں قومیت تشکیل پاتی ہے۔ اقبال کی نظر میں صرف ہندی مسلمان ہی ایک ایسی تہذیبی اکائی ہیں جن کے اتحاد کی بنیاد جغرافیائی اشتراک کی بجائے روحانی یگانگت پر قائم ہے چنانچہ ہندی مسلمان جدید معنوں میں ایک قوم ہیں۔ قوموں کے حقِ خود اختیاری کے تحت انہیں اپنی اکثریت کے علاقوں میں مسلمان قومی مملکتیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ مسلمانوں نے خود اختیاری کا یہ حق استعمال کرتے ہوئے پاکستان قائم کر لیا۔ بنگلہ دیش بھی اپنی جداگانہ اسلامی شناخت کا نگہبان ہے چنانچہ آج مسلم بنگال اور ہندو بنگال دو الگ الگ جغرافیائی اور تہذیبی اکائیاں ہیں۔ وہ ہندی مسلمان جنہوں نے جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور اپنا لیا تھا وہ بھارت میں اقلیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی صورتحال ابھی تک ویسی ہی المناک ہے جو قیامِ پاکستان سے پہلے تھی۔ یہاں میری مراد گزشتہ ساٹھ سال کی ہندو مسلم کشمکش اور تصادم کی صورتحال ہے۔ یہ کشمکش مذہبی منافرت سے پیدا ہوئی ہے اور آئے دن مذہبی فسادات کو جنم دیتی رہتی ہے۔

ہندو مسلم فسادات کے پس پردہ محرکات وہی ہیں جن کا ذکر اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں کیا تھا ان میں سے سب سے بڑا محرک ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی تمنا ہے۔ یادش بخیر، بابری مسجد کی تباہی کے باعث پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات کا تجزیہ کرتے وقت "ایم وی کاماتھ" نے "سٹارٹ آف اے نیو بگننگ"

کے عنوان سے اپنے مضمون الیسٹریڈ ویکلی آف انڈیا میں ہندو اکثریت پر مسلمان اقلیت کے غلبہ کے خوف کو مسجد کے انہدام اور فسادات کا اصل محرک بتایا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلمان عددی اقلیت ہیں جبکہ ہندو نفسیاتی اقلیت ہیں (روزنامہ نوائے وقت 25 دسمبر 1992ء) میں یہ مضمون من و عن شائع کر دیا گیا تھا۔ بابری مسجد منہدم کرنے والے ہندو جنونیوں کے وحشیانہ طرزِ عمل کا دفاع کرتے ہوئے اس مضمون کے مصنف لکھتے ہیں:

"The irony is that it is not the Muslim who is afraid but the Hindu with all the accumulated fears to the past .....The Hindu psyche demands that restitution be done to it. Though it is not expressed by that way .....There is such a thing as a psychological minority the existence of which is seldom recognized.....it would

be embarrassing to admit that one is afraid but the fact remains that both the numerical minority and the psychological minority live in fear of each other. Every time there is a report of conversion to Islam it touches a raw nerve.

گویا بھارت میں ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کے خوف میں مبتلا ہے۔ اس دائمی خوف نے اسے نفسیاتی اقلیت بنا کر رکھ دیا ہے اور وہ مارے خوف کے مسلمانوں کی تہذیبی ہستی کو مٹانے کی سعی مسلسل میں مبتلا چلی آرہی ہے۔ اس نفسیاتی بیماری کا تجزیہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی کتاب میں خوب کیا ہے ۔ بھارت کے ساتھ پاکستان کے تنازعات کے اصل سبب کو بے نقاب کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

"Muslims ruled the sub-continent for over 700 years and eventually succeeded in establishing their separate homeland. Unfortunately, the Indian mentality is troubled with historical complexes and the obsession of defeat. In order to go to the roots of Indo-Pakistan relations one must examine the nature of Indian nationalism.

بنگلہ دیشی وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد نے ایک اعلیٰ سطحی پارٹی میٹنگ میں اخبار نویسوں سے بات چیت میں فخریہ طور پر انکشاف کیا ہے کہ پاکستان توڑنے کا واضح اور جامع پلان، ان کے والد شیخ مجیب الرحمان المعروف،، بنگلہ بندھو،، نے بھارت سے حاصل کیا تھا اور اس کام کیلئے ان کے بھارتی انٹیلی جنس سے برسوں سے رابطے تھے جس کی ابتداء بھارتی ریاست تری پورہ کے صدر مقام "اگر تلہ" سے ہوئی تھی اور انتہا لندن میں ہوئی۔ بھارتی ریاست تری پورہ ، اٹلی اور لندن کو مرکز بنایا گیا۔ اگر تلہ سازش کیس سے رہا ہوتے ہی بھارتی انٹیلی جنس نے شیخ مجیب کو لندن بلایا جہاں اسے یہ پلان دیا گیا۔ 80 ہزار بنگالی ہندوؤں کو تربیت دیکر نصف کو پاکستانی وردی پہنائی گئی۔

یہ اسی نفسیاتی روگ کا شاخسانہ تھا کہ برصغیر کی ہندو قیادت نے قیام پاکستان کو روکنے کی سر توڑ کوشش کی مگر اس میں ناکام رہی۔ اس نفسیاتی روگ میں مبتلا ہو کر بھارتی قیادت نے مشرقی پاکستان میں ہماری مشکلات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان پر حملہ کر دیا اور یوں پاکستان دولخت ہو کر رہ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قیام پاکستان کو روکنے میں ناکامی سے زیادہ بڑی ناکامی ہے۔ بھارت کے فوجی حملے نے ایک پاکستان کے دو پاکستان کر دیئے، دوسرے پاکستان کا نام بنگلہ دیش ہے جو بھارت کے اندر جذب ہونے کی بجائے بھارت سے الگ ایک آزاد خود مختار مسلمان مملکت ہے۔ ان ناکامیوں نے بھارت کی ہندو اکثریت کے نفسیاتی روگ میں مزید شدت پیدا کر دی ہے چنانچہ وہ مارے خوف کے کشمیر سے لیکر گجرات تک مسلمانوں کو ختم کرنے میں کوشاں ہے۔ اس نفسیاتی روگ کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سے بچنے کی صرف ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ہم قائد اعظم اور اقبال کے دکھائے ہوئے راستے پر استقامت سے گامزن رہتے ہوئے پاکستان کو مضبوط بنائیں اور ہندو انڈیا کی بجائے اپنے مغرب میں پھیلی ہوئی دنیائے اسلام سے اپنے رشتوں کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے چلے جائیں اور پاک چین دوستی کی شاہراہ کو بھی ناقابل تسخیر بناتے جائیں۔ ہندو انڈیا کے نفسیاتی روگ کے آزار کا یہی ایک قابل اعتماد علاج ہے۔

رہے نام میرے رب کا جس نے مسلمانوں کو الگ وطن عطا کیا!

بروز ہفتہ 4 ربیع الثانی 1431ھ 20 مارچ 2010ء

"دل کے چراغ"

مالک کی شان نرالی ہے اور اس کے رنگ انوکھے ہیں۔ کہیں تو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز میدان اور کہیں جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے ہوئے۔ کہیں سربلند کوہسار، بے آب و گیاہ تپتے صحرا اور کہیں ہری بھری شاداب کھیتیاں۔ کہیں ننھے ننھے سے پودے اور کہیں بلند و بالا جھومتے اشجار، کہیں گنگناتی ندیاں اور کہیں خاموش جھیلیں، کہیں دوڑتا بھاگتا، شور مچاتا دریا اور کہیں بپھرا ہوا سمندر، کہیں خوبصورت بولیوں والے رنگارنگ پرندے اور کہیں چیر پھاڑ کرنے والے درندے..... ہزار رنگ لئے ہوئے ہے یہ کائنات اور اس کا سرار! عقل حیران ہو جاتی ہے!

خالق کی مخلوق ایک جیسی نہیں ہو سکتی جیسے مصور کی تصویر۔ ہم سب مختلف خدوخال لئے ہوئے ہیں، اور سب کے سوچنے کا انداز بھی ایک جیسا نہیں کہیں معصومیت، سادگی، اپنا پن، ایثار اور قربانی ہے، کہیں مکاری، عیاری، چھینا جھپٹی اور سینہ زوری ہے۔ ایسی ہی ہے، ایسی ہی تھی اور ایسی ہی ہے۔ رہے گی دنیا۔ مالک کے رنگ انوکھے ہیں، کبھی رحیم و کریم، کبھی جبار و قہار، خالق و مصور، ودود، ستار، اور لطیف و غفار۔ اب آپ چلتے چلے جائیں، دنگ رہ جائیں گے آپ۔ کچھ لوگوں کو بولنے کا بڑا شوق ہوتا ہے اور اپنی گفتگو سے لوگوں کو مرعوب اور مسحور کر لیتے ہیں اور بعض افراد کو لفظوں کی جادوگری پر بڑا کمال ہوتا ہے اور اپنی تحریروں سے پڑھنے والوں کو دیوانہ بنا لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قارئین کی ایک بڑی تعداد مجھے اپنے موضوعات سے ہٹنے نہیں دیتی۔ جہاں دعاؤں اور بے پناہ محبتوں کا اظہار ہوتا ہے وہاں محاسبہ بھی جاری رہتا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ اہلِ فکر و دانش بھی اپنے قیمتی آراء سے نوازتے رہتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ان قیمتی آراء کی روشنی میں اپنی اصلاح بھی جاری رکھوں۔ میں نے اپنے کئی مضامین میں اس زمانے کی مجاہدہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی، آمنہ مسعود جنجوعہ اور دیگر ایسے کئی کرداروں کا ذکر اپنی تحریروں میں اس لئے کیا کہ قارئین کو بتایا جاسکے کہ ابھی یہ زمین بانجھ نہیں ہوئی اور موجودہ حکمرانوں کے ضمیروں کو بھی جھنجھوڑتا رہا کہ یہ قوم کی بیٹیاں کس حال میں ہیں اور ان کے تعذیب اور ابتلاء کا دور کب ختم ہو گا؟

"ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ بیٹیاں ایک ایسی پھلواری کی مانند ہوتی ہیں جنکے بغیر کوئی بھی گھر سجتا نہیں۔ بچیاں جینے کا سہارا ہوتی ہیں، آنکھوں کی ٹھنڈک، راحتِ جاں بیٹیاں ہیں پھلواری، خوبصورت الفاظ کی مالا ہیں،، میرے ایک کالم میں یہ پڑھ کر ایک ماں نے جو میرا محاسبہ کیا ہے اور جس دکھ اور درد کا اظہار اس نے کیا ہے، میری شدید خواہش تھی کہ یہ ٹیلیفون بند ہو جائے اور میں مزید شرمندگی سے بچ جاؤں!

"آپ کی سچائی اور محبت سے لکھی ہوئی تحریر نے میرے دل کو دکھی کر دیا ہے اور نہ معلوم کتنی ماؤں نے بین کئے ہونگے، اشک بہائے ہونگے، اپنے دلوں کو دکھی کیا ہو گا۔ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں آپ! ہوں گی کسی زمانے میں بچیاں جینے کا سہارا.... آج کے دور میں بچیاں والدین کیلئے خوف اور دکھ کی علامت بن کر رہ گئی ہیں۔ بیٹیوں کے والدین کس طرح خوش نصیب ہیں؟ اندیشے، وسوسے، جلتے بجھتے امیدوں کے دیئے، معاشرے میں عورت

کے حوالے سے ہر طرف تباہی، بچیوں کے مستقبل کے حوالے سے ہمہ وقت والدین سولی پر لٹکے رہتے ہیں۔ ہم تو اپنی بچیوں کو محبت سے سیر اب کرنا چاہتے ہیں، ہم تو انہیں محبت اور اہمیت دینا چاہتے ہیں، لیکن یہ معاشرہ ایسے کرنے نہیں دیتا۔ یہ بہت لاڈ چاہتی ہیں، درست ہے، مگر ان کی اس چاہت کی پاسداری کون کرے گا؟ ماں باپ کے گھر اٹھارہ یا بیس سال رہنا ہوتا ہے، محبت سے سیر اب ہونے والوں کو محبت ہی چاہیے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مجازی خدا کی مرضی، حقیقی خدا بن کر جب چاہے اس محبت کی دیوی کا جینا حرام کر دے۔

صبر و رضا کی پیکر، محبت کی طالب، ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار کو کاروکاری کی بھینٹ چڑھا کر اس کی زندگی کے دیئے کو بجھا دیا جائے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور مرد جزا و سزا اور انصاف کا ٹھیکیدار ہے۔ جو قانون مرد توڑے اس کی سزا بھی عورت کو مل رہی ہے۔ مرد عورت کیلئے سحر ہونے ہی نہیں دیتا۔ مختاراں مائی کی عزت تار تار کر دی گئی، کتنے باپوں نے احتجاج کیا؟ کیا بلوچستان میں زندہ در گور کر دی جانے والی لڑکیوں کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں، جب قبل از اسلام والی تاریخ دہرائی جارہی تھی؟ میں نے ان زندہ در گور ہونے والی بچیوں پر آپ کے وہ تمام کالم بھی پڑھے تھے، لیکن آپ کی تمام مساعی بھی اس معاشرے میں بے گناہ بیٹیوں کی فریاد محبت کرنے والے باپوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کیلئے ناکافی رہے! ان بچیوں نے قصدِ جرم کیا تھا، جرم نہیں کیا تھا۔

ایک جنرل جو اپنے آپ کو کمانڈو بھی کہتا تھا اور اپنی طاقت کا اظہار برملا اپنے دونوں ہاتھوں کے مکے دکھا کر قوم کو ڈراتا رہتا تھا، جو پاکستان کے سب سے بڑے منصب پر بھی ناجائز اپنی طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کئے بیٹھا تھا، وہ ایک بیٹی کا باپ بھی تھا، اس نے قوم کی ایک بیٹی عافیہ صدیقی کو چند ہزار ڈالروں کے عوض مکار دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ کیا کسی بیٹی کا باپ آرام سے گہری نیند سو لیتا ہو گا؟ کیا عافیہ کا دکھ، کرب، اذیت، بے توقیری پر سکون نیند سونے دیتی ہو گی؟ آٹھ سال کی بچی چالیس سالہ مرد کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہے، خون بہا کے طور پر چھ سالہ بچی بلکہ اس سے چھوٹی بچیوں کو دشمنوں کے گھر بھیج دیتے ہیں، بیوی بنا کر یا داسی بنا کر۔ ایک زندہ بیٹی تسنیم سولنگی کا بھوکے کتوں کے آگے تڑپتا ہوا جسم، اس کی کوکھ میں پلنے والے معصوم بچے کو قبل از وقت پیدا کروا کر ممتا کی ماری کو جو اذیت دی گئی، انسانیت بھی رو پڑی ہو گی۔ یہ سب کچھ اس کے سگے باپ کے سامنے کیا گیا، جو اللہ سے اپنے لئے صرف موت مانگ رہا ہے، کیونکہ انصاف کی اسے امید نہیں ہے۔ اس غمزدہ، دکھی، زخموں سے چور چور بدن لئے باپ کے ساتھ کتنے باپوں نے احتجاج کیا؟

بچی ذرا سی بڑی ہوتی ہے تو خوف کی لہر رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے اور والدین کی دعا ہوتی ہے کہ یا اللہ! اسے اچھا گھر ملے، اس کا مستقبل اچھا ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ اچھے مستقبل سے مراد بچی کی تعلیم و تربیت، ذہانت، سگھڑپن نہیں بلکہ صرف اور صرف اس کی شادی شدہ زندگی میں کامیابی ہوتی ہے، کہ اچھا محبت و قدر کرنے والا شوہر ملے جو اسے خوش رکھ سکے اور بس! ماریہ شاہ 24 دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی ایک نوجوان نے شادی سے انکار کی وجہ سے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا تھا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں کہ کوئی بیٹی مستقبل کے حسین کی بازی ہار گئی۔

خواب اپنی آنکھوں میں سجائے قبر میں جاسوئی ہے۔ کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ شادی سے انکار پر کسی بیٹی نے کسی بیٹے پر تیزاب ڈال دیا ہو ، باوجود اس کے کہ اس لڑکے نے لڑکی کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہو۔

بیٹی کا ایک المیہ مجھے یاد آرہا ہے کہ: میں اگر بیٹی نہ ہوتی تو میرا باپ اس قدر تھکتا نہیں، اس قدر جھکتا نہیں، بلکہ اس قدر تکلیف دہ حالات میں تو یہ کہنا بہتر ہو گا کہ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دینے کی رسم کو قانون کا کوئی حصہ بنادو۔ بچیوں کی معصومیت سے خونخوار بھیڑیئے فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور پھر یہ بیچاریاں نہ اِدھر کی نہ اُدھر کی۔ اگر آپ بیٹیوں کو سچائی کا درس دیں گے تو وہ مزید دھوکہ کھائیں گی۔ جھوٹ کے سمندر میں سچائی کو تلاش کریں گی اور یوں اندھیروں میں گم ہو جائیں گی۔ باپ کا دیا ہوا اعتماد، پیار، توجہ، لاڈ، سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے، اور اگر بیٹی سسرال میں باپ کی محبت کا تذکرہ کرے تو اور مشکل۔ اس پر اسے طعنہ ملتا ہے کہ ہم تو ایسے ہی ہیں جو کرنا ہے کر لو، نہیں بدلیں گے ہم! ایک معزز خاتون مجھے ہمیشہ یاد آتی ہیں جنہوں نے برملا کہا تھا کہ "بیٹیاں دشمن کے گھر بھلی"۔

میں بھی ایک ایسی ہی معصوم بچی سے واقف ہوں۔ اس نے میرے سامنے چلنا اور بولنا سیکھا، ہمیشہ جھکی نگاہ اور جھکا ہوا سر، کم سنی میں ماں باپ نے نسبت طے کر دی۔ بس اسی کے خواب دیکھتی ہوئی جوان ہوئی۔ یونیورسٹی کی ادھوری تعلیم میں پیا کے گھر پاکستان سدھار گئی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی، لاکھوں نہیں کروڑوں روپے شادی پر اٹھ گئے لیکن رخصتی کے چند گھنٹوں کے بعد جس کے سہانے خواب اس نے ساری عمر اپنی آنکھوں میں سجائے رکھے، صاف صاف کہہ رہا تھا کہ تم میرے ماں باپ کی پسند ہو اور تمہارے ماں باپ کی ساری جائداد ہتھیانے کیلئے انہوں نے میری شادی تم سے رچائی ہے وگرنہ میں تو کسی اور کو دل دے چکا ہوں۔ آخر وہی ہوا۔ بمشکل دو مہینے گزرے کہ اس کے ہاتھوں طلاق تھمائی بلکہ اس ناہنجار نے اپنی دوسری شادی کے کارڈ بھی سارے شہر میں تقسیم کئے۔ مجھ میں ہمت نہیں کہ اس سے آنکھیں ملا سکوں۔ زور سے جب بھی ہنستی ہے اس کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ اس کا اصرار بڑھتا جارہا ہے کہ میں دوبارہ آپ کے ساتھ اللہ کے گھر کی زیارت کرنا چاہتی ہوں۔ میں کعبے کے سایہ میں بیٹھ کر اپنے رب سے اپنے دل کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھ سے پوچھ چکی ہے کہ جس اسلامی معاشرے کی آپ باتیں کرتے ہیں وہ اس دھرتی پر کہاں ہے؟ جس پاکستان کے قصے آپ سناتے ہیں، وہ پاکستان دنیا کے کس حصے پر موجود ہے؟

پروین شاکر، ایک خوبصورت شاعرہ، ذہین بیٹی، ساری زندگی شوہر کی محبت کو ترستی رہی، یہاں تک کہ قبر میں جاسوئی۔ بیٹیوں کے ماں باپ تو اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ رخصتی کے وقت اپنی بیٹیوں کو درازی عمر کی دعا تک نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں: ہماری بیٹی سدا سہاگن رہے۔ سو کیا فائدہ اللہ پاک سے بیٹیاں مانگنے کا! میرے آقا و مولا اپنی لختِ جگر سے بہت پیار کرتے تھے، آنکھوں کی ٹھنڈک کہتے تھے۔ آج خود غرضی کے دور میں، درندوں کے ہجوم میں ہم علی جیسا کہاں سے لائیں جن کو اپنی فاطمائیں دے سکیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

میری بہن! آپ نے ٹھیک کہا کہ ہم سب لفظوں کی جادو گری کر رہے ہیں، اسے آپ لفظوں کی بازی گری بھی کہہ سکتی ہیں۔ لیکن ایک بات تو آپ مان گئیں ناں کہ آپ نے گلہ کیا تھا اور آپ کا حق بھی ہے کہ شکوہ کریں، اس لئے کہ شکوہ اپنوں سے ہی تو کیا جاتا ہے۔ لیجئے آپ کا ایک شکوہ تو کم ہوا۔ میرا مالک آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں دکھائے اور آپ مردوں کو یونہی آئینہ دکھاتی رہیں، رہنمائی کرتی رہیں۔ ہم انسان ہیں، خطاکار ہیں۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ میں آپ کا بے انتہا مشکور ہوں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں، کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو الحیی القیوم ہے۔

فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں

بروز اتوار 12 ربیع الثانی 1431ھ 28 مارچ 2010ء

"ڈبل گیم"

خوش گفتار وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی نے یہ نوید سنائی ہے کہ امریکا کی نئی انتظامیہ اپنی پاکستان پالیسی میں تبدیلی کے اشارے دے رہی ہے۔ وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی کو یہ اشارہ امریکی وزیر خارجہ ہلری کلنٹن سے اس وقت ملا جب وہ خوشی سے بے قابو ہو کر ہلیری کلنٹن کے ساتھ دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے بغلگیر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ واشنگٹن میں ابھی یہ میلہ سجا بھی نہیں تھا اور یہ سیاسی اداکار امریکا پہنچے بھی نہ تھے کہ امریکی خونخوار ڈرونز نے پاکستان کے علاقے پر میزائلوں کے حملے کر کے درجن سے زائد بے گناہ افراد کی گردنوں پر اپنے خوں آشام دانتوں سے ان کا خونِ ناحق پی کر اپنی ابھی اپنی دھرتی پر خوشی کے ساتھ تمتماتے چہرے کے ساتھ میڈیا سے اپنی تاریخی کامیابی کا تذکرہ کر رہے تھے کہ ایک اور ڈرون حملے پیاس بجھائی اور نے چھ سے زائد افراد کے ہوا میں چیتھڑے اڑا دیئے اور اس طرح یہ ثابت کیا کہ ان کا اشارہ وہ نہیں تھا جو وزیرِ خارجہ نے سمجھا تھا اور یوں ہلیری کلنٹن کا اشارہ اور وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی کی تشریح اس شعر کی تصویر بن کر رہ گئے کہ:

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

اگر یہ مان لیں کہ ہلیری کلنٹن کے اشارے کو جس مثبت انداز میں وزیرِ خارجہ نے لیا وہی درست ہے، اور خدا کرے ایسا ہی ہو، تو اس میں ہمارے لئے گھی کے چراغ روشن کرنے اور خوشی کے شادیانے بجانے کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟ امریکا کی پہلی پاکستان پالیسی بھی امریکا کے مفاد کے تحت تشکیل دی گئی تھی اور اسی تصور کے گرد وہ گھومتی رہی، اور اگر اس پالیسی میں کوئی تبدیلی آئی بھی، تو اس کا محور و مرکز امریکا کا ہی مفاد ہو گا۔ یوں تو امریکا کو انکل سام کہا جاتا ہے لیکن ڈپلومیسی کی دنیا اور مفادات اور سفارت کاری کے کھیل میں کوئی کسی کا ماموں، چچا نہیں ہوتا اور امریکا جیسے مفاد پرست ملکوں کی پالیسیوں میں تو اوّل و آخر ترجیح اپنے سامراجی مقاصد اور مفادات کو حاصل ہوتی ہے۔ ہر ملک اپنی پالیسیاں طویل المعیاد منصوبوں اور مقاصد کے تحت تشکیل دیتا ہے۔

اسی طرح امریکا کی جنگجویانہ پالیسی بھی امن و آشتی کے انسانی جذبوں کے تحت نہیں بلکہ امریکا کے مفادات کے تحفظ کی غرض سے تیار کی گئی تھی، اور اب اس پالیسی میں صلح جوئی کے عنصر کی کلغی سجائی گئی تو یہ بھی دنیا میں واقعی صلح جویانہ رویوں کو پروان چڑھانے کی غرض سے نہیں ہو گی بلکہ یہ امریکا کا امیج بہتر بنانے، ردِ عمل کی رو کو کم کرنے کی ضرورت کے تحت ہو گی۔ امریکا اپنی پالیسی میں تبدیلی نہ لائے تو اور کیا کرے! افغانستان سے طالبان کو اکھاڑ پھینکنے کی غرض سے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تو برسوں کے شوقِ فضول کے بعد اب یہ عقدہ کھلا کہ افغانستان تو اس کیلئے ویت نام سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے، حالانکہ افغانستان کو ویت نام یا کسی دوسرے ملک سے تشبیہ دینا افغان روایت سے نابلد ہونے کی نشانی اور افغانستان کی توہین ہے۔

مزاحمت، جدوجہد اور حریت کیشی کے اعتبار سے افغانستان، افغانستان ہے، جس کی مثال تو دی جاسکتی ہے لیکن اس کیلئے کسی اور کی مثال ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا۔ ماضی بعید کا برطانیہ اور ماضی قریب کا سوویت یونین افغانستان کے مزاج سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کل سوویت یونین کے گلے کی پھانس بننے والا افغانستان اب امریکا کیلئے اس سے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ یہ تو امریکا کی افغان پالیسی کا پاکستان پالیسی کا حال بھی اس سے زیادہ برا نہیں تو اچھا بھی کسی طور نہیں۔ پاکستان کو اپنی مٹھی میں رکھنے کیلئے حکمران طبقات پر لاکھوں ڈالر کی انجام ہوا، بارش کی تو معلوم ہوا کہ دنیا کا سب سے خطرناک ملک عراق نہیں بلکہ پاکستان ہے۔ افغانستان کے بارے میں اپنی ساری مہارتیں، سارے تجربات اور سارے اثاثے اور فوجی اندازے کا جوابون کانفرنس میں کھیل کر حامد کرزئی کو جیتا تو نو برس کے بعد معلوم ہوا کہ بہت سے چہیتوں کو ہار کر اور کھو کر جس حامد کرزئی کو پایا اور جیتا تھا، وہ تو نااہل، بد دیانت اور ناکارہ نکلا۔ موصوف پچھلے کئی کئی ماہ سے ٹیلی فون کال کے منتظر رہتے ہیں، لیکن نئے امریکی حکمرانوں کی نظرِ التفات اُدھر کو جاتی ہی نہیں، ہاں البتہ اپنے فوجیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کوئی امریکی حکمران آتا ہے تو استقبال کیلئے غلام بھی حاضر رہتے ہیں۔

امریکی برسوں پرویز مشرف کی اس امید پر سرپرستی کرتے رہے کہ یہی وہ شخص ہے جو فتح کے آسمان سے اسامہ اور ملا عمر کے تارے توڑ کر قصرِ سفید کے فرعون کی جھولی میں ڈال سکتا ہے، ایک الیکشن اس فرعون جارج بش نے اسی امید پر جیتا، لیکن وقت گزرتا چلا گیا تو ان پر منکشف ہوا کہ وہ جو تارے توڑ کر لانے کا وعدہ کر رہا تھا دراصل ڈبل گیم کھیل رہا تھا، سو اسے گارڈ آف آنر پر ٹرخا کر رخصت کر دیا گیا۔ پاکستان اور بھارت کے مابین برسوں کی خفیہ سفارت کاری اور سرمایہ کاری کے ذریعے،، دوستی کا پل،، تعمیر کیا گیا، خیال تھا کہ جلد ہی سرحدوں سے ماوراء ہو کر اس پل سے آمد و رفت شروع ہو جائے گی لیکن وہ پل بھی اجمل قصاب کے ایک ٹوکے کی مار سے اڑ گیا۔

ری پبلکن اپنے اعمال کی پوٹلی اٹھائے رخصت ہو گئے تو امریکن سسٹم کے تحت دنیا میں ان کے دوستوں کو بھی اسی پوٹلی کا حصہ بن کر رخصت ہونا تھا۔ پرویز مشرف کے بعد حامد کرزئی بھی ری پبلکن کے ورثے کے اصول کا شکار ہونے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق اور افغانستان میں ڈاکٹر نجیب بھی اسی امریکن سسٹم کے تحت رخصت کئے گئے تھے۔ وہ تلخ و شیریں یادوں کا حصہ تھے، اس دور کے رازوں کے امین اور ری پبلکن کے کندھوں کا بوجھ تھے، اس لئے ڈیموکریٹس کو کلین سلیٹ کی ضرورت تھی۔ یہ الگ بات کہ بعد میں یہ خطہ امریکا کی ترجیحات کی فہرست سے ہی نکل گیا اور یہ کیفیت 11 ستمبر 2001ء کے حملوں تک برقرار رہی۔ امریکا کی پاکستان پالیسی کی تبدیلیوں میں اپنی عافیت کا سامان تلاش کرنے اور اپنی بقاء کا راز ڈھونڈنے کی بجائے یہ دیکھنے کے لمحات آن پہنچے ہیں کہ پاکستان کی پاکستان پالیسی کیا ہے؟ پاکستان نے دنیا میں ایک باوقار مقام حاصل کرنا ہے یا یونہی کٹی

ہوئی پتنگ کا کردار ادا کرتے چلا جاتا ہے، جس کا نہ کوئی وزن ہوتا ہے، نہ ہی کوئی منزل اور نہ ہی کوئی متعین مقام! سرد جنگ کی آندھی چلتی ہے تو وقت اور حالات ہمارے مقام کا تعین کرتے ہیں، اور عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ہوا چلتی ہے تب بھی وقت ہی ہماری منزل، ہمارا کردار اور مقام کا تعین کرتا ہے، ہمیں کہاں جانا ہے؟ کس رفتار سے جانا ہے؟ کس راستے اور رخ پر جانا ہے؟ ہم خود اس کا تعین کرنے سے قاصر ہیں! ہر بار دوسرے ہی ہمارے کھیلنے کیلئے پیچ و کردار کیلئے مورچے اور مدار کا تعین کرتے ہیں۔

خارجہ امور کی بات ہی کیا، یہاں داخلی معاملات بھی ایڈہاک ازم کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ باسٹھ برس ذہنی عیاشی اور سیاسی کوچہ نوردی کیلئے بہت عرصہ ہوتا ہے۔ ایک دور میں جب آگہی، علم و عرفان کا یہ سیلاب نہیں آیا تھا قوموں کو سفر کی تکمیل کیلئے صدیوں کی ضرورت ہوتی تھی، اب تیز رفتار تبدیلیوں کے باعث صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہونے کا زمانہ ہے اور اس دور میں پاکستان اپنے مزید باسٹھ برس اس ایڈہاک ازم کے شوق کی نذر کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ رابرٹ گیٹس کی باڈی لینگوئج، رچرڈ ہالبروک کے اشاروں، اوبامہ کی بے اعتنائی، گورڈن براؤن کے بیانات، چینی دوستوں سعودی اور ایرانی بھائیوں کا تبدیل رویہ، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں کی ہر نئی قسط میں پناہ لینے کی روش پاکستان کے قومی وجود کے اعلانات، کولاحق عارضوں کا علاج اور درپیش خطرات سے بچاؤ کا راستہ نہیں، بلکہ اس کا علاج ایسی مستحکم داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد میں ہے جن میں پاکستان کے طویل المعیاد مفاد کو مرکزیت حاصل ہو۔

اس بات کا انتظار کرنا کہ کب کوئی الاؤ روشن ہو تو اسے دہکائے رکھنے کیلئے لکڑیاں لانے کی خاطر ہمارے کندھوں کی ضرورت پیش آئے گی، بہت سطحی سوچ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم باسٹھ برس سے پٹی ہوئی سوچ کی اس مٹی ہوئی لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ آخر اس کیفیت سے کب باہر نکلیں گے؟ این آر او کے تحت آنے والے حکمران اس سطحی سوچ کے زخم کو مزید گہرا تو کر رہے ہیں لیکن اس اندھیرے سے نکلنے کیلئے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ اسٹریٹیجک مذاکرات کی کامیابی میں ہمیں کیا حاصل ہوا ہے اور اس کے بدلے میں ہم نے کیا قیمت ادا کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے؟ فی الحال اس کا جواب قوم کو مطلوب ہے! البتہ ان کامیاب مذاکرات پر افغانستان طالبان کے ترجمان کا پہلا بیان آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہے جنہوں نے بڑے شائستہ انداز میں اپنی برہمی کا اعلان کیا ہے کہ ہم صرف امریکا کو افغانستان سے نکالنا چاہتے ہیں اور بھارت کی افغانستان میں موجودگی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں!

رہے نام میرے رب کا جس نے ایفائے عہد کا حکم دیا ہے!

بروز جمعۃ المبارک 17 ربیع الثانی 1431ھ 2 اپریل 2010ء

"ماں کھو گئی ہے"

کائنات کا اسرار ہی یہی ہے۔ سب ایک طرح دیکھتے ہیں نہ سوچتے۔ ہر بات کے ہزار مطالب، ہر منظر کے لاکھ رنگ۔ "دل کے چراغ" پر آپ نے میری ایک بہن کے خیالات پڑھے جو اس معاشرے میں مردوں کے کردار پر ایک بھرپور احتجاج تھا۔ اس کالم کے شائع ہونے کے بعد حسبِ معمول بہت سی آراء موصول ہوئیں، ان میں بہت سے جذباتی پیغامات بھی تھے، معاشرے کے بگاڑ پر بہت سے کرداروں کو کوسنے بھی دیئے گئے اور اب تک مسلسل پیغامات موصول ہو رہے ہیں لیکن اب ایک اور میری بہن نے اس کے جواب میں اپنے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش ہے!

"کہاں ہیں آج کی فاطمائیں بھائی؟ بہت قابلِ احترام ہیں آپ کی قاریہ بہن، جن کے سامنے آپ نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا، ان کے دکھائے ہوئے آئینہ میں نہ معلوم آپ نے اپنے چہرے کے کیا خدوخال دیکھے کہ فوراً اُن سے رہنمائی کی درخواست کر بیٹھے۔ ان کی آراء پڑھ کر میرا توجذبہ جنون میں بدلنے لگا کہ کہاں دیکھوں انہیں، اور ہاتھ چوموں ان کی فاطماؤں کے، جن کیلئے ان کے دیدہ تر علی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ درندوں کے ہجوم میں وہ تنہا ہیں اپنی فاطماؤں کے ساتھ، اور ایک خوف اور دکھ نے انہیں سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ قربان جایئے اس ماں کے جذبات پر۔ میں بھی ماں ہوں تین بیٹیوں کی، ایک یونیورسٹی میں استاد بھی ہوں، سولی پر میں بھی چڑھی ہوئی ہوں، لیکن درندوں کے ہاتھوں نہیں، بلکہ اس قوم کی،،ماؤں،، کے ہاتھوں! جو کچھ دیکھتی ہوں میں شب و روز، اور دکھ یہ کہ لب پر لا بھی نہیں سکتی۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اس قوم سے "ماں کھو گئی ہے"۔

اگر آج ماں زندہ ہوتی تو بیٹیاں یوں سرِ بازار اپنی عزتوں کے جنازے نہ کاندھوں پر لئے پھرتیں۔ اب تو یونیورسٹی کسی تعلیمی درسگاہ کی بجائے کوئی فیشن میلہ کا منظر دکھائی دیتی ہے۔ ہر روز سینکڑوں طالبات میری نظروں سے گزرتی ہیں۔ پہلے تو آستینیں مختصر ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں تھیں اور اب شلوایں اور پاجامے دن بدن یوں اوپر چڑھ رہے ہیں کہ پنڈلیاں کھلتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ مجھے ذرا غصہ نہیں آتا ان بچیوں پر، مجھے غصہ آتا ہے ان ،،ماؤں،، پر جن کے سامنے یہ بچیاں تیار ہو کر نوک پلک سنوار کر گھروں سے نکلتیں ہیں۔ کیا یہ مائیں سمجھتی ہیں کہ یوں ان کے بہتر رشتے دستیاب ہوں ہو سکیں گے؟ تو بھول ہے یہ ان کی۔ ایسے وہ کتنی ہوسناک نظروں کی تسکین کا سامان بنتی ہیں، کیا گھر واپس آنے والی بچیوں کی مائیں یہ سوچتی ہیں؟

میں درزی سے بضد تھی کہ میری بچی کی آستین "21" انچ کی ہو گی، وہ کہہ رہا تھا: اس کپڑے میں صرف "16" انچ کی بن سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ "میری بیٹی نہیں پہنے گی!" اس پر اس نے جل کر دوکان کے دوسرے سلے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا "یہ سب قمیضیں بغیر آستینوں کے ہیں، یہ آپ ہی کی بیٹیوں کی ہیں"۔ بھائی! آپ یقین کریں اس نے نیم خواندہ ہونے کے باوجود وہ طمانچہ مارا تھا قوم کی ماؤں کے منہ پر کہ میں مارے شرم کے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی اور کپڑا اٹھا کر بوجھل قدموں سے دوکان سے نکل گئی۔ طارق روڈ پر اپنی بارہ سالہ بیٹی کیلئے لباس کی تلاش میں گئی کہ کسی شادی میں پہننے کیلئے اس کو نیا جوڑا درکار تھا۔ آپ یقین کریں کسی دوکان پر آستینوں والے کپڑے نہ مل سکے۔ ایک دوکاندار بولا:

"آستینیں علیحدہ رکھی ہیں، آپ کنٹراس کر سکتی ہیں"۔ میں نے کہا کہ آستینیں قمیض سے علیحدہ کیسے ہو گئیں؟ بولا "مائیں پسند نہیں کرتیں آستینوں والے کپڑے! ہم تو وہی پروڈکٹس لاتے ہیں جن کی ڈیمانڈ ہوتی ہے"۔

کیا بچیاں اپنی خریداری خود کرتی ہیں؟ کیا ان کا "ٹیسٹ" ان کا ذوق ان کی مائیں ترتیب نہیں دیتیں؟ اکثر بس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے مجھے۔ میرے قریب بیٹھی ہوئی میری ہی یونیورسٹی کی طالبات کے ہاتھ مسلسل موبائل پر مصروف ہوتے ہیں یا موبائل کو کان سے لگائے وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ خوب عکاسی کرتے ہیں کہ وہ کس سے باتیں کر رہی ہیں، لیکن وہ اپنے اطراف کی دنیا سے بے خبر افسانوی دنیا کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جب ہم نے موبائل دیا تو کوئی چیک اینڈ بیلنس رکھا؟ اس ماں کے آنسو مجھے نہیں بھولتے جو انتہائی معزز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اور اس نے بیٹی کی شادی مجبوراً اس نوجوان سے کی جو اس کے گھر انٹرنیٹ کنکشن دینے آیا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ نیٹ پر یہ دوستی اتنی مضبوط ہو جائے گی۔

میں نے اس خاتون سے کہا کہ "بیٹی پر نظر کیوں نہیں رکھی؟" بولیں "ہاں یہ اندھا اعتماد تھا میرا، میں نے اس وقت سوچا ہی نہ تھا کہ میرے گھر میں یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ اب جی چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر سارا معاشرہ سر پر اٹھالوں کہ اے میری طرح کی بدنصیب ماؤ! خدارا ہوش میں آؤ۔" بازار میں چلتے چلتے قدم ٹھٹھک سے جاتے ہیں جب وہ ادھیڑ عمر کی ماں جس نے خود کو عبایا سے ڈھانپا ہوا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ٹین ایج کی بچی مختصر یا بغیر آستینوں اور نیم عریاں پنڈلیوں کے ساتھ اٹھلا اٹھلا کر چل رہی ہوتی ہے۔ میری میٹرک کی طالبہ بیٹی مجھے نام گنواتی رہی کہ عید پر اس کی کن کن سہیلیوں کی ماؤں نے بیٹیوں کو کیپری (وہ پاجامے جن سے نصف پنڈلیاں نظر آتی ہیں) لے کر دیئے ہیں۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اچھی مائیں وہ ہوتی ہیں جو بچیوں کی خواہشات کا خیال رکھتی ہیں!

بھائی! مجھے بتائیں، میں وہ دن کیسے بھول جاؤں جب میری بیٹی کی میٹرک کی الوداعی تقریب تھی جس میں والدین مدعو تھے۔ مائیں پنڈال میں تھیں اور باپ باہر گاڑیوں کے پاس موجود، اور بچیاں جب والدین کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گھروں کو روانہ ہونے لگیں تو میرا مضطرب دل دہائی دیتا رہ گیا کہ قوم سے "ماں" تو کھوئی تھی، اکبر الہ آبادی کی روح بھی تڑپ گئی ہو گی کہ سچ مچ آج کے باپ کی غیرت بھی عزتِ سادات کی طرح رخصت ہو گئی کہ نیم عریاں بازو، نظر آتی ہوئی پنڈلیوں، اسکرٹس کے ساتھ چست بلاؤز، خاصے اونچے لہنگے، رنگے ہوئے بال۔ آپ یقین کیجئے یہ کسی ٹی وی ڈرامے کی ریکارڈنگ کا منظر میں آپ کو نہیں بتا رہی، یہ وہ سولہ اور سترہ سالہ دوشیزائیں تھیں جو مستقبل کی "مائیں" ہیں۔ میرا جی چاہا کہ جا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں کہ حال کی "ماں" کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے جس نے مستقبل کو یہ "ماں" دی ہے۔

زبردست بحث سن کر میں کمرے میں داخل ہوئی تو پروگرام "ماچس" چل رہا تھا، جس میں پروگرام کی میزبان نے بغیر آستین کے ٹی شرٹ اور شارٹس پہن رکھی تھی جس میں اس کے گھٹنے تک برہنہ نظر آرہے تھے۔ جب میں نے افسوس کا اظہار کیا تو میری بیٹی میرے کان میں کہنے لگی کہ " امی! شارٹس کا یہی سائز ہوتا ہے؟" بھائی! دل تھام کر میری یہ بات سنیں کہ یہ تقریب میری ہی یونیورسٹی میں ہو رہی تھی جہاں صوبے کا وزیرِ تعلیم دوسری مقامی سیاسی قیادت کے ساتھ موجود تھا۔ مجھ جیسے کچھ اساتذہ نے آج سے کچھ برس پہلے جب دلائل کے ساتھ ایسی مجالس کے انعقاد کو روکنے کی سفارشات پیش کی تو

ہمارا منہ بند کرنے کیلئے ایک ایسی لسانی تنظیم جس کا سربراہ اس وقت آپ ہی کے ہاں برطانیہ میں موجود ہے، نے اپنے ٹیلیفونک خطاب میں اپنی روشن خیالی کا اس طرح اظہار فرمایا کہ ہماری ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی جانوں کو بچانا بھی مشکل ہو گیا۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے درزی سے مدد مانگی، اپنی بچیوں کے کپڑوں کے ڈیزائن کیلئے۔ آپ یقین کیجئے، اس نے جس کتاب کی میرے سامنے ورق گردانی کی، وہ کسی یورپ کے معاشرے کی تصاویر نہیں تھیں۔ وہ پاکستانی مسلمان لڑکیاں تھیں، لیکن ان کے لباس، ان کے کلوز اپ، کسی انڈین عریاں فلم سے کم نہیں تھے! کون سا گھر ہے جہاں مائیں ایک چھت کے نیچے بیٹیوں کے ساتھ انڈین ڈرامے اور فلمیں نہیں دیکھتیں! حیا کو ہم نے خود رخصت کیا، اپنی بیٹیوں کو بازار کی جنس بنا دیا۔ کوئی اور بعد میں، قصوروار پہلے میں خود ہوں، اس لئے کہ میں ایک "ماں" ہوں۔ زمانے کی رو میں بہنے والی، عقل و شعور سے عاری، خوفِ خدا سے دور اس معاشرے کی "ماں"۔ ایک مسلمان ماں نہیں، صرف "ماں"۔

آجکل ہمارے لئے یہ بہت آسان ہو گیا کہ کہ اس سارے طوفانِ بدتمیزی کی ذمہ داری نت نئے ٹی وی چینلز پر ڈال کر خود کو معصوم اور بے بس ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان سیاسی حکمرانوں نے اپنے مغربی اور صہیونی آقاؤں کی خدمت بجالاتے ہوئے اپنی آئندہ نسل کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ بھائی! آپ ہر نقصان کا ازالہ کر سکتے ہیں لیکن جس قوم کے اخلاق تباہ کر دیئے جائیں اس قوم کو پستی اور انحطاط کی اندھیری کھائیوں میں گرنے سے آپ کبھی نہیں بچا سکتے۔ آپ جیسے کالم نویس ہر روز ملک کو دشمن کی سازشوں سے باخبر رکھنے کیلئے کوئی نہ کوئی موضوع ضرور ڈھونڈ لاتے ہیں لیکن اب تک آپ نے قوم کی اس ابتری کا ذکر کبھی نہیں کیا؟ ہم یہ بات بھی بڑی آسانی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ ملک کی ترقی کیلئے خواتین کو ان دقیانوسی خیالات سے آزادی دلانے کی ضرورت ہے اور اس کیلئے مغربی عورت کی مثال دی جاتی ہے کہ کس طرح آج وہ ملک کے ہر محکمے اور ادارے میں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں اور ہم نے عورتوں کو گھروں میں قید کر رکھا ہے۔

بھائی! یہ حقیقت نہیں ہے، میں یہ بات اس لئے یقین سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے بھی برطانیہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے رکھی ہے اور میں نے بھی اپنی زندگی کے کچھ قیمتی سال وہاں گزارے ہیں، اور اب بھی مجھے کئی دفعہ امریکہ اور یورپ کے مختلف تعلیمی اداروں سے رابطے کی دعوت ملتی رہتی ہے اور میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی ایک مسلمان پاکستانی عورت اور استاد کے ناطے کر چکی ہوں، مغربی ممالک کی پڑھی لکھی خواتین کی آراء اس سے بہت مختلف ہیں جن کا پرچار ہمارے یہ کچھ بگڑے ہوئے ضمیر فروش سیاسی رہنما اور ان کی تائید کرنے والے قلمکار کر رہے ہیں۔ مغرب کے کئی دانشور جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ پاکستان کی مسلم خواتین کیلئے تعلیم کو تو بہت ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ

مغرب کے معاشرے کی بے راہ روی سے بچنے کا ذکر بھی بڑی دلسوزی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب میں اس کی تفصیل بتانے بیٹھ گئی تو اس کیلئے کئی اوراق درکار ہوں گے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ معاشرے کی اس بیماری کو اجاگر کر کے ملک کی ماؤں کی توجہ اس طرف ضرور دلائیں گے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور،، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ،، کی دعا سے اجازت لیتی ہوں۔"

میری بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، میرا مالک آپ کو سدا خوش رکھے اور اپنی مخلوق میں سے کسی کا بھی محتاج نہ بنائے اور آپ کا ہاتھ تھامے رکھے۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ ان کور بصری قلمکاروں کو بھی حقیقت کا ادراک ہو جائے تا کہ ہم آخرت کی نجات کا کوئی تو وسیلہ اپنے دامن میں بچا کر رکھ سکیں۔ ثم آمین! کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو الحیی القیوم ہے۔

بروز ہفتہ 18 ربیع الثانی 1431ھ 3 اپریل 2010ء

،،واویلا،،

باباجی کے دونوں اعتراض درست تھے، میں خود بڑے عرصے سے محسوس کر رہا ہوں، میری تحریر میں ایک بیزاری، ایک لاتعلقی سی آچکی ہے۔ وہ تلخی ، وہ آگ اور وہ سلگتا ہوا درد ختم ہوتا جا رہا ہے جو اس تحریر کی پہچان تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں اکثر خود سے سوال کرتا ہوں۔ ہر بار میں خود کو یہی جواب دیتا ہوں، کوئی نیا موضوع، کوئی نیا ایشو نہیں۔ میں نے باباجی کو بھی یہی جواز پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا، باباجی! مہنگائی پر کتنے کالم لکھے جاسکتے ہیں؟ بیروزگاری، جہالت اور بیماری پر کوئی کہاں تک لکھ سکتا ہے؟ بدامنی، حکومتی رٹ، حکومتی بے حسی، لوٹ کھسوٹ، کرپشن، دفتری تاخیر، سرخ فیتہ اور سیاسی مکر و فریب پر کتنے ٹن مضامین چھاپے جاسکتے ہیں؟ آخر انسانی دماغ کی بھی ایک حد ہوتی ہے، آپ سیاپا بھی ایک حد تک کر سکتے ہیں، بچہ ماں کو کتنا پیارا ہوتا ہے، بچہ مر جائے تو ماں بین کرتی ہے، روتی ہے چلاتی ہے لیکن کتنی دیر؟ ایک گھنٹہ، ایک دن یا ایک ہفتہ، آخر بین چیخوں، چیخیں سسکیوں اور سسکیاں آہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، دلِ مضطرب کو چین آجاتا ہے۔ ایک ہلکی سی کسک، درد کی ایک تھوڑی سی آہٹ باقی رہ جاتی ہے۔

کالم نویسوں کے کالم بھی ایک بین، ایک چیخ ہوتے ہیں۔ یہ چیخ یہ بین بتاتے ہیں کہ لوگو! تمہارے ساتھ ظلم ہو گیا، تم لٹ گئے، تم برباد ہو گئے۔ اس چیخ ، اس بین پر لوگ متوجہ ہو جائیں اور ظالم ٹھٹک کر رک جائے تو کالم اور کالم نویس کا فرض پورا ہو گیا لیکن اگر ظالم ان چیخوں، ان بینوں کے باوجود ظلم کرتا رہے، ایک لمحے کیلئے اس کا ہاتھ نہ رکے، اس کے ماتھے پر شرمندگی کا پسینہ تک نہ آئے، تو وہ چیخ، وہ بین ایک فضائی آلودگی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لوگ بھی اگر اس چیخ اور اس بین کو معمولی سمجھیں اور ایک روٹین کا درجہ دے دیں تو بھی یہ چیخیں یہ بین آوازوں کے جنگل میں ایک جھاڑی ، سوکھی سڑی اور ایک کچلی گھاس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ چوکیدار کے ،، جاگتے رہو،، کے اعلان سے اگر چور گھبرائیں اور نہ ہی اہلِ محلہ کی آنکھ کھلے تو چوکیدار کیا کرے گا؟ اس کی پتلیوں میں بھی نیند ہچکولے لے گی، اس کا ضمیر بھی جمائیاں لینے لگے گا۔

یقین کیجئے میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو خود سے سوال کرتا ہوں، کس کیلئے لکھ رہا ہوں؟ ان لوگوں کیلئے جو غلامی سہنے کی عادت، زیادتیاں برداشت کرنے کی خو جن کی نس نس میں بس چکی ہے، جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان کو بھی ایک افسانہ سمجھ کر پڑھتے ہیں، جو اپنے قتل کے گواہ پر ہنستے ہیں یا اس حکومت کیلئے جو خدا ترسی کی اپیل کو پاگل اور قنوطیوں کا ،، واویلا،، سمجھتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں آپ بیل کو لیکچر کے ذریعے چیتا نہیں بنا سکتے۔ بھیڑیئے کے دل میں بھیڑ کیلئے ہمدردی بھی نہیں جگا سکتے، لہٰذا صاحبو! سچی بات ہے سیاپے کی یہ نائین (پیغام دینے والی مائی) تھک چکی ہے۔ آخر قبرستانوں میں اذان دینے کی ایک حد ہوتی ہے!

رہا دوسرا اعتراض تو میں نے پچھلی تین دہائیوں میں سیاستدانوں کے وہ رنگ دیکھے کہ لفظ سیاست سے مجھے بدبو آتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی کچرا گھر کی دیوار پر بیٹھا ہوں، ایسی دیوار جس میں اصول، انصاف، وفاداری، ایمانداری اور ضمیر نام کی ہر وہ خوبی، ہر وہ وصف گل سڑ رہا ہے، جس کی وجہ ایک درندہ اشرف المخلوقات بنتا، مجھے ان اوصاف، ان خوبیوں کے لاشوں میں کیڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ میں نے ان پچھلی تین دہائیوں میں ان

لوگوں کو اپنے محسنوں کو گالیاں دیتے دیکھا۔ میں نے فوجی حکمرانوں پر تنقید کرنے والوں کو ان کے تلوے چاٹتے دیکھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جنرل ضیاء الحق نے جب کہا تھا کہ میں ان سیاستدانوں کو اشارہ کروں تو یہ دم ہلاتے میرے پاس آجائیں۔ میں اس وقت سیاسی تجزیے کے عنوان سے تو کچھ نہیں لکھتا تھا اس لئے میں اشارے ہوتے اور دمیں ہلتی نہ دیکھ سکا لیکن اب میں نے کھلی آنکھوں سے اشارے کے بغیر دمیں ہلتیں اور زبانیں نکلتی دیکھیں ہیں۔

آپ کسی غیرت مند کو گالی دے سکتے ہیں لیکن جس کی آنکھوں کی شرم ہی مر چکی ہو، جسے پارٹی بدلتے، وفاداری تبدیل کرتے، نظریہ اور منشور بھلاتے اتنے دیر بھی نہ لگتی ہو جتنی بنیان بدلنے یا جرابیں تبدیل کرنے میں لگتی ہے تو آپ اس کو کتنا برا بھلا کہہ دیں گے۔ یارو! ان سے تو وہ شخص بہتر تھا جس نے یہ کہا تھا کہ میں انکار میں اتنا آگے جا چکا ہوں کہ میرے لئے واپسی ممکن نہیں۔ بابا جی! آپ خود سوچیں! بدبو کے اس جوہڑ پر کیا لکھا جائے؟ ان غلاظت اور سڑاند بھرے کچرا گھروں سے کون سا سورج طلوع ہو گا، یہ لوگ کس مستقبل کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ این آر او جیسے سمجھوتوں کی کوکھ میں پروان چڑھنے والے لوگ اپنی انا، اپنا ضمیر اور اپنی زبان گروی رکھ کر جنم لیا کرتے ہیں۔ وہ جمہوریت جو آمریت کے پیٹ میں ہلکورے لے رہی ہو اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

جو لوگ اپنے نظریئے پر قائم نہیں رہ سکے، جو اپنے لیڈروں کے نہیں ہو سکے وہ میرے یا آپ کے کیا ہونگے۔ وہ میرے نظریات، میرے احساسات اور میرے جذبات کی کیا ترجمانی کریں گے۔ وہ میرے لئے تبدیلیوں کے کون سے سورج تراشیں گے، وہ انقلاب کے کن سویروں کی پنیریاں لگائیں گے۔ خدا کی قسم! میں اپنے وجود پر شرمندہ ہوں، مجھے شرم آتی ہے، میں کس دور، کس عہد میں جی رہا ہوں۔ میں اپنے بچوں، اپنی آئندہ نسل کو کس عہد، کس دور میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ میں تو ہوا کے اس جھونکے سے بھی ہلکا ہو گیا ہوں جو اگر چلتی ہے تو دنیا سے بدبو کا ایک تولہ، سڑاند کا ایک آدھ ماشہ کم ہو جاتا ہے اور بابا جی کہتے ہیں کہ میں ان سیاستدانوں پر لکھوں، شیطان کو بددعائیں دوں، یہ جانتے ہوئے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ سیاپوں، بینوں اور چیخوں سے مردے جاگا کرتے ہیں اور نہ ہی بددعاؤں سے شیطان مرا کرتے ہیں۔ آیئے میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں، رات بہت ہو گئی ہے!!!

بروز منگل 20 ربیع الثانی 1431ھ 5 اپریل 2010ء

کھیت رہے نہ کھلیان

کرپشن کی ہمہ رنگ داستانیں ایک بار پھر گردش میں ہیں اور پر اسرار طور پر یہ ساری داستانیں سرکار و دربار یا ریاست سے تعلق رکھنے والے حجرۂ ہائے مقدس سے جنم لے رہی ہیں۔ پہلے خبر آئی کہ پاکستان اسٹیل مل کے چیئرمین کو بدعنوانی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان کے گرفتاری اس لئے ناگزیر ہو گئی تھی کہ عدالتِ عالیہ نے اس اربوں روپے کی لوٹ مار کا سختی سے نوٹس لے لیا تھا اور ان صاحب کی گرفتاری پر صدرِ مملکت کو نہ صرف ایک بہت بڑا دھچکہ پہنچا بلکہ موصوف ان کی جیل میں ملاقات کیلئے بے چین ہو گئے لیکن پروٹوکول کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے مشیروں کو فوری طور پر اعانت کیلئے جیل میں بھیجا اور اب بھی ساری سرکاری مشینری اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ یہ پھندا کسی اور کے گلے میں ڈال کر منظورِ نظر کی جیل سے خلاصی کرائی جائے تاکہ ایوانِ صدارت میں کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا طبیعت کے ملال کو کم کر سکے۔

ابھی اس مشکل نے رات کی نیندوں کو پریشان کر رکھا تھا کہ اپنے ایسے دوسرے ساتھی جس کو نیب نے اربوں کرپشن کے کیس میں چودہ سال کی قید اور کروڑوں روپے جرمانے کی سزا سنا کر جیل روانہ کر دیا تھا اس کو جیل سے نکال کر سرکاری عہدے میں ترقی دیکر دوبارہ اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔ ایک دفعہ پھر عدالت نے سرزنش کی تو اس کو دوبارہ وہی پہنچایا گیا جہاں سے ان کو "پوتر" کر کے لایا گیا تھا اور اس طرح ایک مرتبہ پھر ایوانِ صدر کا دامانِ تقدیس تار تار کر دیا گیا۔ نیب کے چیئرمین نے کئی مرتبہ استعفیٰ دیکر جان چھڑانی چاہی لیکن ہر دفعہ انتظار کرنے کا حکم موصول ہوتا رہا' بالآخر وہ لمبی رخصت پر روانہ ہو گئے تاکہ عدالت کے غیض و غضب سے بچ جائیں۔

پراسیکیوٹر جنرل انور منصور نے بھی بالآخر عدالتِ عالیہ کو اپنے استعفے کی وجہ ریکارڈ کرواتے ہوئے اپنے منصب سے علیحدگی اختیار کر لی کہ ملک کا وزیرِ قانون بابر اعوان عدالت کے احکام کی تعمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور سوئس مقدمات کا ریکارڈ جو کہ ملک کی امانت ہے اس پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں اور انہوں نے یہ دھمکی دی ہے کہ میری لاش سے گزر کر اس ریکارڈ تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے وہ بے ننگ و نام موسم جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

تن ہمہ داغ داغ شد' پنبہ کجا کجا نہم

جب جسم کے ایک ایک مسام سے فاسد مواد رسنے لگے تو روئی کے پھاہے کہاں کہاں رکھے جائیں؟ سرطان کے کس کس سوتے کو خشک کیا جائے اور کون کون سے زخم پر مرہم لگایا جائے۔ کرپشن کی یہ تازہ داستانیں 'طلسم ہوش ربا کی سینکڑوں اور کہانیاں اپنے دامن میں لئے بیٹھی ہیں اور ان تازہ وارداتوں نے ایک بار پھر اس سوال کی خلش تیز تر کر دی ہے کہ دو سال قبل جمہوری انقلابِ عظیم کی جو شہزادی مارگلہ کی پہاڑیوں سے جھانجریں چھنکاتی اتری تھی' اس کے چشم فسوں طراز نے اب تک کیا جادو جگایا ہے اور گوناگوں معاشرے کو کتنی شفا حاصل ہوئی ہے؟

انقلاب کی شامِ غریباں نے کئی شب وروز پاسبانِ انقلاب کو اس صدمے اور شادیٔ مرگ میں مبتلا رکھا کہ ایسا منتخب وزیر اعظم کہاں سے لاؤں جس کی مشکیں مؤثر طور پر کس کر اقتدار کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ "جمہوریت سب سے بڑا انتقام ہے" کے پر کشش نعرے کی آڑ میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو سہانے خواب میں مبتلا کر کے ملک کی تقدیر بدلنے کی قوسِ قزاح تراشی گئی جو افق تا افق جھولنے لگی' تقریبِ حلفِ وفاداری میں اپنے آقاؤں کو اپنی وفاداری کی یقین دلانے کیلئے پڑوس سے چغہ پوش مسخرے کرزئی کو دعوت دی گئی' بھارت کو اپنی مکمل تابعداری کا پیغام ارسال کیا گیا بلکہ یہاں تک ارشاد فرمایا گیا کہ بھارت تو کبھی بھی پاکستان کا دشمن نہیں رہا۔ ٹیلیویژن پر قوم سے اپنے پہلے خطاب میں قوم کو بہت سے خوشنما وعدوں کی نوید سنائی اور پاکستانی عوام نے جانا کہ واقعی رت بدلنے چلی ہے اور سڑے بسے موسموں کا وقت تمام ہو گیا ہے۔

پاکستانی قوم پچھلے دو سال سے "منیر شامی" کی طرح ان تمام خوشنما وعدوں کی پوٹلی گود میں لئے بیٹھی ہے لیکن اسے کوئی حاتم طائی دکھائی نہیں دے رہا جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر دشوار گزار راستوں کی کٹھن منزلوں کو نکلے اور ایک ایک کر کے تمام وعدوں کی تکمیل کر کے "منیر شامی" کی مراد پوری کرے۔ پاکستان کے کسی غیر جانبدار اور غیر سیاسی ادارے یا این جی اوز کو مفادِ عامہ کیلئے تمام حکومتی وعدوں کا جائزہ لینا چاہئے کہ آج صوبائی ہم آہنگی اور وفاقِ پاکستان کی مضبوطی معراجِ کمال کی کن رفعتوں کو چھو رہی ہے 'معیشت کتنی استوار ہو چکی ہے 'سرمایہ کار کے اعتماد میں کتنا اضافہ ہوا ہے اور عام پاکستانی کی زندگی میں کس قدر آسودگی آئی ہے 'امن وامان کی حالت کتنی بہتر ہوئی ہے 'فوری انصاف کی فراہمی کا خواب تعبیر کی منزل کے کتنے قریب پہنچا ہے 'ریاستی اداروں کی رگوں سے سیاست کا کتنا زہر نچوڑا جا چکا ہے؟

عدلیہ کی بحالی کے سلسلے میں زرداری صاحب کا کردار ساری قوم کے سامنے ہے۔ اختیارات واقتدار کو واپس پارلیمنٹ منتقل کرنے کا وعدے کا کیا حال کیا گیا جب کہ ساری قوم کے سامنے ٹیلیویژن پر وعدہ کیا گیا کہ ایوانِ صدر میں پہنچتے ہی اگلے دن ان تمام آئینی اختیارات کو واپس پارلیمان کو لوٹا دیئے جائیں گے لیکن اسی عوام کو یہ بھی سننا پڑا کہ میرے وعدے کون سے قرآن وحدیث ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اب عدلیہ کے واضح احکام کی تضحیک کا" شجرِ طیبہ "کیسا پھل لا رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ احتساب کی تیز رفتاری کس طرح کی زقندیں بھر رہی ہے 'اس کی غیر جانبداری کے بارے میں خلقِ خدا کا تاثر کیا ہے اور اس کے شفاف آئینے میں دکھائی دینے والی صورتوں کے خدوخال کیسے ہیں؟

تمام خوشنما وعدے کوئی حشر بپا کئے بغیر وہم وگمان بن گئے ہیں لیکن آئینی تبدیلیوں کیلئے اٹھارویں ترمیم کا ایسا شور وغوغا مچایا گیا کہ ارض وسما تھرانے لگے۔ عوام کو یہ دلاسہ دیا گیا کہ اس اٹھارویں ترمیم کے بعد ملک وقوم کی تمام مشکلات ختم ہو جائیں گی 'عوام کو گھر کی دہلیز پر سستا انصاف ملنا شروع ہو جائے گا لیکن اس ملک کے عوام ان حکمرانوں کے قول وفعل کے اس تضاد کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں کہ جو صاحبانِ اقتدار خود عدالت کے احکام کی نافرمانی کر رہے ہیں وہ بھلا قوم کے ساتھ کیا انصاف کریں گے؟

موجودہ حکومت کے سیاسی اہداف و مقاصد اوران کے رویوں کی آکاش بیل نے جمہوری شجرِ انقلاب کو اس بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کہ پھل آنا تو درکنار' اس پر کوئی نظر نواز پھول بھی نہیں آسکے گا۔ ان کی شدید خواہش تو یہ ہے کہ ان کے دامن میں کرپشن کے چھپے ہوئے تمام کوے 'چیلیں اور گدھوں کو معصوم چڑیا کی طرح پاکباز اور مولے کی طرح بے ضرر اور بے داغ مان لیا جائے اور آزاد عدلیہ آنکھیں بند کر کے ان کے آئینی استثناء کا احترام کرے۔ جزوقتی مصلحتوں اور ضرورتوں نے اب تک احتساب کو مضحکہ خیز تماشہ تو بنائے رکھا ہے لیکن اب فرار کے تمام راستے مسدود ہوتے نظر آرہے ہیں۔ قوم کو بھی پہلے والی شرمناک اور عبرتناک جمہوریت اور آج کی "حقیقی جمہوریت" کے فرق کا پتہ چل گیا ہے' آج کی "گڈ گورننس" ماضی کی "بدعنوان حکمرانی" سے کتنی حسین اور نیک چلن ہے؟ فی الحال تو اس کھلبلی سے لطف اٹھایئے جو دستر خوانی قبیلے میں مچی ہوئی ہے اور جس نے اوپر سے نیچے تک قبیلے کے ہر رکن کو ایک ہی کام پر لگا دیا ہے کہ کسی طریقے سے عدالتوں کو بے اثر کیا جائے۔ اگر ایوانِ صدر کی اس سلگائی ہوئی چنگاری کو بھڑکنے سے نہ روکا گیا تو نہ کھیت رہے گا نہ کھلیان' حلوے مانڈے بچیں گے نہ دستر خوان!

رہے نام میرے رب کا جس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچ پایا!

یہ جیسے لوگ ہیں' ویسے نظر نہیں آتے
رفاقتوں میں چھپی ہیں عداوتیں کیا کیا

بروز بدھ 22 ربیع الثانی 1431ھ 7/اپریل 2010ء

تفاخر کی بُو، نمود و نمائش کی آگ

کیسے کیسے لوگ اس ایک خبر سے یاد آ گئے، کیسے کیسے چہرے آنکھوں میں گھوم گئے،، ہم جس کو چاہیں فقیر بنا دیں اور جس کو چاہیں بادشاہ،، جناب صدر زرداری صاحب نے یہ متکبرانہ جملہ اپنے تمام مصاحبوں کو جو سامنے زمین پر بیٹھے سروں کو جھکائے اپنی والہانہ تابعداری کا اظہار کر رہے تھے، کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا! آج سے 35 سال پہلے بھی یہ فرمانِ شاہی جاری ہوا تھا کہ میری کرسی بڑی مضبوط ہے، لیکن کیا ہوا، کہاں ہیں وہ سب لوگ جو ایسے دعوے کرتے تھے؟ کیا ان کو معلوم نہیں کہ تکبر تو اللہ کی چادر ہے جو جبار بھی ہے اور قہار بھی، یہاں تو کوئی انسان کسی دوسرے کی چادر کو ہاتھ ڈال دے تو وہ ہاتھ قلم کر دیئے جاتے ہیں تو کیا اتنا بڑا تکبر ہوا میں ایسے ہی تحلیل ہو جائے گا، خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اب تو الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے، تباہی کی ساری علامتیں ظاہر ہو گئیں ہیں، ایوانِ صدر سے ہر صبح چار کالے بکروں کا صدقہ کہیں کم نہ پڑ جائے!

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ کس شان اور تکبر کے ساتھ ان سڑکوں پر ان کی سواری گزرا کرتی تھی اور اب ان سڑکوں کی دھول بھی ان پر بھاری ہو گئی ہے۔ کیسے کیسے چہرے آنکھوں میں گھوم گئے ہیں اور یہ سلسلہ پھر سے جاری ہے۔ نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ گاڑیاں خریدے، اپنے وجود کی انفرادیت اور اہمیت کا احساس اور غرور آنکھوں میں بسائے، کبھی اس اقتدار کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اور کبھی دوسرے کا، سفارشیں، رشوتیں، دوستی کے واسطے، اپنی وزارت، سیاسی حیثیت اور نوکری کی عظمت کا رعب جھاڑتے ہوئے، ان لوگوں میں سیاستدان بھی ہیں اور اعلیٰ بیوروکریٹ بھی، کندھوں پر چمکدار بیج سجائے یونیفارم والے بھی اور خاندانی رئیس، نواب، زمیندار، وڈیرے اور جاگیر دار بھی۔ ہر کوئی ایک فرمائش کرتا نظر آ رہا ہے کہ اگر آپ میری گاڑی کیلئے فلاں نمبر دے دیں تو میری عزت رہ جائے گی، میری ٹور بن جائے گی، لوگ مڑ مڑ کر میری گاڑی کو دیکھیں گے، حیرت اور حسرت سے سوال کریں گے، تمہیں یہ نمبر مل کیسے گیا؟ بہت بڑی سفارش ہو گی، کتنے پیسے لگے، ہم تو اتنے عرصے سے پیچھے تھے، بڑی کوشش کی لیکن تم نے میدان مار لیا!

پرکشش نمبروں کی یہ کہانی بہت پرانی ہے، یہ اس زمانے سے چلی آ رہی ہے جب ضلعوں کے حاکم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادران کے پاس نمبر ون (1) کے پلیٹ والی گاڑیاں ہوا کرتی تھیں، دور سے ہی دوسرے لوگ پہچان لیا کرتے تھے کہ صاحب بہادر حاکمِ والا کی سواری آ رہی ہے۔ اس گاڑی میں بیٹھنے کا نشہ اور تفاخر ہی ایسا تھا کہ کسی اور نمبر کی گاڑی میں بیٹھنا اپنی توہین تصور ہوتا تھا۔ جنوبی پنجاب کے ایک ضلع ملتان میں بدقسمتی سے یہ نمبر کسی ڈپٹی کمشنر صاحب نے دوستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی اور کو الاٹ کر دیا اور پھر یہ گاڑی بکتے بکتے ایک شوقین کے ہاتھ لگ گئی، نئی گاڑی خریدی، پرانی کا نمبر اس پر لگایا اور بہت زیادہ ابھرے ہوئے حروف میں (1) لکھوا کر گھومنے لگے۔ اُدھر علاقے کے ڈپٹی کمشنر کو نئی گاڑی الاٹ ہوئی تو اس نے بھی وہی نمبر اپنی گاڑی پر سجا لیا کہ اس ضلع میں تو یہ حق صرف مجھے حاصل ہے، کون روک سکتا تھا، شوقین جگہ جگہ محفل محفل احتجاج کرنے لگا، قصے پر قصے سناتا، ایک دفعہ یہاں تک کہہ گیا کہ میرے عزیز ترین دوست نے کہا کہ میں تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں، میں نے کہا "دو چیزوں کے سوا تم سب کچھ مانگ سکتے ہو، ایک میری بیوی اور دوسرا، ملتان ون۔"

افسروں میں اس نمبر کی جنگ خوب تھی، صوبے کے بڑے افسر سے لیکر ڈویژن تک سب اسی نمود و نمائش کے خوبصورت گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے تھے، ادھر یونیفارم والے جب اپنی ذاتی گاڑی خریدتے تو ان سب کی کوشش ہوتی کہ نمبر 2 سے لیکر 9 تک کوئی نمبر ان کی گاڑی کے ماتھے کا جھومر ضرور ہونا چاہئے، اس کیلئے ان کی بھاگ دوڑ دیکھنے کے لائق ہوتی، دوستی، سفارش، دھونس اور رعب سب کچھ چلتا۔ کسی بزنس مین کا بیٹا ضد کر بیٹھتا تو ایکسائز اہلکاروں کے دن پھر جاتے۔ کسی نواب سردار کو دکھاوے کی رسم اچھی لگتی تو اس کی گاڑی پر بھی اس نمبر کو سجانے کیلئے ہر قسم کے پاپڑ بیلے جاتے۔ وزراء سے لیکر ممبرانِ اسمبلی تک اور ناظمین سے لیکر کونسلروں تک جس کا بس چلا اس نے اپنی گاڑی پر ایک پرکشش نمبر سجایا۔ گاڑی کی سیٹ پر بیٹھا متکبرانہ مسکراہٹ سے دنیا کو دیکھتے ہوئے گزرنے لگا۔ آج یہ نمود و نمائش برسرِ عام نیلام ہے، آج یہ انفرادیت کا شوق اور کھوکھلی اہمیت کا جادو بک رہا ہے۔ اس وقت تمام صوبوں کے محکمہ ایکسائز ہر سال پرکشش نمبروں کی پوری سیریل نیلام کرتی ہے اور اس کی ریکارڈ بولی میں لاکھوں روپے،، محکمہ کو آمدنی،، کی مد میں موصول ہوتے ہیں۔

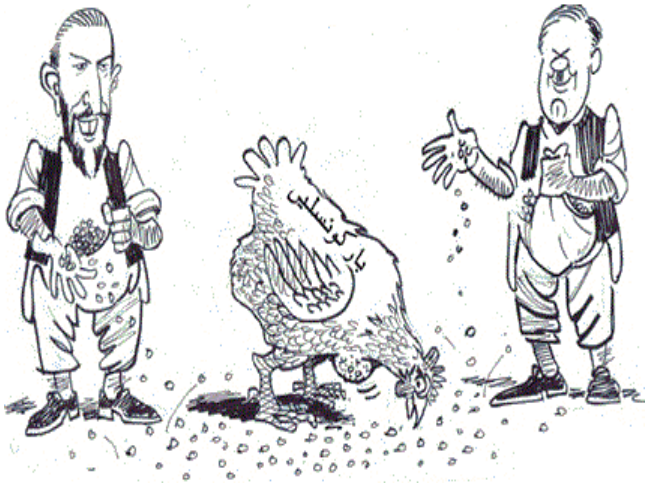

ہم کس عجیب و غریب معاشرے میں سانس لیتے ہیں اور کس کھوکھلی نمود کی بنیادوں پر زندگی استوار کرتے ہیں اور سوچ رہے ہوتے ہیں کہ ان نمبر پلیٹوں سے، ان پر کھدے مخصوص ہندسوں سے لوگوں میں ہماری عزت و توقیر میں اضافہ ہو گا لیکن شائد انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ جب ان کی گرد اڑاتی گاڑیاں مفلوک الحال لوگوں کا تمسخر اراتے ہوئے گزرتی ہیں تو کوئی ان سے محبت نہیں کر رہا ہوتا، یہ تو خدا کا شکر ہے کہ دل اور آنکھوں کی خاموش زبان پر کوئی پابندی نہیں وگرنہ ہر روز نجانے کتنے شانے سروں سے محروم ہو جاتے۔ یہ سب تو اس قوم کے ساتھ ہوتا آرہا ہے اور یہ برسوں سے یہ ناروا سلوک سہتی بھی آرہی ہے۔ خاموش رہنے اور ظلم پر چپ رہنے پر اس طرح کے عذاب مسلط ہوا کرتے ہیں لیکن نمود و نمائش اور کھوکھلی عزت کی جو وباء اور لوگوں میں تھی، اب یہ وجہ نمایاں ہونے کی روش عام لوگوں میں چل پڑی ہے لیکن اب گلہ کیسا، صدیوں پہلے یہ بتا دیا گیا تھا کہ جیسے عوام ہوں گے ویسے حکمران مسلط کر دیئے جائیں گے۔

کیا کبھی اس شخص نے سوچا جو پانچ سے دس لاکھ روپے کی نمبر پلیٹ خرید رہا ہے، اس سے اس کا سوال نہیں کیا جائے گا؟ وہ قادرِ مطلق جس نے اس کو یہ سرمایہ عطا کیا ہے وہ اس سے پوچھے گا نہیں کہ جب تم نیلامی میں یہ بولی دے رہے تھے تو تمہارے ارد گرد بسنے والے کتنے لوگ ایسے تھے جن کے گھروں میں بھوک نے مہینوں سے ڈیرے ڈال رکھے تھے، کتنے تھے جو خودکشی کر کے اس زندگی کے عذاب سے چھٹکارہ پانے کی کوشش میں تھے۔ جس ملک میں 55 فیصد سے زیادہ لوگ غربت و افلاس کی زندگی گزار رہے ہوں وہاں تو شائد ایسا سوال ہر کسی سے اس دن کیا جائے گا۔ سنا ہے کہ بابر اعوان درسِ قرآن کی مجالس میں اپنے وعظ سے لوگوں کے دلوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ قرانِ کریم کی لرزا دینے والی یہ آیت ان کی نظروں سے بھی بارہا گزری ہو گی "لماتقولون مالاتفعلون" وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے!

جمہوری اسلامی پاکستان کا وزیرِ قانون اس وقت کیا جواب دے گا جب اس سے یہ سوال کیا جائے گا کہ کس اسلامی قانون کے تحت اس نے ان لوگوں کی کابینہ میں وزیرِ قانون کے منصب کو قبول کرتے ہوئے ملک کی دولت لوٹنے والوں کی نہ صرف وکالت کی بلکہ جن لوگوں نے پاکستان کے بینکوں کو دن دہاڑے لوٹا ان سے بھاری رقوم لیکر ملک سے فرار کرانے میں مدد کی، اس دن تانبے کی طرح تپتی زمین اور سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج تلے جواب دینا ہونگے۔ میں تو مخبرِ صادق ﷺ کے اس ارشاد سے کانپ رہا ہوں "ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس شخص نے دنیا میں شہرت کیلئے لباس پہنا، اللہ تعالی قیامت کے دن اس کو ذلت کا لباس پہنا کر اس میں آگ بھڑکا دیں گے۔" لیکن کیا کریں جن سروں میں تفاخر کی بو اور ذہنوں میں نمود و نمائش کی آگ سلگ رہی ہے، انہیں اس کا خوف ہی نہیں۔

تکبر تو اللہ کی چادر ہے جو جبار بھی ہے اور قہار بھی، یہاں تو کوئی انسان کسی دوسرے کی چادر کو ہاتھ ڈال دے تو وہ ہاتھ قلم کر دیئے جاتے ہیں، اب دیکھیں میرے رب کی طرف سے فیصلہ کتنا جلد نازل ہوتا ہے "ان اللہ لایخلف المعیاد" بیشک میرا رب اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا!

عجب واعظ کی دیں داری ہے یارب!
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

بروز جمعتہ المبارک 24 ربیع الثانی 1431ھ 9/اپریل 2010ء

ہندو استدلال

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ تصورِ پاکستان کی تردید اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں جو سوالات 1940ء سے لیکر 1947ء تک اٹھائے گئے تھے اور تحریکِ پاکستان کے دوران جن کی بڑی مؤثر اور محکم تردید کر دی گئی تھی وہی سوالات آج بھارت کے علاوہ پاکستان میں بھی ایک اقلیت اپنے آقاؤں کے ایماء پر اٹھا رہی ہے۔ یومِ اقبال کی مناسبت سے منعقد ہونے والی تقریبات میں پنڈت نہرو کے اس بے جا الزام کی گونج ایک دفعہ پھر سنائی دی کہ،، اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں سوشلزم کے زیرِ اثر تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے۔ میں نے بابا جی سے اس کا جب تذکرہ کیا تو انہوں نے ان الجھنوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا لیکن کچھ دوستوں نے پرزور اصرار کیا کہ اس الزام کی کھوج اور تحقیق بلاشبہ ضروری ہے کہ اقبال جنہوں نے پاکستان جیسی ریاست کا خواب دیکھا، ان کو اس الزام میں آخر کیوں ملوث کیا جا رہا ہے؟ اور ایک ہی وقت میں بھارت اور پاکستان میں ایسا بے ڈھنگا راگ کیوں الاپا جا رہا ہے؟

پنڈت نہرو کا یہ الزام سراسر غلط ہے، ان کا یہ الزام لاعلمی پر نہیں بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ پنڈت جی یہ بات اپنی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھی تھی جو انہوں نے ۱۹٤٤ء میں قلعہ احمد نگر کے زنداں میں بیٹھ کر رقم کی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے بطور شاعر اور مفکر اقبال کے فیضان کی تحسین فرمائی ہے مگر اقبال کو خراجِ تحسین کرتے وقت وہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ اقبال،، ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیر داری نظام سے وابستہ تھے۔،، جن لوگوں نے اقبال کی شاعری، فلسفہ اور سیاست کا سرسری سے بھی کم مطالعہ کیا ہے وہ بھی اس صداقت کی گواہی دیں گے کہ اقبال کے عہد میں جاگیر داری نظام کا اقبال سے بڑا دشمن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ لکھتے ہیں کہ:

"اقبال پاکستان کے اوّلین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تجویز کی لغویت اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران اقبال نے ان سے یہ کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمایت کی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔ شائد انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیمِ ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہو، ہم آہنگ نہیں تھا۔ آخری عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔ سوویت یونین کی زبردست کامیابی نے ان کو بہت متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رخ بدل گیا"۔

جب پنڈت جی نے اپنی کتاب میں درج بالا عبارت لکھی، اس سے تین برس پہلے قائداعظم کے دیباچہ کے ساتھ قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط شائع ہو چکے تھے، یہ انگریزی کتاب یقیناً پنڈت جی کی نظر سے گزر چکی ہو گی، اس کتاب میں شامل 28 مئی 1937ء کا وہ طویل خط بھی شامل ہے جس میں پنڈت جی کی "بے خدا سوشلزم" کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان تو رہے ایک طرف، خود ہندو معاشرہ بھی "بے خدا

سوشلزم "کو ہر گز قبول نہیں کرے گا۔ پنڈت جی کی سوشلزم کو رد کرتے وقت اقبال نے قائد اعظم کو بتایا ہے کہ اگر اسلامی شریعت کی دورِ حاضر کے معاشی نظریات کی روشنی میں از سرِ نو تفسیر کی جائے تو مسلمان عوام کی روٹی اور روزگار کا مسئلہ بہتر طور پر حل ہو سکتا ہے۔ مسلمان کو غربت کے عذاب سے نجات دلانے کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی الگ قانون ساز اسمبلی ہو اور یہ اسمبلی متحدہ ہندوستان کی بجائے ایک الگ خود مختار مملکت میں ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس خط کے مندرجات زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:

اوّل: اقبال جواہر لال نہرو کی،، بے خدا سوشلزم،، پر اسلام کے اقتصادی نظام کو ترجیح دیتے ہیں۔
دوم: اسلام کے اقتصادی نظام کو عہدِ جدید کے سیاق وسباق میں نافذ کرنے کیلئے جداگانہ مسلمان مملکت کا قیام ضروری ہے۔
سوم: اپنی وفات سے فقط چند ماہ پہلے وہ قائد اعظم کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ وہ قیامِ پاکستان کو کل ہند مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام بنالیں۔
چہارم: اس خط کے آخر میں وہ قائد اعظم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ وقت نہیں آپہنچا جب ہمیں کھل کر قیامِ پاکستان کو اپنی منزل قرار دے دینا چاہئے؟

اقبال کی وفات سے تین ماہ پیشتر پنڈت نہرو نے میاں افتخار الدین کے ہمراہ جاوید منزل میں علامہ اقبال سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کی خوشگوار یادیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ پنڈت جی نے جو واقعہ بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا اسے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال " میں بیان کر دیا ہے۔ محترم بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

"پنڈت نہرو اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے، انڈین نیشنل کانگرس کے دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے اور دونوں مرتبہ اپنے خطباتِ صدارت میں انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں میں کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل، راج گوپال اچاریہ اور ستیہ مورتی نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ دورانِ ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا کہ سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟ پنڈت جی نے جواب دیا کہ، نصف درجن کے قریب،۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، تعجب ہے، خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے، ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے کا مشورہ دوں، تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں؟،۔ اس پر پنڈت جی خاموش ہو گئے"۔

اسی ملاقات میں ایک ناگوار واقعہ بھی پیش آیا تھا جو پنڈت جی نے تو بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا، ہاں البتہ بٹالوی صاحب نے بیان کر دیا ہے۔
"ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکایک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے کہ ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے؟ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں، اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی غصے میں آگئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے، تو اچھا، یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا

معمولی سپاہی ہوں۔، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے چنانچہ وہ اجازت لیکر رخصت ہو گئے۔

نہ معلوم یہ باتیں پنڈت جی کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں یا انہوں نے ان باتوں کو ناخوشگوار اور اپنی سیاسی آئیڈیالوجی کی تردید سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حیرت یہ ہے کہ انہوں نے ان ناقابلِ فراموش یادوں کو تو آسانی سے فراموش کر دیا مگر ایڈورڈ تھامسن کی گپ شپ کو ناقابلِ تردید تاریخی صداقت کا درجہ دے دیا۔ ایڈورڈ تھامسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے استاد تھے اور تاریخ ہند سے بھی علمی شغف رکھتے تھے۔ وہ دو مرتبہ برطانیہ کے اخبار مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار کے روپ میں بھی برٹش انڈیا تشریف لائے تھے۔ مہاتما گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، راج گوپال اچاریہ، سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے جہاں وہ ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے، وہاں کانگرس کی پرجوش وکالت کو کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جس روایت کا سہارا لیکر پنڈت جی نے اقبال پر الزام تراشی کی ہے وہ ایڈورڈ تھامسن اور علامہ اقبال کی زبانی گفتگو پر مبنی ہے۔ ایڈورڈ تھامسن موصوف کا یہ بیان قائداعظم کے نام اقبال کے متذکرہ بالا خطوط کی دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ اقبال نہرو ملاقات کے مندرجہ بالا احوال و مقامات کی بنیاد پر جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اقبال آخر دم تک اپنے تصورِ پاکستان کو قیامِ پاکستان کی صورت میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں سرشار رہے ۔ قائداعظم کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت میں سرگرمِ عمل رہے اور اسلامیانِ ہند کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ میری زندگی کی دعائیں مانگنے کی بجائے محمد علی جناحؒ کی طویل زندگی کی دعائیں مانگو، صرف جناح ہی قوم کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

نظریاتی اختلاف کے باوجود علامہ اقبال اور پنڈت نہرو کے درمیان ہمیشہ باہمی احترام کے تعلقات قائم رہے اور اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ علامہ اقبال ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ میرے نبیؐ کا یہ مبارک فرمان ہے کہ تم میں بہترین وہ شخص ہے جس کے اخلاق بہتر ہیں۔ پنڈت نہرو نے 1931ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین کے طرزِ فکر و عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اقبال اس کانفرنس میں شریک تھے مگر نہرو شریک نہیں تھے۔ کانگرس کی نمائندگی گاندھی جی نے کی تھی۔ گاندھی جی نے واپسی پر کہا کہ انہوں نے ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو

قبول کر لیا تھا مگر سیاسی رجعت پسندی کی بناء پر مسلمانوں نے کانفرنس کو ناکام بنا دیا۔ نہرو نے گاندھی جی کی باتوں میں آکر مسلمان مندوبین کے خلاف ایک انتہائی سخت سیاسی بیان داغ دیا۔ علامہ اقبال نے گاندھی جی کے اس الزام کی تردید میں جواہر لال نہرو کو جواب ان الفاظ سے شروع کیا:

"میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انہوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانیوں میں کمیاب ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے تین سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئی ہیں ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویہ کے متعلق پنڈت جی کی تحقیق کی بنیاد کسی تعصب پر مبنی ہے"۔ اس خوش گمانی کے اظہار کے بعد علامہ اقبال نے اصل حالات کو بے نقاب کرتے ہوئے بتایا کہ،، گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات کو ذاتی طور پر ماننے کا عندیہ تو دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس بات کی حتمی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کانگرس کی مجلسِ انتظامیہ بھی ان مطالبات کو تسلیم کر لے گی، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کانگرس انہیں ان مطالبات کے سلسلے میں مکمل اختیار دینے کیلئے کبھی بھی رضامند نہیں ہو گی، گویا عملاً گاندھی جی نے مسلمانوں کے تمام مطالبات کو رد کر دیا تھا، مسٹر گاندھی جی کی دوسری غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی حمائت ترک کر دیں مگر مسلمانوں نے اچھوتوں کی حمائت سے دستبرداری سے انکار کر کے گاندھی جی کو ناراض کر دیا تھا"۔

گاندھی جی کے اس رویہ کی حمائت میں پنڈت جی کی لب کشائی پر اقبال حیرت زدہ رہ گئے چنانچہ اپنے اس بیان میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ:
"اپنے زبانِ زدِ عام سوشلسٹ خیالات کے پیشِ نظر پنڈت جواہر لال نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمایت کریں گے؟ کم از کم انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا الزام دیں۔ اس صورت میں میں وہ لوگ جو ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہونگے کہ پنڈت جی فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف ہندو مہاسبھا کی جاری کردہ مہم میں ایک سرگرم رکن ہیں"۔

مسلمانوں کے خلاف پنڈت جواہر لال نہرو کا دوسرا الزام یہ تھا کہ مسلمان ہندوستانی قومیت کے مخالف ہیں۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا "اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر میں ہی اس نظریہ قومیت سے انکار کا مجرم ہوں۔ میں پنڈت نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں، جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنہیں وہ اپنی بقاء کیلئے ضروری سمجھتی ہے نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسے رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں، یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کو مذہبی، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیشِ نظر اس طرح تقسیم کرنا ہو گا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے"۔

پنڈت نہرو کے جواب میں دیا گیا علامہ اقبال کا یہ بیان یقینی طور پر پنڈت جی کی نظروں سے گزرا ہو گا، اس بیان میں روزِ اوّل تا آخر اقبال کا ترقی پسند، وسیع النظر اور انسان دوست مسلک نمایاں ہے۔ یہ بیان تصورِ پاکستان کی نفی سے نہیں بلکہ اثبات سے عبارت ہے۔ ایسے میں پنڈت جی کا یہ کہنا کہ

1930ء کے بعد اقبال اپنے تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے ،دیانت داری پر مبنی نظر نہیں آتا بلکہ تاریخی حقیقت پر تعصب کی چادر ڈالنے کے مترادف ہے۔

جب پنڈت نہرو نے ،،ماڈرن ریویو،،(کلکتہ)میں دنیائے اسلام کی صورتحال پر تین مضامین میں وطنیت اور لادینیت کے فروغ کا خیر مقدم کیا تھا تو اس کے جواب میں اقبال نے بھی ،،ماڈرن ریویو،،(کلکتہ)ہی میں پنڈت جی کی فکری گمراہی کو راست فکری میں بدلنے کا سامان کیا۔اپنے طویل مضمون کے آغاز میں اقبال نے برملا کہا:

"میں اس بات کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ جس انداز میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔وہ اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام پسند نہیں کرتے۔ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو"۔

اقبال کا یہ تجزیہ کہ پنڈت جی کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے،وقت نے بہت جلد سچ ثابت کر دکھایا،جب پنڈت جی کے دل میں برصغیر کی زندگی کے ٹھوس حقائق کا احساس جاگ اٹھا تو مولانا ابوالکلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بھی ٹھوس حقائق یعنی قیامِ پاکستان کی حقیقت کو قبول کرنے کا مشورہ دینے لگے۔مولانا آزاد نے اپنی تصنیف ،،انڈیا ونز فریڈم،، میں اس بات کا ذکر یوں فرمایا ہے:

"After a few days Jawaharlal came to see me again. He began with a long preamble in which he emphasized that we should not indulge into wishful thinking, but face reality. Ultimately he came to the point and asked me to give up opposition to partition."

اسلامیانِ ہند نے 1946ء کے انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے پنڈت نہرو اور گاندھی جی کے سیاسی خواب پرستوں کو زندگی کے جن حقائق کا احساس دلایا تھا،اقبال نے برسوں پہلے پنڈت جی کو ان حقائق کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ،،سیاسی تدبر کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے حقائق سے فرار کرنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے پنجہ آزما ہوا جائے۔،،اپنے زیرِ نظر مضمون میں بھی علامہ اقبال نے جداگانہ مسلمان قومیت کے سوال پر دوٹوک انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔اقبال نے اسلامیانِ ہند کے سیاسی مسلک پر ان الفاظ پر روشنی ڈالی تھی:

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کیلئے جان تک قربان کر دینے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے۔اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے،جداگانہ مسلمان قومیت کا

سوال صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ

اسلامیانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی، اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے "۔

علامہ اقبال کا یقینِ کامل بالکل درست نکلا، اسلامیانِ ہند نے بالآخر متحدہ ہندوستانی قومیت کے سیاسی تصور کو غلط ثابت کرتے ہوئے جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان قائم کر لیا۔ ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو گئی اور یوں پاکستان میں اسلام سے عشق اور وطن سے محبت میں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔ اب ہمارا دین اسلام ہے اور ہمارا وطن دار لسلام ہے اور دوسری طرف آپ پنڈت جی کی صداقت کا اس بات سے اندازہ لگالیں کہ ساری دنیا کے سامنے انہوں نے تحریری طور پر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دیں گے لیکن خود ہی اپنی تحریر سے منحرف ہو گئے اور اس وعدہ خلافی نے ان کی ساری شخصیت اور صداقت کا بھرم طشت از بام کر دیا ہے۔ علامہ کا یہ شعر کتنا حسبِ حال ہے!

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

میں زہرِ ہلاہل

کو کبھی کہہ نہ سکا قند

رہے نام میرے رب کا جو حق سچ ہے!

بروز سوموار 27 ربیع الثانی 1431ھ 12/ اپریل 2010ء

25 دسمبر 2009ء کو مجلسِ اقبال ریجنٹ پارک مسجد لندن میں بھی یہ مقالہ پڑھا گیا

قرونِ اولیٰ کی ایک نایاب خوشبو

باباجی کو اپنے پروگرام کی اطلاع دینے کیلئے ٹیلیفون کیا تاکہ میری عدم موجودگی میں وہ پریشان نہ ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ میرے تعاقب میں رہتے ہیں، قلمی راستہ میں کہیں گم نہ ہو جاؤں اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی حوصلہ رہتا ہے۔ انہوں نے اسلام کے عظیم الشان داعی ڈاکٹر اسرار احمد کی رحلت کی جب خبر سنائی (إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ) تو خانۂ دل میں محبتوں کی کئی دیوراوں کے گرنے کا شور ایسا اٹھا کہ برسوں کی محبت و شفقت کی بارش نے مجھے شرابور کر دیا۔ خالص توحید کا گلدستہ دامن میں لئے اپنے خالق کے ہاں پہنچ گئے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو کتنے ہی روشن ستارے ہیں جو اپنی منزل میں ڈوب کر فنا ہو گئے کہ یہی میرے رب کا قانون ہے۔ اپنا اپنا کام کیا، مالک نے آواز دی اور وصل کی آرزو میں خاموشی سے سرہانے کھڑے موت کے فرشتے کے ساتھ چل دیئے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر روز کئی شہابِ ثاقب ٹوٹ کر اپنی ہستی کھو دیتے ہیں لیکن میرے رب کا آسمان پھر بھی ستاروں سے منور ہے! وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ہر سال کے بدلتے موسم اور بہار اور خزاں بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہر شئے کو فنا ہے، لافانی تو صرف میرا پروردگار ہے!

لاریب ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ خالقِ ارض و سماء کے اس متعین ضابطے سے کسی کو استثنیٰ نہیں۔ وہ ان میں سے ایک تھے جو کبھی کرۂ ارض پر بوجھ نہیں بنتے۔ جن کے روز و شب کی ہر ساعت اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کی امین ہوتی ہے۔ جن کا دلِ بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے۔ جن کی زندگی بندۂ مومن کی طرح حرص و ہوس سے پاک ہوتی ہے، جن کی بیاضِ حیات، داستانِ حرم کی طرح غریب و سادہ و رنگین ہوتی ہے۔ جن کی تخلیق کسی اعلیٰ مشن میں گندھی مٹی سے ہوتی ہے۔ جن کے مقاصد جلیل اور جن کی امیدیں قلیل ہوتی ہیں۔ جو منزلِ جاناں کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو پھر زندگی کی آخری سانس تک کبھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتے، نہ نخلستانوں کی آسودگی ان کے عزمِ سفر کو موم کرتی ہے، نہ آبلہ پائی وادیٔ پر خار میں اترنے سے روکتی ہے۔ وہ ہمارے ہاں کی بے ننگ و نام سیاست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس عہدِ ستم گار میں نہ صرف قرونِ اولیٰ کی ایک نایاب خوشبو کی مانند تھے بلکہ اس کہکشاں کا سب سے روشن ستارہ بھی تھے۔ اپنے عہد کا درویش، اجلے ذہن، اجلی سوچ، سادہ مگر اجلے لباس، اجلی گفتگو، اجلے دامن اور اجلے کردار کے حامل، شرافت اور نجابت کی ایک تصویر، صاف دل، صاف گو، فراست فکر، راست کلام، نہ کوئی اونچ نیچ، نہ کوئی سیاسی کرتب، نہ منافقانہ مصلحت کیشی، نہ فریب، نہ دہرا پن، کھری بات کہنے والا کھرا انسان..... کامردِ مطلوب، پاک دل و پاکباز! ایک صدی سے کچھ کم پر پھیلی اس منفرد زندگی کا احوال کا قلمی احاطہ ممکن ہی نہیں۔

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

کئی عشروں تک وہ بے ریا آدمی مقتل میں کھڑا رہا اور کس شان سے کھڑا رہا۔ فقر کے ساتھ بادشاہی کی، زندانوں کی وحشت اور جبر کو شرمسار کر دیا۔ خوف کبھی اس کی کھال میں داخل نہ ہو سکا۔ بوڑھا شہسوار میدانِ جنگ سے رخصت ہوا تو میدانوں نے شائد اسے حسرت سے دیکھا اور اپنی

محرومی کا ماتم کیا ہو گا۔ ہمیشہ کی ٹھہری ہوئی آواز میں، ہمیشہ کی بے نیازی میں، کہ اس کا منبع زمین نہیں آسمان تھا۔ ہر وقت ہاتھ پر نقدِ جاں سجائے ہوئے، دونوں ہاتھوں سے ہیروں کی چمک سے ماحول کو بھر دینے کی خداداصلاحیت، وفاداری ایسی کہ بشرطِ استواری اور اصل ایمان کی گراں قدر نشانی۔ سپہ سالار مٹی اوڑھ کر سو گئے لیکن سپاہی نے ایمانی اسلحے کا زیور تن سے جدا نہیں کیا۔ دنیا کے ہر خوف سے دل خالی اور جان دینے کیلئے ہر وقت تیار!

حاصلِ عمر نثارے رہِ یارے کردم
شادمِ از زندگی خویش کہ کارے کردم

(حیات کی ساری پونجی میں نے راہِ یار کی نذر گزاری، اپنی زندگی سے میں شاد ہوں کہ کچھ کر گزرا) ۔ ہم خیال، ہم مزاج ایمانی دوستوں سے دائمی وفا کا رشتہ اور ایسی وفا بلند مقاصد کیلئے مستقل ایثار سے جنم لیتی ہے۔ یک جان دو قالب؛

آکھونی مینوں دھیدو رانجھا، ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا رانجھا کو کدی، میں آپے رانجھا ہوئی

(سہیلیو! مجھے رانجھا کہو، ہیر نہ کہو، قلب و دماغ کی گہرائیوں سے اتنی بار رانجھے کو پکارا ہے کہ خود رانجھا ہو گئی ہوں)۔ ہمارے اس بے ثبات اور بے وفا عہد میں، حاسدوں کے نرغے میں گھرا ایک شاعر افتخار عارف کیا خوب یاد آیا:

زندگی نذر گزاری تو ملی چادرِ خاک
اس سے کم پر تو یہ عزت نہیں ملنے والی

بے پناہ مرتب، بے حد ریاضت کیش، کمال یکسو، مکمل طور پر بے ریا، صداقت شعار، وفا کیش۔ اگر دنیادار بنتا تو ویسا ہی کامیاب ہوتا جیسے آج کے عزت دار مالدار سیاستدان، وہ محلات میں جیتا اور نعمتوں کے ہجوم میں زندگی گزارتا، مگر اس نے یہ سب کچھ تیاگ دیا، ایک ساعت میں تیاگ دیا بلکہ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور یہی ایک لمحہ اس کی پوری زندگی پر پھیل گیا۔ توحید کی ایک بوند نے اس قدر سیراب کیا کہ زندگی بھر کسی چیز کی تمنا نہ رہی۔ اپنے رب کی حکمتوں سے معمور کتاب قرآنِ حکیم اور صاحبِ کتاب نبی آخر ﷺ کی سیرت کو ساری زندگی اپنا نصب العین بنا کر زندگی گزار دی اور عرب و عجم اور یورپ و امریکا میں بھی اپنی اسی گرجدار آواز کے ساتھ بلا کسی خوف یہ پیغام پہنچاتے رہے۔ لاکھوں کا مجمع حاضر، سامعین کی سانس گم، نگاہ گم، خیال گم، گویا ان سب کی ہستی کہیں گم اور خود بھی اس حقانیت کے پیغام میں کہیں گم! ایک گرجدار آواز، منادی ہو رہی ہے کہ آؤ فلاح کا راستہ وہی ہے جو محمد عربی ﷺ نے چودہ صدیاں پہلے فرمایا تھا، اب بھی ہماری مشکلات کا حل انہی فرمان میں ہے، محبت اور حق کے اس پیغام میں ایسی آگ ہوتی تھی جو کئی دلوں پر چھائی ہوئی ظلمتوں کو راکھ کر دیتی تھی۔ پھر وہی افتخار عارف!

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر

ایک شہر میں ایک ہی در پر رکھا

وہ غنی، جس نے زندگی لٹادی اور کبھی فخر نہ کیا، فخر کیا معنی، تذکرہ ہی نہیں کیا، اپنا تو نام ہی نہیں..... سب قول ادھورے ہوتے ہیں، صرف اللہ کی کتاب سچی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے: سبھی رائیگاں، سبھی برباد، صرف اہلِ خلوص کامراں۔ خدا کی بارگاہ میں خلوص کے سوا سبھی سکے مسترد ہیں۔ ان کے طریقہ کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی ذات قول و فعل کے تضادات کی آلائشوں سے بالکل پاک تھی۔

ساری عمر خدمت اسلام اور تبلیغ اسلام کے کاموں میں مصروف رہے۔ آپ نے اپنی تحریکی زندگی کا سفر اسلامی جمیعت طلبہ پھر جماعت اسلامی سے کیا بعد ازاں تنظیم اسلامی کے امیر کی حیثیت سے آپ نے نہ صرف ایشیائی ممالک میں بلکہ عرب ممالک میں بھی رجوع القرآن کی تحریک کی احیاء کی ساتھ ساتھ مروجہ بے دین سیاسی نظام جو مسلم ممالک میں بھی رائج ہے کی سختی کے ساتھ تردید و تنقید کر کے اسلام کے نظام سیاست یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوہ کی احیاء کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ صحت کی پرواہ کئے بغیر ہر آن فعال اور متحرک، گویا رگوں میں خون کی بجائے کوئی بجلی دوڑ رہی ہے۔ دروس قرآن اور زندگی کے بے شمار عنوانات پر ایک ضخیم ذخیرہ ورثے میں چھوڑ گئے ہیں جو ان کے کام اور نام کو زندہ رکھے گا۔

جماعتی اور مسلکی عصبیتوں سے بے نیاز ہو کر آپ نے دین کی بنیادی تعلیمات کی بنیاد پر لوگوں میں دینی بیداری پیدا کی۔ آپ نہ صرف عام مسلمانوں کیلے بلکہ علماء وقت ایک اکثریت جو سیکولر سیاسی فکر سے وابستہ ہو گئے ہیں ان کیلے بھی اللہ کی برہان بنے رہے! ہمیشہ اس فکر اور درد کا برملا اظہار فرماتے رہے کہ یارب! یہ کیسی قوم ہے جو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قسمت بگاڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ قوم نہیں، یہ ایک ہجوم ہے۔ ابھی قوم اسے بننا ہے۔ ابھی اسے معلوم نہیں کہ مرعوبیت شناخت کو تباہ کر دیتی ہے، قوموں کو ابھرنے نہیں دیتی۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کی دینی، فکری، سیاسی اور سماجی خدمت کو ہمیشہ یاد رکھا جاے گا، رہا مرنے والا، تو وہ مراد پا گیا۔

ہر موت اپنے لواحقین کیلئے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے کہ جلد یا بدیر آپ نے بھی مجھے وہاں آ کر ملنا ہے۔ جہاں ہم سب بے بس اپنے مولا کی مغفرت کے منتظر ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب دنیا سے دار بقاء کی طرف تشریف لے گئے یہاں اس عارضی زندگی کی بہاروں اور گلوں کی خوشبو سے منہ موڑ کر دائمی بہار، سدا خوشبوؤں و مہک کے گلستانوں میں براجمان ہو گئے ہیں۔ اپنے ہر تعلق رکھنے والوں کو چھوڑ کر اپنے مولا کے ساتھ مضبوط تعلق و رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ پھر موت تو کوئی نئ چیز نہیں، موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ کوئی ولی۔ جو بھی آیا ہے اپنا وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ ہم سب اس کی امانت ہیں، پھر کس کی مجال جو اس میں خیانت کر سکے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي

(اے اطمینان پانے والی روح، اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا)

بروز بدھ 29 ربیع الثانی 1431ھ 14/ اپریل 2010ء

بقاء کا راستہ

پاکستان جس شخص کے تصور کی تخلیق ہے، یہ اپریل کا سارا مہینہ ہم اس کی یاد مناتے ہیں۔ اقبال کا خطبہ الہ آباد ہی اس تصور کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اقبال کی فکر نے اس برصغیر میں ایک ایسی بنیاد رکھی جس نے مسلمانوں میں جذبۂ حریت کو زندہ و تازہ کیا۔ یہ ایک لمبی بحث ہے، اس کا ذکر میں اپنے کئی مضامین میں کر چکا ہوں تاہم میں جوں جوں تحقیق کے سمندر میں غوطہ لگاتا ہوں، میں اپنی حیرانی ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کیا شخص تھا جس کی فکر سے ہر طرح کے اور ہر طبقے کے مسلمان بیک وقت متاثر تھے۔ مذہبی، انقلابی، جمہوری، قدیم و جدید، ہر طرح کے مسلمانوں کا اگر کسی پر اتفاق ہے تو وہ اقبال ہے۔

اقبال نے اسلامیانِ ہند کیلئے ایک ایسی تشکیل دے دی کہ پاکستان اس کا منطقی نتیجہ تھا اور پاکستان کیلئے آئندہ کی سمت سفر بھی اسی سے متعین ہوتی ہے ، اس وقت جب ہم ایک سیاسی بحران سے گزر رہے ہیں تو خیال آتا ہے کہ وہ کیا دورِ غلامی تھا جس میں قائدِ اعظم جیسا صاحب بصیرت سیاستدان اور اقبال جیسا فلسفی شاعر پیدا ہوئے۔ اقبال کی نگاہِ بصیرت کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ وہ بار بار اس بات کا رونا روتے تھے کہ مسلمانوں میں قیادت نہیں، پھر جب ان کی نگاہیں محمد علی جناح پر پڑیں تو بے اختیار پکار اٹھے کہ آئندہ مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ اسی شخص کو ادا کرنا ہے۔ انہوں نے کسی مولوی یا بیوروکریٹ کا انتخاب نہیں کیا۔ اس سے پہلے قیادت کے فقدان کے حوالے سے انہوں نے جو بات کی، میرا دل چاہتا ہے کہ آج اسے نقل کروں۔ فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہیں، اوّل تو یہ کہ ان میں اہم شخصیتوں کا وجود نہیں، یعنی ایسا کوئی رہنما نہیں جس کو اعانت ایزدی اور اپنے وسیع تجربے کی بناء پر یہ ادراک ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے اور دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے، یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔"

یہ ایک ایسی بات ہے جو اس وقت بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہو سکتی ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم آج کے حالات کا معروضی انداز میں تجزیہ اور اس بات کا اندازہ کریں کہ مسلم امہ کی بھلائی کس بات میں ہے۔ مملکتِ خداداد کو آگے لیجانے کیلئے کون سا راستہ اختیار کیا جانا چاہئے، کس بات میں مسلمانوں کی فلاح ہے اور کون سا راستہ تباہی کا ہے پھر جب مسلمانانِ پاکستان اس راستے پر چلیں گے تو یہی راستہ پاکستان کی بقاء کا ہو گا اور یہی مسلمانوں اور اسلام کی بہتری کا سبب بنے گا۔ اس حوالے سے اقبال کی ایک اور رائے درج کرنا چاہتا ہوں جو 1931ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں انہوں نے خطبۂ صدارت میں کہی، فرماتے ہیں:، ایسی جنگ لڑنا حماقت ہے جس میں اس امر کا امکان ہو کہ فتح کے فوائد ایسے لوگوں کو حاصل ہونگے جو ہماری جائز سیاسی خواہشات کے یا تو مخالف ہیں یا ان سے ہمدردی نہیں رکھتے"۔

یہ گویا ایک عملی فکر رکھنے والا شخص کا تجزیہ ہے، ایسی جنگ لڑنے کا فائدہ جس کے فوائد دشمن سمیٹ لے یا وہ ٹولہ حاصل کر لے جو اقبال کے الفاظ میں ہماری جائز سیاسی خواہشات کا مخالف ہو یا ان سے ہمدردی نہ رکھتا ہو، کیا اس سے بہتر کسی سیاستدان کیلئے کوئی دستور العمل ہو سکتا ہے۔ شائد یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے قائد کی شخصیت کو دیکھا اور پرکھا تو انہیں نظر آیا کہ یہ شخص ملتِ اسلامی کی امنگوں کو بھی سمجھتا ہے اور ایسا سادہ لوح بھی نہیں ہے کہ ایسی جنگ کا آغاز کر دے جس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ تصور کیجئے اس وقت مسلمانوں میں کتنے لوگ تھے مگر اقبال کی نگاہِ انتخاب محمد علی جناح پر کیوں پڑی! انہیں اس شخص میں ملت اسلامیہ کیلئے ایک ایسی جنگ لڑنے والا شخص نظر آیا جس کا فائدہ غیروں کو نہیں بلکہ اپنوں کو پہنچے گا، وگرنہ کتنے لوگ تھے جو آزادی کے نام پر ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا نتیجہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ کسی اور کو پہنچنے والا تھا۔

اسی کے ساتھ اقبال نے جو دوسری بات کہی ہے وہ سونے میں تولنے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہم میں اطاعت گزاری کا جذبہ ختم ہو گیا۔ اقبال جہاں قیادت کو دیکھتے تھے وہاں یہ بھی چاہتے تھے کہ عوام الناس اس قائد کی اطاعت بھی کریں، خلاصہ اس بات کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جنگ میں؛

1۔ ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو ہمارے مقصد کی روح کو پہچانتی ہو اور ہماری منزل کا ادراک رکھتی ہو۔

2۔ عوام میں اس جذبے کی ضرورت ہے جو انہیں اطاعت اور ڈسپلن کا عادی بنائے۔

3۔ اور ساتھ ہی اس احساس کی ضرورت ہے کہ جنگیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے کیلئے نہیں لڑی جاتیں

یہ میں کوئی مجرد یا فلسفیانہ بات نہیں کر رہا، دوجمع دو چار کی طرح یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہمیں اقبال کی طرح معاملات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال اس زمانے کے جامد مذہبی فکر کے مقابلے میں یہ سمجھتے تھے کہ ایسی جمہوریت میں ہمارے مسائل کا حل ہے جو اسلامی فلاحی اصولوں پر مبنی ہو۔ وہ یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ اگر مسلمان قیادت مسلمان عوام کا مقدر نہ بدل سکی تو ان سے ناامیدی پیدا ہو گی۔ عام معنوں میں وہ غریبوں کی زندگی بدلنا چاہتے تھے ۔ وہ اعتدال، بے تعصبی اور رواداری کی تلقین کرتے تھے۔ فرقہ واریت، علاقائیت حتیٰ کہ قومیت پرستی کے اس تصور کے بھی مخالف تھے جو مسلمانوں کو بانٹ دے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک متحد اور جدید قوم کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، وہ پاپائیت کے خلاف تھے، انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت ایک جدید، لبرل اور ترقی پسند شخص قائداعظم کے حوالے کی، لیکن یہاں اس بات کو بھی ذہن نشیں کرنا چاہئے کہ ہمیں جدید، لبرل اور ترقی پسندی کے نام پر سب سے زیادہ فاسق کمانڈو پرویز مشرف اور اس کے قادیانی ساتھیوں نے برباد کیا۔

کیا ہم اسی راستے پر چل پڑے ہیں جو حکیم الامت اقبال نے بتایا تھا اور قائداعظم نے جس پر چل کر دکھایا تھا۔ عالمی حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم صورتحال کو سمجھیں، ہماری مشرقی اور مغربی سرحدوں کا جو نقشہ ہے، دنیا کی نظریں جس طرح ہم پر لگی ہوئی ہیں، ہماری معاشی مشکلات ہمیں جس طرح جکڑے ہوئے ہیں اور ملک کے اندر جس طرح ہمارے موجودہ حکمرانوں نے کرپشن، مہنگائی اور لاقانونیت کے طوفانِ بدتمیزی برپا کئے ہوئے ہیں، اب تو اور ضروری ہو گیا ہے کہ علامہ اقبال اور قائد جیسی بصیرت کے حامل افراد آگے بڑھیں اور جنگی بنیادوں پر ملک کی شکستہ کشتی کو محفوظ

کناروں تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھائیں۔ ہمیں وہ قیادت درکار ہے جو صائب اور ایماندار ہو، جس کا دامن ہر قسم کی ہوس، لالچ، کرپشن اور ملکی لوٹی ہوئی دولت کے الزامات سے مبراہو، پھر ایسی قیادت کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

اب آپ ایمانداری سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ اقبال اور قائداعظم کے اس پاکستان میں موجودہ حکومت کے مقتدر افراد کسی بھی لحاظ سے قیادت وسیادت کے حقدار ہیں؟ قائداعظم اور اقبال تو ہمیشہ انصاف اور قانون کی علمبرداری کا سبق دیتے رہے لیکن موجودہ حکومت انصاف کے سب سے بڑے سمبل،،اعلیٰ عدلیہ،، کے تمام احکامات کی تضحیک محض اس لئے کر رہی ہے کہ وہ ہر حال میں ملک کے صدر آصف زرداری کو قانون سے بالاتر سمجھتی ہے ۔ وہ اس بات کا جواب دینے سے بھی قاصر ہے کہ وہ شخص جو آج سے چند سال پہلے ایک متوسط درجے کا شہری تھا آخر کس طرح وہ ملک کا سب سے زیادہ دولت مند بن گیا، ملک کی اربوں روپے کی لوٹی ہوئی رقوم جو بیرونِ ملک کے بینکوں کے اکاؤنٹس میں کس طرح منتقل ہو گئیں؟ ملک کے کروڑوں روپے بے نظیر کے قتل کی تحقیقات پر صرف کر دیئے اور اب اس کی رپورٹ پاکستانی عوام سے کیوں چھپائی جا رہی ہے؟ اب ایک دفعہ پھر ملکی اداروں سے از سرِ نو قتل کی تحقیقات شروع کرانے کا عندیہ دیا جا رہا ہے، آخر اس خونِ ناحق سے کس کو بچانے کی کوشش کی جارہی ہے؟ کہیں اس قتل کے خون کے چھینٹے.........؟

ہاتھوں پہ کوئی دھبہ نہ دامن پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو یا کرامات کرو ہو

میں بہت مؤدبانہ اپنی اعلیٰ عدلیہ سے بھی یہ بھی درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ کرپشن کے ہزاروں مقدمات اس وقت زیرِ سماعت ہیں، کیا ان مقدمات پر بھی اتنی ہی توجہ دی جارہی ہے جس قدر سوئس مقدمات کا چرچا ہے؟ قوم تو احتساب بلاامتیاز دیکھنا چاہتی ہے اور ایسا دکھائی بھی دینا چاہیئے، اگر ایسا ہو جائے تو کم از کم عدلیہ کی کارکردگی کو تحسین کی نگاہوں سے ضرور دیکھا جائے گا!

حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنی چاہیئے جس کا فائدہ ہمیں پہنچے، ان کو نہ پہنچے جو ہماری جائز سیاسی خواہشوں کے مخالف ہیں اور اس سے ہمدردی نہیں رکھتے!

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے

بروز جمعتہ المبارک 2 جمادی الاوّل 1431ھ 16/اپریل 2010ء

ہمارا اقبال

علامہ اقبال بلاشبہ ان مفکرین میں سے ہیں جو کہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فلسفے اور افکار کی بنیاد پر ان اذہان کی صفوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی فکر اور فلسفہ صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کے بعد ایک مجدد پیدا ہوتا ہے جو اپنے افکار اور جستجو سے مسلم امہ میں روحِ عیسیٰ پھونکتا ہے، جس سے احیائے اسلام ہوتی ہے اور ملت اسلامی نئے جذبے اور عزم کے ساتھ عصری تقاضوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ برصغیر میں مجدد الف ثانی کے بعد علامہ اقبال کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنی سوچ و فکر کی بناء پر امہ کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، گو کہ اقبال بیسویں صدی کے شاعر تھے لیکن ان کا فکر و پیام آج بھی قوموں کی رہنمائی اور بلندیوں تک رسائی کیلئے کارگر ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ہماری دسترس میں ابلاغ کے بے پناہ ذرائع اور تحقیق کیلئے بے پناہ وسائل موجود ہیں، اس کے باوجود ہم اب تک افکارِ اقبال کے اصل اسرار ڈھونڈنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کی فکر و فلسفہ اس سمندر کی مانند ہے جس کی تہہ میں ایک پوری کائنات پوشیدہ ہے اور اس تہہ کی رسائی کیلئے ایک ذہن رسا اور عزمِ صمیم چاہئے۔

اقبال نے جس دور اور ماحول میں آنکھ کھولی، جن حالات میں پرورش پائی، اپنے آس پاس جن تہذیبی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ دیکھی، والدین کی تربیت کے بعد گھریلو معاشی حالات و واقعات نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی ، اگرچہ ان کی حکومت پورے ہندوستان پر کبھی بھی نہیں رہی لیکن اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے کثیر علاقے پر وہ حکمران رہے، یہی وجہ ہے کہ انگریز کے دورِ غلامی میں بھی مسلمانوں میں ایک قسم کا احساسِ برتری تھا اور وہ اپنی زبوں حالی کا مداوا اپنے شاندار ماضی کو یاد کر کے کیا کرتے تھے حالانکہ اب حالات بہت بدل چکے تھے اور مسلمان معاشی طور پر بہت کمزور ہو گئے تھے اور نئے آقا انگریز عسکری اور علمی لحاظ سے ان سے برتر تھے اور اپنی حکمت عملی سے نہ صرف اپنی حکومت کو وسیع کر لیا تھا بلکہ اپنے مدمقابل حریف پرتگیزی اور فرانسیسیوں کو بھی پسپا کر کے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جن مقامی لوگوں نے مزاحمت کی، ان میں مسلمان پیش پیش تھے۔ ہندوستان کے لوگوں نے اسے ،،جنگِ آزادی،، کا نام دیا اور انگریزوں نے ،،بغاوت،، قرار دیا۔ انگریزوں نے اس بغاوت کیلئے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور مشکوک مسلم زعماء کو چن چن کر قتل کیا اور معاشی لحاظ سے مسلمانوں کو غریب تر بنا دیا، اس جنگ کی ناکامی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں مایوسی اور بد دلی انتہا کو پہنچ گئی۔

قطع نظر اس کے کہ یہ بغاوت تھی یا جنگِ آزادی، یہ مزاحمت یا خروج ناعاقبت اندیشی بے ثمر غم و غصہ پر مبنی تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں دو قسم کے نمایاں ردِ عمل پیدا ہوئے۔ ایک طبقہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کی اسلام سے دوری ہے۔ وہ نہ قرآن پر عمل پیرا ہیں، نہ اسلامی اساسی اقدار سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ دوسرے طبقے کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب جدید تعلیم سے عدم دلچسپی اور دوری ہے، وہ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں حاصل نہیں کر پاتے، ان میں دنیاداری کی بھی فراست نہیں ہے اور وہ انگریزی حکومت سے اچھے تعلقات بھی نہیں رکھ رہے، اس طبقے کی نمائندگی سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کر رہے تھے۔

ان دو نظریات کے باعث برصغیر کے مسلمانوں پر دو اثرات مرتب ہوئے، ایک تو انہوں نے اپنے بچوں کو قرآنی تعلیم دلوانے اور اسلامی ثقافت پر عمل شروع کر دیا کہ وہ کہیں انگریزی ثقافت میں نہ رنگے جائیں، دوسرا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور کچھ لوگوں نے جدید علوم اور سائنس کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینا شروع کر دی کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مقابلے کی سکت نہیں رکھتے، ان کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ انگریزوں کی حکومت کو تسلیم کر لیں اور وہ علوم حاصل کریں جن کے ذریعے ان کو ملازمت مل سکے اور وہ معاشی طور پر خوشحال ہو جائیں۔ مثبت سوچ رکھنے والا اہلِ علم طبقہ جو تاریخ انسانی اور اسلامی ثقافت سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت صدیوں کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یورپ کئی صدیوں سے غور و فکر کی نئی راہوں پر چل کر ہی کامرانی کی اس منزل پر پہنچا ہے اور تحریکِ احیائے علوم سے جدید یورپ کا آغاز ہوا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اقبال اپنے دورِ طالب علمی میں سر سید احمد خاں کی تحریک سے اپنے استاد میر حسن کے توسط سے واقف ہوئے تھے، چونکہ وہ شروع ہی سے مفکرانہ ذہن رکھتے تھے اس لئے نئے افکار پر توجہ دیتے تھے اور پھر وہ اپنے دور کے علمی اور معاشرتی ماحول کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی اور معاشی حالات کے اثرات سے اقبال جیسا حساس نوجوان بے نیاز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اقبال کے سامنے معاشی ناہمواری کے مناظر تھے، یہی وجہ ہے کہ عوام الناس کی بہتر زندگی کے بارے میں سوچنے کے نتیجے میں ان کی جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی، وہ اقتصادیات کے موضوع پر تھی،، علم الاقتصاد،، نام کی یہ کتاب 1903ء میں پیسہ اخبار لاہور کے دو سو صفحات پر مشتمل تھی۔

اقبال کی اس کتاب کا مرکزی نقطہ یا انسدادِ مفلسی ہے۔ اقبال جیسے انسان دوست نے اس دور میں غربت کی سنگینی کو محسوس کیا اور وہ جانتے تھے کہ جن ملکوں میں غربت ہے، وہاں جرائم بڑھتے ہی جائیں گے۔ اس دور کا سوچئے جب یہ کتاب لکھی گئی اور پھر آج پر نظر دوڑایئے کہ غربت ختم کرنے کا یہ پروگرام تقریباً ہر غریب اور ترقی یافتہ ملک میں نافذ کیا جا رہا ہے، تمام مہذب انسانوں کی یہی خواہش ہے کہ دنیا سے مفلسی ختم ہو جائے۔ اقبال کے ذہن رسا اور نگاہِ دوررس کی داد دینی پڑتی ہے کہ حالات کے تغیرات کو دیکھ کر مستقبل کی تصویر کو واضح کرنے کی سعی کی۔

اقبال کی سوچوں کے دھاروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کیلئے ان کی شاعری اور مقالات، جو وہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر لکھتے رہے، اس میں "الارضُ للہ "کی تفسیر، انسانیت، مردِ کامل کا تصور، نفس، تصوف، اشرف المخلوقات کا کردار، عظمتِ انسان اور انسان دوستی، وحدت الوجود، یورپ کی مادیت پرستی، مناظرِ فطرت، فلسفہ خودی، نظریہ خود آفاقیت، سماجی جمہوریت، غیر استحصالی معاشی نظام، سیاسی وطنیت، مسلم امہ کی حالتِ زار غرضیکہ نظریہ انسان دوستی کے تحت اقبال نے کتنے ہی ایسے تشکیلی عناصر گنوائے ہیں جو اس موضوع کو سمجھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ آج ہم اقبال کی

شاعری اور افکار پر اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں تو یہ کہتے ہوئے بالکل نہیں جھجکتے کہ بیسویں صدی تو اقبال کی صدی تھی ہی، اکیسویں صدی بھی علامہ اقبال کی معلوم ہوتی ہے۔ اس خطے کے کسی مفکر نے دنیائے اسلام پر اتنا اثر نہیں چھوڑا جتنا کہ علامہ اقبال کے فلسفہ، فکر اور شاعری نے چھوڑا ہے۔

مشرق اور مغرب کے علوم کا گہرائی سے مطالعہ کرنا، دنیا کے بڑے بڑے مذہبی مفکرین سے علامہ اقبال کی براہِ راست واقفیت، دورِ جدید کے مغربی افکار پر ان کی تنقیدی نظر، مغرب کی اعلیٰ درسگاہوں میں حصولِ علم اور اہلِ علم سے تبادلہ خیالات کی وجہ سے ان کو وہ وسعتِ نظری اور فکری گہرائی عطا ہوئی جس نے بلاشبہ ان کو بیسویں صدی کا سب سے نمایاں مسلم مفکر بنا دیا ہے

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں!

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ تو غارت گرِ باطل بھی تو

اقبال انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا کے تاریخی حقائق اور زمینی حقائق کو حرفِ آخر نہیں مانتے بلکہ انسان کو انقلاب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ شرفِ انسانیت اور مساواتِ انسانی کو انقلاب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ شرفِ انسانیت اور مساواتِ انسانی کے قائل ہیں اور ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جہاں ہر انسان کو احساسِ شخصیت ہو، جہاں ہر انسان باوقار ہو۔ وہ انسان کے ارتقاء کے لامحدود امکانات کے قائل ہیں، ایسے امکانات جس کے دروازے عمل سے وا ہوتے ہیں اور اسی بے عملی کو ایک اضطراب کی صورت میں نمودار دیکھنا چاہتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اگرچہ اقبال کے تصورِ خودی میں آفاقیت ہے اور ان کا پیغام تمام نوعِ انسان، ہر نسل، ہر خطے اور ہر مذہب کے انسانوں کیلئے ہے اور ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں لیکن مثنوی "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں انہوں نے ملت اسلامیہ کے مسائل بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی بدحالی، معاشی ابتری اور سیاسی محکومی کو مدنظر رکھا لیکن دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک الگ ریاست کا خواب بھی دیکھا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے 27 رمضان المبارک کی تقدس بھری رات کو پاکستان جیسی ریاست کو معجزاتی طور پر نمودار کیا۔
یہ تھے ہمارے اقبال جن کی دورس نگاہوں نے بروقت خواب دیکھا جس کی تعبیر محمد علی جناح کے ہاتھوں ہوئی!
رہے نام میرے رب کا جس نے پاکستان جیسی نعمت سے نوازا!

بروز اتوار 4 جمادی الاوّل 1431ھ 18/ اپریل 2010ء

کشمیر۔ عمل اور ردّ عمل

"کشمیر میں جو شورش برپا ہے، فوج اس پر قابو نہیں پا سکتی بلکہ اس مسئلہ کو سیاسی انداز میں حل کرنا چاہئے۔" یہ بیان بھارت کے چیف جنرل وی پی ملک نے ستمبر 2000ء میں اپنی ریٹائرمنٹ سے چند روز پہلے دیا تھا۔ ان کے جانشین جنرل ایس پدمنا بھن نے نہ صرف مذکورہ بالا رائے کی تائید و توثیق کی تھی بلکہ اس زمانے کے وزیرِ اعظم واجپائی سے یہ سفارش بھی کی کہ فائر بندی کی مدت میں توسیع کر دی جائے۔ جنرل وی پی ملک اس بات سے انتہائی برہم اور پریشان تھے کہ معرکہ کارگل کے دوران ایک انفینٹری بریگیڈ نے پاکستان کی ایک کمپنی پر جو "کافر پہاڑ" کے علاقے میں مورچہ بند تھی، یکے بعد دیگرے تین حملے کئے، وہ تینوں بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئے اور اسی ایک آپریشن میں بھارت کے ایک ہزار "سورما" لقمہ اجل بن گئے جن کی لاشیں اٹھانے کیلئے اقوامِ متحدہ سے مداخلت کی اپیل کی گئی۔

اس چوکی کو واپس لینا بھارتیوں کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا، کیونکہ اس پوزیشن کی بدولت سیاچین والی کنٹرول لائن پر پاک فوج کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ادھر سیاچین پر مقیم بھارتی فوج کے پاس مٹی کا تیل بالکل ختم ہو جانے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر سپلائی بحال کروانا ناگزیر ہو گیا تھا بصورتِ دیگر وہ لوگ سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتے۔ انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ بھارتی دستے یا تو اس پوزیشن سے دستبردار ہو جائیں گے یا ہتھیار ڈال دیں گے کیونکہ وہ برف کو پگھلا کر اتنا پانی نہیں بنا سکتے تھے جو کھانا پکانے اور پینے کی ضروریات پوری کر سکے۔ انہوں نے ذاتی طور پر مداخلت کی اور 155 / ایم ایم کی ساری بوفرز توپیں شمالی کمانڈ میں اکٹھی کر لیں۔ نو دس گھنٹے زبردست قسم کی شیلنگ کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارتی فوج کو بھاری نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ جنرل ملک پیشہ وارانہ لحاظ سے بھارت کے بہترین جرنیلوں میں سے تھے لیکن فدائین نے ان کے پچھلے مورچوں اور مواصلاتی رابطوں پر تابڑ توڑ حملے کر کے انہیں حد سے زیادہ پریشان بلکہ حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ کارگل کے معرکے میں اپنے جوانوں کی ناقص کارکردگی سے بھی مایوس اور افسردہ تھے، دراصل کشمیر میں نبرد آزما ساری انڈین آرمی کا مورال انتہائی پست ہو گیا تھا۔

یہ سارے عوامل ان کے محولہ بالا بیان کا سبب بنے، ان کے اخذ کردہ نتائج اور سفارشات کی جموں میں مقیم اس میڈیکل کمیشن نے بھی تائید کی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں بھارتی حکام کو خبردار کیا تھا کہ اگر کشمیر میں مورچہ بند افواج کو فوری طور پر واپس بلا کر ذہنی سکون اور راحت کا موقع فراہم نہ کیا گیا تو ان میں اکثریت نفسیاتی مریض بن جائے گی یا وہ لوگ پرلے درجے کی سرکشی و نافرمانی پر اتر آئیں گے اور ان فوجیوں کے درمیان خودکشیوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ رپورٹ میں اس امر کی بھی نشاندہی کی گئی تھی کہ فوجیوں کی بھاری تعداد میں بھگوڑا ہونے، منظور شدہ چھٹی سے زیادہ ٹھہرنے، چھٹی لئے بغیر غیر حاضر رہنے، سنیئر افسروں کی اعلانیہ حکم عدولی اور خود اپنے افسروں کو قتل کرنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہیں بار بار کشمیر میں تعینات کیا جاتا ہے۔ جنسی خواہش کے ستائے ہوئے بھارتی سپاہی یا تو اغلام بازی میں ملوث ہوتے ہیں یا مسلمان کشمیری عورتوں کے ساتھ جبراً زیادتی کر کے اپنی خواہش کی تسکین کرتے ہیں۔

کشمیر میں تعینات یونٹوں کا ہر ایک سپاہی بلا استثناء یہاں گزرنے والے دنوں کو تضیع الاوقات سمجھتا ہے اور گشت کے دوران کشمیری مجاہدین کے ساتھ مڈبھیڑ سے دانستہ گریز کرتا ہے۔ سب سے زیادہ پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ افسروں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے اور اس وقت افسروں کی پندرہ ہزار آسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں، جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ دل کش مالیاتی پیشکش کے باوجود کوئی نیا افسر فوج میں بھرتی ہونے کو تیار نہیں، دوسرے حاضر سروس افسران میں اس وجہ سے خاصی بد دلی پائی جاتی ہے۔ محض ڈیڑھ دو برس کے بعد ان کی کشمیر میں از سرِ نو تعیناتی کیلئے باری آجاتی ہے۔ انہی وجوہات کی بنیاد پر بھارت کے چیفس کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر کشمیر میں فوجی آپریشن ختم نہ کئے گئے تو افسروں کو بار بار کشمیر میں بھیجنے سے ان کا مورال اس حد تک پست ہو جائے گا کہ بھارتی فوج بحیثیت لڑاکا مشینری شائد "مکمل طور" پر ختم ہو جائے۔

1989ء میں کشمیر کی تحریکِ آزادی میں اس وقت نئی جان پڑ گئی جب مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ہزاروں مجاہدین جنہوں نے روس کے خلاف جہادِ افغانستان میں حصہ لیا تھا، روسی افواج کی واپسی کے بعد جہادِ کشمیر میں حصہ لینے کی غرض سے اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ شامل ہو گئے ۔ وہ سب اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اپنے وطن کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرانے کی بس یہی ایک صورت ہے کیونکہ بھارت نے 1987ء کے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کا ارتکاب کر کے کشمیر پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی تھی۔ جنرل ملک کے زمانۂ سپہ سالاری کے دوران فدائین کے خود کش حملوں میں زبردست شدت پیدا ہو گئی اور وہ 1999ء میں نقطۂ عروج کو پہنچ گئی، اس سے بھارتی فوجیوں میں بد دلی اور سراسیمگی پھیل گئی اور ان کے چہروں پر مردنی چھا گئی کیونکہ ان کیلئے مجاہدین اور عام کشمیری نوجوانوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا جو صورت و شکل میں بھی یکساں تھے اور ان کا لباس بھی ایک جیسا تھا۔

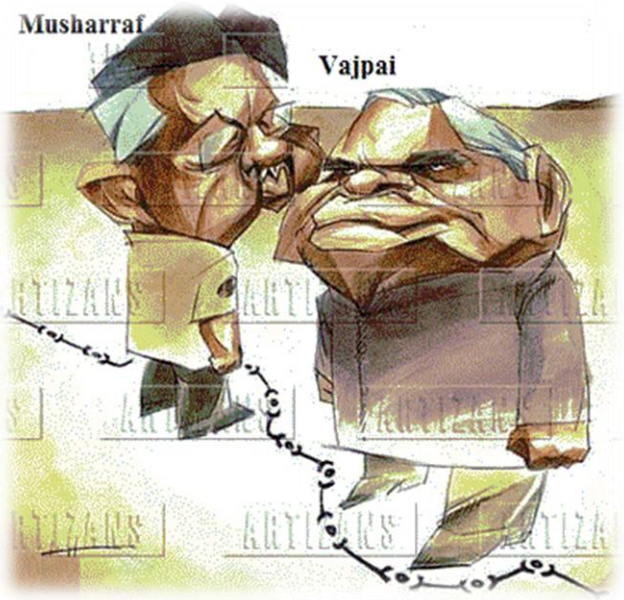

جنرل ملک نے اپنی ملازمت کا زیادہ عرصہ شمالی کمانڈ میں گزارا، اور کشمیر کی سورتحال کا بڑی گہرائی و باریک بینی سے مطالعہ اور جائزہ لیا۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کی توثیق بارڈر سیکورٹی فورسز کے جنرل نے بھی کی جس نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ "پہلے ہم جنگوں میں مجاہدین کا تعاقب کیا کرتے تھے آج کل وہ چھاؤنیوں میں ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔" جنرل ملک اپنے زمانے کے وزیر اعظم واجپائی کے ساتھ الوداعی ملاقات میں کشمیر کے متعلق ان کی رائے پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے اور انہیں قائل کر لیا کہ جنگ بندی اور سیاسی مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر کا فوری حل تلاش کیا جائے ورنہ اس سے چند دن پہلے تک واجپائی کی پاکستان دشمنی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے نیویارک میں بھارتی شہریوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اپنے آئندہ مکروہ عزائم کا اظہار یوں کیا تھا:

"اگر آپ لوگوں نے آئندہ الیکشن میں میری پارٹی کو دو تہائی اکثریت دلادی تو ہم بہت سے بابری مساجد مسمار کر کے ہزاروں نئے مندر تعمیر کریں گے۔"

واجپائی جنرل ملک کے ساتھ میٹنگ کے بعد کئی ہفتے سو نہیں سکے جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک مضمون میں کیا جو 2 اور 3 جنوری 2001ء کو روزنامہ "ہندو" میں "کمارا کم سے میری محویت" کے زیرِ عنوان شائع ہوا، جس میں انہوں نے لکھا تھا "ان کی حکومت عرصہ دراز سے معرضِ التوا میں پڑے ہوئے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے جرأت مندانہ اقدامات کرنے کو تیار ہے۔" ان کے مضمون میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ بھارت کسی بھی سطح پر مذاکرات کرنے پر آمادہ ہے بشرطیکہ پاکستان کی طرف سے بھی مثبت جواب ملے اور وہ بامقصد بات چیت کیلئے خوشگوار ماحول پیدا کرنے میں تعاون کرے۔"

واجپائی اس وقت 80 برس کے ہو گئے تھے اور وہ آج بھی ایک منجھے ہوئے سیاستدان مانے جاتے ہیں بلکہ بعض بھارتی دانشور انہیں نہرو سے بڑا سیاستدان سمجھتے ہیں۔ انہیں جولائی 2001ء میں آگرہ میں مشرف کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا جس کے دوران انہوں نے محسوس کیا کہ نواز شریف کے مقابلے میں مشرف کے ساتھ معاملہ کرنا کوئی اتنا مشکل نہیں۔ 9 ستمبر کے بعد مشرف کو امریکا کے زبردست دباؤ میں دیکھ کر واجپائی نے کشمیر سمیت تمام تنازعات پر مذاکرات کی پیشکش کر دی۔ ان کی اس پیشکش کا نہ صرف پاکستان کی طرف سے مثبت جواب ملا بلکہ امریکا نے بھی اسے سراہا۔ واجپائی کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اس سمت میں قدم اٹھانے سے ان کی پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا۔ پاکستان کو مذاکرات کی دعوت دینے اور حالات میں خوشگوار تبدیلی محسوس کرنے کے بعد انہوں نے مقررہ مدت سے چھ مہینے پیشتر عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا تاکہ دوبارہ منتخب ہو کر کشمیر کا کوئی حل تلاش کر سکیں۔

جنرل مشرف ہندو بنئے کی اس چال کو نہ سمجھ سکے، وہ ضرورت سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ واجپائی کی پیشکش کا خیر مقدم کرتے ہوئے دوستی کا ایسا ہاتھ بڑھایا کہ انہیں اس بات کا پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس کی آڑ میں انہوں نے مسئلہ کشمیر کا کس قدر بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ فوری طور پر کنٹرول لائن پر سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا جس کی وجہ سے مجاہدین کی تحریک پر بڑا برا اثر پڑا، اور ان کے حملوں میں خاصی کمی آ گئی۔ جنرل ملک نے واجپائی کو قائل کر لیا تھا کہ اگر بھارت نے پاکستان کو کنٹرول لائن پر فائر بندی پر آمادہ کر لیا تو ہم آدھی جنگ جیت جائیں گے، اور یہ کہ اس دوران ہم پوری کنٹرول لائن کے ساتھ ساتھ باڑ تعمیر کر لیں گے اور اس طرح مجاہدین کو گھیرے میں لیکر کچلنا آسان ہو گا۔ بھارت نے پاکستان کی طرف سے فائر بندی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دن رات ایک کر کے کنٹرول لائن کے ساتھ باڑ مکمل کر لی۔

دوسری طرف ایسے دیہاتوں میں فوجی آپریشن شروع کر دیا جہاں سے مجاہدین کو افرادی قوت، نیز اخلاقی اور مالی مدد ملتی تھی۔ اس آپریشن کے دوران ہزارہا بچوں، بوڑھوں اور ان نوجوان خواتین کو تہ تیغ کر دیا گیا جو جبراً زیادتی کے خلاف مزاحمت کرتی تھیں۔ حکومتِ پاکستان نے حالات کو بہتر بنانے کی خواہش میں ان انسانیت سوز مظالم سے اس طرح صرفِ نظر کیا کہ انہیں عالمی پریس، یو این او، ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ذریعے منظر عام پر لانے کی قطعاً

کوئی کوشش نہیں کی۔ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے، ان تمام حالات کے بعد اب وہاں کے کشمیری نوجوانوں نے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ اگر افغانستان سے روس ور امریکا کو وہاں کی عوام شکست دے سکتی ہے تو بھارت تو ان دونوں سپر طاقتوں سے زیادہ طاقتور اور مضبوط نہیں۔ میرا وجدان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اگلے چند سالوں میں اس خطے کے تمام مظلوم عوام کو ہندو استعمار سے نجات مل جائے گی اور اس کا آغاز ماؤ علیحدگی پسندوں کے حالیہ حملوں سے ہو گیا ہے۔

رہے نام میرے رب کا جو مظلوموں کا ساتھ دینے کا حکم دیتا ہے!

بروز منگل 6 جمادی الاوّل 1431ھ 20/ اپریل 2010ء

رازِ ملوکانہ

عام آدمی تو یہی سوچتا ہے کہ اقوامِ مغرب مسلمانوں کی موجودہ حالت سے بڑی پریشان ہیں، یہ اقوام چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کو موجودہ دور کی ترقی میں برابر کا شریک کیا جائے اور ان کا معیارِ زندگی بہتر بنایا جائے لیکن باطن میں ان کے ارادے یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے کاٹ دیا جائے۔ ان کی اسلامی اقدار غیر محسوس طریقے سے ختم کر دی جائیں اور انہیں مغربی تہذیب و تمدن میں رنگ دیا جائے۔ ان کے ہاں تعلیم ذریعہ تجارت ہے جس کے راستے سے وہ مسلمانوں میں اثر و نفوذ پیدا کرتے ہیں، ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہ ثابت کریں کہ مسلمان صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ہی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ مغربی اقوام پچھلے سو سال سے بیشتر مسلمان ممالک پر قابض رہے اور انہوں نے انہی میں سے ایک بہت بڑی کھیپ تیار کر لی جو ان کے مقاصد پورا کرنے کیلئے کوشاں نظر آئی، بقول اقبال:

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

، لیکن ان اقوام کا حال تو یہ ہے کہ ایک ہاتھ سے تو بزعم خود غیر ترقی یافتہ اقوام کی کثیر رقوم سے قرضوں یا امداد کی صورت میں مدد کرتے نظر آتے ہیں دوسرے ہاتھ میں بھی کبھی ماہرین کی شکل میں، کبھی ٹیکنالوجی فراہم کرنے سے اور کبھی ان ممالک کے افراد کو اپنے ممالک میں تربیت کا انتظام کرنے کے بہانے ان رقوم کا بہت بڑا حصہ واپس لیجاتے ہیں اور قرضوں کا بوجھ اس قوم پر پڑ جاتا ہے اور انہیں محکومی کی ایک دوسری صورت میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے مغرب میں تعلیم کے حوالے سے فرمایا:

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر کرتے

نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو

ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب

سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

11 ستمبر کے واقعات کے بعد ملت اسلامیہ کس جال میں پھنس گئی ہے۔ مسز مارگریٹ تھیچر جب برطانیہ کی وزیرِ تعلیم تھیں، ان سے کسی نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے کہ برطانیہ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں غیر ملکی طلباء کی اکثریت کو داخلہ دیا جاتا ہے اور اپنے طلباء ان اداروں میں بہت کم داخل ہو پاتے ہیں؟ مسز مارگریٹ تھیچر نے جواب دیا کہ ہمیں علم ہے کہ ملک کو کس قسم کی افرادی قوت کی ضرورت ہے، ہمیں زیادہ تر تکنیکی افرادی ضرورت ہے جس کیلئے ملک میں بہت سے ٹیکنیکل ادارے موجود ہیں۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد یعنی پی ایچ ڈی وغیرہ کا تعلق ہے جنہیں تحقیقاتی اداروں یا جامعات میں جانا ہوتا ہے وہ کم تعداد میں درکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ایک پی ایچ ڈی اسکالر تیار کرنے کیلئے ہمیں اپنے قومی خزانے سے لاکھوں پاؤنڈ خرچ کرنے پڑتے ہیں اور وہ رہائش و خوراک پر خاصی رقم خرچ کرتے ہیں، یہ ہمارے لئے فارن ایکسچینج کا بہت اہم ذریعہ ہے، دوسرے یہ طلباء ہمارے ہاں تعلیم کیلئے کئی سال گزارتے ہیں، جب یہ اپنے ملک واپس جاتے ہیں تو بہت سی ہماری اقدار ساتھ لیجاتے ہیں اور اپنے ہی ملک میں ہمارے بلا تنخواہ سفیر ہوتے ہیں۔

نو آبادیاتی، استعماری حکومتوں کا یہی طریقہ کار رہا ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ ترقی پذیر ممالک کے طلباء کو تعلیمی وظائف دیتے ہیں۔ اس کیلئے نوخیز طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے، ان کیلئے ہر قسم کی آسائش کا خیال رکھا جاتا ہے اور خاصی بڑی رقم بطور وظیفہ دی جاتی ہے جس سے وہ شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب یہ طلباء کامیاب ہو کر اپنے ملک واپس جاتے ہیں تو کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ایسے عہدوں پر فائز ہوں کہ وہ حکومتی فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں اور استعماری قوتوں کے مفادات کی حفاظت کر سکیں۔ اگر ہم گردوپیش کے حالات کا بنظر غائر جائزہ لیں تو اعلیٰ عہدوں پر فائز بہت سے افراد غیر ملکی آقاؤں کے غم خوار نظر آتے ہیں، ملکی مفاد کی بجائے اپنے اور آقاؤں کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک سے طلباء کی کثیر تعداد حصولِ علم کیلئے ترقی یافتہ ممالک کی طرف رجوع کرتی ہے، ان میں طلباء کی بہت بڑی تعداد مسلمان ممالک سے آتی ہے۔ یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ کسی بھی مسلمان ملک سے آنے والے طلباء کو ملک سے باہر جانے سے قبل کسی قسم کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی کہ ان کی نظریاتی بنیاد کیا ہے؟ علم کے کس شعبہ میں انہیں تربیت حاصل کرنا ہے، دورانِ تعلیم انہیں کس قسم کے معاشرتی ماحول سے واسطہ پڑے گا اور اپنے ملک کے سفیر کے لحاظ سے کیسا رویہ اختیار کرنا ہو گا۔ چاہئے تو یہ کہ اس ملک کی وزارتِ تعلیم طلباء کی روانگی سے قبل ان کی تربیت کا کوئی شارٹ کورس کا بندوبست کرے۔ ہوتا یہ ہے کہ اکثر طلباء اس ملک کی معاشرت میں رنگے جاتے ہیں، ان ممالک کی بری عادات و اقدار کو اپنا لیتے

ہیں اور نہ صرف اپنی اقدار کھو دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پاتے اور زندگی کی قیمتی سال ضائع کر کے خود اپنی ذات کے علاوہ اپنے ملک کا سرمایہ بھی ضائع کرنے کے موجب بنتے ہیں۔

اس وقت ملائشیا ایک واحد ملک ہے جہاں سے طلباء کی کثیر تعداد حصولِ تعلیم کیلئے برطانیہ آتی ہے گو ہر سال ان طلباء کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے کہ اب وہاں کی یونیورسٹیاں تعلیمی معیار کے لحاظ سے کسی بھی طور سے یہاں کی یونیورسٹیوں سے کم نہیں۔ ملائشیا کی وزارتِ تعلیم ان تمام طلباء کی فہرست بناتی ہے جنہیں ہر حال میں ملک سے باہر اپنی اعلیٰ تعلیم کیلئے جانا ہوتا ہے۔ جانے سے پہلے ان کو باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد ملائشیا کی طلباء کی تنظیم جو برطانیہ میں بڑی فعال ہے، ان کو ان تمام نئے آنے والے طلباء کی فہرست ارسال کر دی جاتی ہے۔ جب یہ طلباء لندن پہنچتے ہیں تو ملائشیا کے سفارت خانے کے یک بڑے ہال میں جمع ہوتے ہیں جہاں طلباء اور طالبات کا قیام وطعام کا علیحدہ علیحدہ بندوبست ہوتا ہے۔ وہ طلباء چند روز وہاں قیام کرتے ہیں جہاں انہیں اس نئے ماحول کے بارے میں مکمل آگاہی کے ساتھ مختلف یونیورسٹیوں میں نئے رابطوں کے ساتھ مطلع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد برطانوی جامعات میں پہلے سے موجود ملائشین طلباء کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں فلاں طلباء آپ کی جامعہ میں آرہے ہیں، ان کی دیکھ بھال اب آپ کے ذمے ہے، نتیجتاً جب یہ طلباء تعلیم مکمل کر کے واپس ملک جاتے ہیں تو بہت کارآمد شہری بن کر واپس لوٹتے ہیں۔

یہی طلباء اب ملک کے تقریباً تمام اداروں کا انتظام وانصرام سنبھالے ملک کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں بہت سے حکومت کے بہت ہی اہم عہدوں پر فائز ہیں اور ان میں سے بہت آج ملک کی یونیورسٹیوں میں تدریسی ذمہ داریاں بہ احسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اور انہی طلباء کی محنت سے ملائشیا کی یونیورسٹیاں آج دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکی ہیں اور آج ملائشیا قوموں کی برادری میں بڑا اونچا مقام رکھتا ہے اور سیاسی و معاشی لحاظ سے بھی مستحکم ملک تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کے سیاسی جوڑ توڑ میں ملائشیا واحد اسلامی ملک ہے جس نے عراق اور افغانستان کے مؤقف پر بلا خطر حق وانصاف کی بات کی۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول نہ صرف آج بلکہ ہمیشہ سے قوموں کی ضرورت رہا ہے، اگر اس میں مقصدیت یعنی ملی اور قومی اقدار وضروریات بھی شامل ہو جائیں تو ملی اور قومی مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

مغربی اقوام تو چاہتی ہیں کہ ترقی پذیر ممالک عام طور پر اور مسلمان ممالک خاص طور پر ان کے مرہونِ منت رہیں، اپنی اقدار چھوڑ کر ان کی اقدار اپنا لیں ۔ چند ایک تاریخی حوالے پیش کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد مغرب کے دانشور مل بیٹھے اور انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو جب بھی مغرب سے خطرہ پیدا ہوتا ہے تو وہ جہاد کے نام پر سب اختلاف بھلا کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ان کا مقابلہ بہت مشکل بلکہ بعض حالات میں ناممکن ہو جاتا ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک تو انہیں ماضی سے کاٹ دیا جائے، خلافت کی صورت میں مرکزیت ختم کی جائے اور اہم بات یہ کہ یعنی ان میں شامل ہو کر ان کو اندر سے بدلا جائے، وہ اس فیصلے میں کامیاب رہے۔ ملت اسلامیہ کے حصے بخرے ہو گئے، نظامِ تعلیم برباد ہو گیا، ان کے تربیت یافتہ افراد اقتدار میں آگئے۔

کتاب ڈینیل میں ذکر ہے کہ جب بابل کا حکمران بخت نصر یروشلم پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے درباریوں سے کہا کہ میرے پاس اسرائیلی اشراف میں سے کچھ لوگوں کو لاؤ جو جوان ہوں، انہیں کوئی جسمانی عارضہ نہ ہو، ہوں بھی خوبصورت اور سیکھنے کی طلب رکھتے ہوں تا کہ ہم انہیں مصاحبوں میں شامل کر لیں۔ وہ انہیں بابل والوں کی زبان اور تہذیبی روایات سکھانا چاہتا ہے۔ منتخب لوگ روزانہ بادشاہ کے دستر خوان سے اچھی اچھی خوراک کھاتے اور شراب سے لطف اندوز ہوتے۔ ان کو تین سال کی تربیت کے بعد مصاحبوں میں شامل کر لیا گیا۔ آگے بیان کیا گیا کہ انہیں شریکِ کار کیجئے، وہ لگیں گے تو انہی جیسے لیکن عمل آپ جیسا کریں گے۔ موجودہ حالات میں اوپر دیئے گئے حوالہ کو اس طرح چسپاں کیا جا سکتا ہے کہ انہیں تعلیم کے حصول کیلئے ہارورڈ ، آکسفورڈ، کیلی فورنیا، نیویارک، لندن اور پیرس بھیج دیجئے، پھر آپ کو مغلوب کرنے کیلئے کسی فوج یا ایئر فورس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اقبال کے دو اشعار سے اپنی معروضات ختم کرتا ہوں!

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

بروز بدھ 7 جمادی الاوّل 1431ھ 21/ اپریل 2010ء

اقبال کا پاکستان

علامہ اقبال کا کلام انسانی فکر و عمل کی تاریخ کا نہائت دقیق تجزیہ ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی بصیرت کی بناء پر تاریخی حوادث سے متعدد دور س نتائج اخذ کئے، بعض وہ نتائج بھی جو ابھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یہ شعر مبنی بر حقیقت ہے:

حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

بر صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر اقبال نے خصوصیت کے ساتھ توجہ دی، انہوں نے دیکھا کہ یہ وسیع و عریض خطہ مدت تک مسلمانوں کے فکر و عمل کی عظیم جولانگاہ بنا رہا اور انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک عظیم الشان اسلامی معاشرہ تشکیل کیا جس کے برجستہ تمدنی نقوش ناقابلِ محو ہیں ۔ مسلمان یہاں اگرچہ دوسری اقوام کی نسبت تعداد میں کم اور مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے لیکن عقیدۂ توحید نے انہیں ہمیشہ اسلام کے رشتہ وحدت میں منسلک رکھا۔ متعدد مسلمان خاندانوں نے یہاں ایک ہزار سال تک حکومت کی، ان میں غزنوی، غوری، خلجی، تغلقی، لودھی اور مغل خاندان زیادہ معروف ہیں۔ یہ حکومتیں اگرچہ مذکورہ خاندانوں کے نام سے منسوب تھیں لیکن چونکہ وہ اسلامی اصولوں کی اساس پر استوار کی گئیں اور اسلامی اقدار کی حفاظت اور نشر واشاعت کیلئے کوشاں رہیں، اس لئے انہیں اسلامی حکومتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے حکمران مسلمان تھے اور دین اسلام کو اپنی حکومت کا تشخص اور طرۂ امتیاز قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی قائم کردہ عدالتوں میں اسلامی قوانین رائج کرتے، مدرسوں اور مساجد کی تاسیس کرتے اور ان میں اسلامی تعلیمات و روایات اور مسلمانوں کی زبان وادب کو فروغ دیتے، اکثر سلاطینِ وقت صوفیاء اور علماء کی عزت و تکریم کرتے اور ان سے ہدایات حاصل کرتے، صوفیاء ہمیشہ سلاطین کو رعایا کے ساتھ عدل واحسان کی تلقین فرماتے۔

محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے مسلمانوں کیلئے ہندوستان کے دروازے کھول دیئے، محمود غزنوی نے دہلی کو مسلم حکومت کا دارلسلطنت قرار دیا۔ تمام مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنی حکومت کی شناخت دین اسلام کو قرار دیا اور ہر ایک نے اپنے آپ کو دین کے مبلغ و محافظ اور اس کی عظمت کے مظاہر و موید کے طور پر ملقب کیا، اس حوالے سے اکثر سلاطین کے القاب قابل ملاحظہ ہوں مثلاً معزالدین غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، غیاث الدین بلبن، علاؤالدین محمد شاہ، ظہیر الدین بابر، نصیر الدین ہمایوں، جلال الدین اکبر، نورالدین جہانگیر، شہاب الدین شاہجہان اور محی الدین اورنگزیب عالمگیر وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین تخت نشینی کے وقت یہ اصرار کرتے تھے کہ وہ دین سلام کے تحفظ اور ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ اگر احیاناً کوئی بادشاہ دینی امور کی اشاعت میں کچھ کوتاہی کرتا تو صوفیاء اور علماء اسے متنبہ کرتے اور اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرتے۔ صوفیاء میں نظام الدین اولیائ، بہاؤالدین ذکریا، شرف الدین بو علی قلندر، جلال الدین بخاری، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ سلاطین وقت کو اسلامی احکام کی تعمیل کی تاکید فرماتے رہے۔

برصغیر کی تاریخ سے متعلق جن عظیم حکمرانوں کو علامہ اقبال نے خراجِ تحسین ادا کیا ان میں محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، احمد شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنہوں نے پرچمِ توحید کو ہمیشہ بلند رکھا اور باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اٹھارویں صدی میں جب مسلمانوں کا عظیم الشان معاشرہ بادشاہوں اور امیروں کی اخلاقی بے راہروی کی بناء پر فتنہ و فساد اور انتشار کا شکار ہوا تو اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی بیداری میں سرسید احمد خاں، شبلی نعمانی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور سب سے بڑھ کر علامہ اقبال نے نہائت اہم کردار ادا کیا۔ علامہ اقبال نے ہندو قوم کے تاریخی کردار اور اس کے عصری خطرناک عزائم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے دین و مذہب، جان و مال اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کیلئے اپنی فکری اور عملی توانائیاں وقف کر دیں، انہوں نے فرمایا:

"آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے، ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک مین فنا ہو جائے،،۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمانوں کیلئے ایک آزاد مملکت کا تصور ہزار سالہ اسلامی تمدن کی حفاظت اور بقاء کیلئے پیش کیا، ان کے نزدیک مذہب قوت کے بغیر محض ایک فلسفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا،، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام ایک تمدنی قوت کے طور پر زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے"۔

علامہ اقبال اسلام کے بغیر مسلمان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی آزادی کی حفاظت صرف نفاذِ اسلام کیلئے چاہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: "اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں جیسا کہ آج کے قوم پرستوں کے رویئے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہ ہونگے"۔ ہماری تاریخِ ادب میں علامہ اقبال آزادیٔ وطن کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس حوالے سے ان کے سازِ سخن کے نغمات حریت و استقلال ہیں لیکن وہ اسلام کے بغیر آزادیٔ وطن کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے غیورانہ لہجے میں فرمایا:

"اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دار لکفر ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین ہو جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے" ۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی تشکیل کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ شریعت اسلامی کا نفاذ ہو سکے تاکہ اس کے نتیجے میں ہر شخص کو معاش کی ضمانت مل سکے۔ اس بارے میں انہوں نے قائداعظم کے نام خط میں لکھا..... "شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا چند ایسی ریاستوں کی عدم موجودگی میں اسلامی شریعت اسلامیہ کا نفاذ اس ملک میں محال ہے"۔

انہوں نے مسلمانوں پر واضح کیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو ترک کر کے اسلامی قومیت کو اپنی شناخت بنائیں کیونکہ اسلام ہی انہیں موجودہ تباہ کن حالات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں پر اسلام کے احساناتِ عظیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و

عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیّز اور معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے"۔

حکیم الامت کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا، یہ ہے کہ انہوں نے ہندی قومیت کے تصور کی مکمل نفی کی اور مسلمانوں میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا۔ اقبالؒ جغرافیائی وطن پرستی کے سخت مخالف تھے کیونکہ یہ ان کے نزدیک وحدتِ ملی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ،انہوں نے اسلام کو زندگی بخش قوت قرار دیتے ہوئے فرمایا،، اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے،،۔ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے، یہاں تک کہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو کا جدا کرنا حقائق اسلامیہ کا خون کرنا ہے۔

اقبال کیلئے اسلام ہی مسلمان کی زندگی ہے، کوئی مسلمان اسلام سے باہر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے فرمایا: "اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے"۔

رسالتِ محمدیہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "ہمارے عقیدے کے مطابق بحیثیت مذہب کے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بذریعہ وحی نازل کیا لیکن ایک معاشرت یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود کلیتاً رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا رہینِ منت ہے"۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

1919ء میں ایک خط میں لکھا: "خدا کی راہ میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے تھا اور زندگی تمام و مکمل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہئے تھی"۔

اقبال اسلام کے ابدی حقائق پر محکم ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسلام کی تفسیر و توضیح میں صرف کی تاکہ مسلمان عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس کی لامتناہی برکات سے مستفیذ ہوں۔ حضرت علامہ کے نزدیک اسلام ہی مسلمانوں کا بہترین مدافع اور محافظ ہے۔ اسلام مسلمانوں سے اپنے تحفظ کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ انہیں تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ مسلمانوں کے ملک و ملت اور جان و مال کی حفاظت صرف اسلام سے وابستگی میں ہے ۔انہوں نے فرمایا:

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ آڑے وقت میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی"۔ اس دین کی حقانیت اور اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:،، میری طلب و جستجو صرف اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا دینا ہے"۔

اسلام تمام نوعِ انسانی کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ اس دین میں اسود و احمر، عربی اور عجم اور بندہ و آقا کی تمیز کچھ حکم نہیں رکھتی۔ اقبال اس جاہلانہ تصور کو سختی سے مسترد کرتے ہیں کہ اسلام کو معاشرتی حیثیت سے نکال کر شخصی ضابطہ بنا دیا جائے۔ انہوں نے 1930ء کے تاریخی خطبے میں فرمایا: "کیا آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عجمی اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو..... اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں، دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کیلئے بھی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کیلئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصولی اتحاد کے منافی ہو"۔

☆اسلام بحیثیت دین، مذہب اور سیاست کا مجموعہ ہے

حضرتِ علامہ کے نزدیک اسلام ہی عالمِ انسانیت کیلئے فلاح اور امن کا دستور ہے، اسلام ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے اور اس وقت احترامِ انسانی کیلئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسلام کا مطالبہ وفاداری صرف خدا کیلئے ہے، تخت و تاج کیلئے نہیں اور چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کا دراصل مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ہی فطرتِ صحیحہ کی اطاعت کرتا ہے۔

حضرتِ اقبال کے نزدیک،، اسلام،، ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہو گی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ حضرتِ علامہ نے مسلمانوں کے تاریک ترین ایام میں اپنی قوتِ ایمانی سے فرمایا:
"دنیا میں کارفرما قوتیں اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن،، لیظہرہ علی الدین کلہ،، کے دعویٰ پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی"۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

حضرتِ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کیلئے جو راستہ دکھایا، قائداعظم مسلمانوں کے قافلے کو لیکر اس پر چل پڑے اور بہت قلیل عرصے میں منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے یعنی پاکستان..... اسلام کا پاکستان، ہمیشہ زندہ رہنے والا پاکستان۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا، میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی کسی کو نہیں دیکھا۔ اقبال اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے"۔ اور بلاشبہ اسلام ہمیشہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

یومِ اقبال کے موقع پر کاروان فکر و عمل کے اجتماع میں پڑھا گیا۔

بروز جمعتہ المبارک 9 جمادی الاوّل 1431ھ 23/ اپریل 2010ء

غیر مرئی دباؤ

مفاد پرستی کی جو مکروہ شکل پاکستان میں پروان چڑھ چکی ہے، وہ نہ تو کسی ملک میں موجود دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی اس کے خوف وخطرے سے بچنے کی بظاہر کوئی تدبیر سجھائی دیتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ اس نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر جس طرح اپنی گرفت مضبوط کرلی ہے اس کے سامنے ہر کس وناکس اپاہج کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ نہ زندگی میں کوئی رمق باقی ہے نہ کوئی اصول، نہ کہیں کوئی اخلاق دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اخلاص، نفس پرستی کے سبب سبھی کے نفس اتنے موٹے تازے ہو چکے ہیں کہ ان کو پالنے کی تدابیر وتراکیب میں ہی ہر کوئی اپنے ہر ماہ و سال گزار رہا ہے، اسی لئے جب پاکستانی قوم کی بات کی جائے تو بعض سخن واران ہنر اسے قوم ہی نہیں مانتے۔ ایسا ہونا ہی تھا، کیونکہ جو قوم بغیر ملک یا زمین کے کسی ٹکڑے کے اقوام عالم میں خود کو قوم منوا چکی تھی، جب وہ اپنے اس نظریئے، اس نصب العین اور اس سوچ سے علیحدہ ہو جائے، اسے فرسودہ قرار دیدے، تنازعہ بنانے والوں کو برداشت کرے تو وہ اپنی ساکھ اور اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے جتنے چاہے جتن لگالے، برقرار نہیں رکھ سکتی، چہ جائیکہ اس جانب سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی جائے۔

مفاد پرستی اور ذات پرستی کا جرم کرنے والے تو بڑے ڈرے ڈرے، سہمے سہمے انداز میں ایسا کرتے ہیں جب کہ ہمارے یہ سکۂ رائج الوقت بن چکا ہے ، جنہیں قوم کی یکجہتی کیلئے کام کرنا چاہئے تھا وہ اسے تقسیم کرنے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں، کیونکہ اسی میں ان کا مفاد ہے۔ نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے ذمہ دار اپنے کلیدی کردار کو ادا کرنے کی بجائے ایسی راہ پر چل نکلیں جس کی نہ کوئی منزل ہو اور نہ مفاد پرستی یا ذات پرستی کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو تو ایسے میں قوم کا منتشر ہونا اور اپنی گم گشتہ راہ کی تلاش کی سعی وجہد ترک کرنا مایوسی نہیں تو اور کیا ہے، وہ مایوسی جو کفر کہلاتی ہے۔ دوسروں کی طاقت کے خوف سے اپنی بزدلی اور کمزوری کو چھپانے کیلئے ایسے ایسے قدم اٹھانا جو تباہی وبربادی کو یقینی بنائیں، ایک ایسا رویہ ہے جو اقتدار کے ایوانوں میں ہمیشہ موجود رہا بلکہ اب تو مضبوط ہو کر سامنے آرہا ہے۔

یقین جانئے قائداعظم کے بعد ہر قیادت نے اپنی حکومت کی حفاظت کیلئے ہر شئے داؤ پر لگادی۔ اس رویے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنی پختگی آئی کہ سچائی اور حقیقت کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ جھوٹ، منافقت اور پروپیگنڈے کے زور پر خود کو منوانے اور بطور قوم کا خیر خواہ منوانے کی جو رسم بد ہمارے ہاں زور پکڑ چکی ہے اس کے سبب قوم میں ایک جمود، تعطل اور مایوسی کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا اور اس فطری عمل کے سبب ہی قوم میں وہ شعور پیدا نہ ہو سکا جو اجتماعی فلاحی زندگی کے تقدم سے اسے آشنا کر دیتا۔ ہر سطح پر بے چارگی کا اب تو یہ عالم ہے کہ چھوٹے سے لیکر چھوٹے مزدور سے لیکر ایوانِ اقتدار میں بیٹھے ہوئے طاقتور سے طاقتور حکمران تک ہر کوئی اس بیچارگی اور ایک مستقل دباؤ کے نیچے کراہ رہا ہے، کسی پر اپنے آقاؤں کا دباؤ ہے تو کسی پر خارجی آقاؤں کا دباؤ، کسی پر سیاست کا دباؤ ہے تو کسی پر سازش کا دباؤ، کسی پر اقتدار بچانے کا دباؤ ہے تو کسی پر اقتدار میں آنے کا دباؤ۔ جرنیل، جج، صحافی، سیاست دان، تاجر، مذہبی لیڈر بلکہ عام پاکستانی سبھی ایک مرئی اور غیر مرئی دباؤ کے نیچے کراہ رہے ہیں۔

ظاہر ہے جب انصاف دینے والے کے انصاف دینے پر یہ تاثر گہرا ہو کہ کسی ڈیل کے نتیجے میں انصاف دیا گیا ہے یا انصاف نہ دینے پر یہ تہمت لگے کہ ایسا کسی دباؤ کے تحت ہوا ہے تو پھر دباؤ کا ہر حال میں موجود ہونا حالات و واقعات کی شہادتوں اور گواہیوں سے ثابت ہوتا ہے۔ انسانی ضمیر کی تفہیم کرانے جس سائنسدان اور دانشور نے اسے بجلی کے بلب کی اندر کی روشنی سے تشبیہ دی تھی وہ اس کا ابلاغ کرانے میں بہت کامیاب قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس نے بلب کے اندر کی تمام روشنی کو اس مدافعانہ قوت اور فعل کا نتیجہ قرار دیا تھا جو اس تار میں موجود ہوتی ہے جو بلب کے اندر نصب کی جاتی ہے، جس لمحہ یہ تار ٹوٹ جائے یا کمزور ہو کر اس کی مدافعانہ قوت ختم ہو جائے تو روشن بلب تاریکی کا گھر بن جاتا ہے۔ انسانی ضمیر کو جب انسان کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں گلا گھونٹ کر ادھ موا کر دیں، جب وہ چھوٹے چھوٹے دباؤ کو برداشت کرنے کی بجائے بے دست و پا ہو جائے تو وہ نہ اس کی صدارت کا رعب رہتا ہے، نہ جرنیلی کا دبدبہ رہتا ہے، نہ اس کے جج ہونے کا احترام، نہ اس کی صحافت کا ڈر اور نہ ہی اس کی سیاست کی کوئی آبرو سلامت رہتی ہے۔ اس کی مفاد پرستی اس کو اندر سے اتنا کمزور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی کمزوری کو ،وہ اس کی کمزوری کو چھپانے کی بجائے اسے چھپانے کیلئے جو بھی تدبیر کرتا ہے، جو بھی عمل کرتا ہے ظاہر کرنے کا موجب بنتی ہے۔

آج فی الوقع من حیث القوم اپنی خود غرضیوں اور کمزوریوں کے سبب ہم سب اپاہج ہو چکے ہیں اور اپنے اس اپاہج پن کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانے کی صبح و شام گردان کرتے ہیں جو ہمارے حالات کو سنوارنے کا موجب ہر گز نہیں بن سکی، یہ تو خود کو دھوکہ دینے کا عمل ہے جو ہم کئے جا رہے ہیں آزمائے ہوئے ۔ جمہوریت میں آمریت ملنے کی کوشش اور آمریت میں جمہوریت کیلئے جدوجہد، کو آزمانے کا وہ محاورہ،، آزمودہ راہ آزمودان جہل است،، ہم اس حد تک فراموش کر چکے ہیں کہ آزمائے ہوئے کو بار بار آزمانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اپنی خواہشات کی غلامی کرنے والے اور اپنے نفس کی اطاعت کرنے والے، بزدلی و نامرادی کی شرمناک شکل سے محفوظ رہنے کیلئے جو بھی ماسک چہرے پر سجالیں، وہ بددلی، بزدلی و نامرادی کی شکل میں ڈھل جائے گا۔

اقتدار نشینوں کے اذہان میں یہ خناس پہلے دن ہی سے سما جاتا ہے کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر ہر کام کروا سکتے ہیں، جس کو چاہیں سیدھا کروا سکتے ہیں، جس کو چاہیں چپ کروا سکتے ہیں، جس سے جو بے اصولی کروانا چاہیں کر اسکتے ہیں۔ وہ تاریخ کے بڑے بڑے طاقتوروں کے انجامِ بد سے آگاہی کے باوجود طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں اور اونچی مسند میں بیٹھ کر یہ متکبرانہ بیان بھی داغ دیتے ہیں کہ،، ہم جس کو چاہیں فقیر بنا دیں اور جس کو چاہیں بادشاہ ،، اور دوسری طرف بزدلی کا یہ عالم کہ خود کو قبروں کے پیچھے چھپا کر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے وظیفہ خواروں سے یہ اعلان کروانا کہ ہم قبروں کا احتساب نہیں ہونے دیں گے، کیونکہ اب طاقت کے ساتھ دوسرا ہتھیار پروپیگنڈے کا ہے مگر اس حقیقت کو بہر طور تسلیم کئے بغیر چارۂ بھی نہیں کہ طاقت کا استعمال اور پروپیگنڈہ کا حربہ اکیلے اکیلے یا دونوں مل کر اصلاحِ احوال کے کسی دیرپا عمل کو جنم دینے سے قاصر رہے ہیں اور قاصر رہیں گے اور جب تک اصلاح احوال کی کوششیں اختیار نہیں کی جاتیں اور انہیں کارگر نہیں بنایا جاتا، اندر کا خوف ختم نہیں ہو سکتا۔

اندر کا اپنا خوف باقی رہے تو دوسروں کے اندر کا خوف کسی طاقت کے استعمال یا پروپیگنڈے کے زور پر کیونکر ختم ہو سکتا ہے۔ ایسے حربے صرف مایوسی اور بزدلی کو تقویت دینے کا موجب بنتے ہیں۔ اس سے عوام کے اذہان و قلوب میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا ہو سکتی تو اب تک دنیا کے ہر ملک میں مثبت رویے آچکے ہوتے، خوفزدہ کر کے مفاد پرستی کے پودے کو سینچنے والے حربے بہت ہی عارضی ثابت ہوتے ہیں۔ زندہ قوموں کے افراد کو ڈرانے دھمکانے یا وعظ و نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا سمجھنے کا شعور حاصل کر لیں تو ان کے اذہان و قلوب سے خوف ختم ہو جاتا ہے اور ہمارے حکمرانوں کی بد قسمتی یہ ہے کہ ان میں ابھی تک یہ شعور پیدا نہیں ہوا، اور انہوں نے ابھی تک ذاتی مفاد پرستی سے اوپر اٹھنے کی قطعاً کوئی کوشش ہی نہیں کی اور وہ اب بھی اپنے نادان دوستوں کی معیت میں قوم کو بے وقوف بنانے کے چکر میں کبھی خود کو شہید ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی چکمہ دیکر قوم کی لوٹی ہوئی دولت کو بچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

قائداعظم کی طرح جن کی انگریزی میں تقریر ایک ان پڑھ دیہاتی پورے انہماک سے سن رہا تھا کہ کسی پڑھے لکھے نے اس کے اس انہماک پر کہا کہ تمہیں انگریزی کی تو سمجھ نہیں آرہی پھر اس قدر سنجیدگی سے کیا سن رہے ہو؟ دیہاتی نے سادگی مگر بڑے یقین کے ساتھ کہا کہ مجھے واقعتاً یہ پتہ نہیں کہ بابائے قوم کیا کہہ رہے ہیں مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ وہ جو کہہ رہے ہیں میرے اور میرے ملک کے عوام کے مفاد میں کہہ رہے ہیں۔ آج ہمارے حکمران طبقہ میں کسی کے مقدر میں عوام الناس کا یہ یقین نہیں آیا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں ان کے مفاد میں کہہ رہے ہیں۔ شائد اس لئے نہیں کہ وہ ایسا نہیں کہتے ،وہ جو کہتے ہیں اپنے مفاد میں کرتے ہیں اور اپنے مفاد میں کہتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جو دیر سویر ان ظالموں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہے گا!

بروز اتوار 11 جمادی الاوّل 1431ھ 25/ اپریل 2010ء

کس بوٹ کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اٹھارویں ترمیم کی منظوری کے بعد حکومت کے تمام افراد اس طرح شادیانے بجا رہے ہیں گویا ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں جابجا ابل پڑیں ہیں، ملک سے لوڈشیڈنگ کا مسئلہ بالکل ختم ہو گیا ہے، صنعتی ترقی کا جو پہیہ ایک عرصے سے بند پڑا تھا اس میں اچانک تیزی آگئی ہے، ملک میں کوئی بیروزگار نہیں، آٹے چینی سمیت دیگر تمام خوردنی اشیاء ملک میں ارزاں نرخوں میں دستیاب ہیں، پینے کے صاف پانی اور صحت کی سہولتوں سے ساری قوم مستفیذ ہو رہی ہے، جنابِ یوسف رضا گیلانی کی وزارتِ عظمٰی، حقیقی جمہوریت کے خاکے میں گڈ گورننس کے رنگ بھر رہی ہے اور سترہ کروڑ پاکستانی تصویرِ حیرت بنے دیکھ رہے ہیں کہ اصلی اور خالص وزیرِ اعظم کیسے ہوا کرتے ہیں؟

پچاسی رکنی کابینہ کے قافلۂ شوق کے ہمراہ ان کا سفر شہر شہر، قریہ قریہ جاری وساری ہے کہ دکھی عوام کی دہلیز پر ان کی زندگی کے مسائل حل کئے جائیں لیکن پتہ نہیں کیوں حکومت کی کارکردگی سے دلچسپی رکھنے والے مبصرین کو موٹے شیشوں والی عینک لگا کر دیکھنا پڑ رہا ہے کہ کہ جناب یوسف رضا گیلانی کیا کر رہے ہیں؟ اس سے پہلے صدرِ محترم زرداری صاحب نے اپنے مضبوط کندھوں پر اپنی جماعت کے علاوہ ساری قوم کا بوجھ اٹھا رکھا تھا اور ہر طرف سے یہ مطالبہ ہو رہا تھا کچھ وزیرِ اعظم کے ناتواں کندھوں کو بھی اس بوجھ اٹھانے کی مشق کروانی چاہئے اور اب اصلی اور خالص جمہوریت کی واپسی کا سہرا جنابِ صدر کے سر پر سجایا جا رہا ہے!

اب امن وامان کا مسئلہ صوبائی حکومتوں کا دردِ سر ہے، کرپشن اور بدعنوانی کے سدباب کی تمام تر ذمہ داری نیب کے سپرد ہے جس کو وزیرِ قانون بابر اعوان بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں، سیاسی جوڑ توڑ اور ادھڑے ہوئے چاکوں کی بخیہ گری رحمان ملک کا کام ہے، مسائل کی چتا میں جلتے ہوئے عوام کی شکایات کا ازالہ سلمان فاروقی کی ذمہ داری ہے جنہوں نے ایوانِ صدر میں ایک سیل قائم کر رکھا ہے، پالیسیوں اور فیصلوں کی وضاحت یا وکالت سرکار کے ترجمان خوش بیان فرحت اللہ بابر کا کام ہے۔ ناہید خان، صفدر عباسی اور دیگر ناراض پارٹی لیڈر اور فوزیہ وہاب کے درمیان چپقلش کی بھڑک اٹھنے والی آگ وہی بجھائے گا جس نے سلگائی ہے۔ پارٹی یا کسی اور سے مفاہمت کی خبر انہیں اخبارات یا ٹیلیویژن کے ذریعے مل جاتی ہے۔

عام انتخابات 2013ء میں ہوں گے یا پھر مڈ ٹرم الیکشن کا شور اٹھے گا، یہ فیصلہ انہوں نے نہیں کرنا، اس کا فیصلہ وہی کریں گے جنہوں نے پہلے واپسی کی بساط بچھائی تھی، این آر او کے گجرے پہنا کر سر پر ہاتھ رکھ کر ایفائے عہد کی نصیحت کی تھی اور جونہی نافرمانی کی روش اختیار کی گئی تو دیکھتی آنکھوں کو وحشت اور آنے والوں کو عبرت کا سبق پڑھا دیا گیا۔ خارجہ پالیسی کی متبرک فضاؤں کا رخ کرتے ہوئے ان کے پر جلتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے اہم دورے اور حساس نوعیت کے دوطرفہ اسٹریٹیجک معاہدے ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ کشمیر کے بارے میں انہیں کسی تردد اور پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہوں نے تو حکومت سنبھالتے ہی ہاتھ باندھ کر عرض کیا تھا کہ ہماری تو ان سے کبھی کوئی دشمنی ہی نہیں رہی، آبی ذخائر یا کسی ڈیم کا فیصلہ کرنا ان کا کام ہی نہیں۔

بلوچستان میں کلبلاتا بحران جانے اور وہ کمیٹی، جو خود ایک بحران بنتی جارہی ہے ادھر افغانستان سے متصل تمام پاکستانی علاقوں کے امن وامان کا حساس فیصلہ ان کے گوشۂ لب کا محتاج نہیں، سرکاری عمال کی تقرریاں اور تبادلے ایک خودکار نظام کے تحت خود ہی ہورہے ہیں، جو منظورِ نظر ہیں ان کی ترقیاں اور من پسند محکموں میں ان کی تعیناتی پر پوری محنت کرکے ان کو مستقبل کا ایجنڈا دیکر رخصت کیا جاتا ہے اور ہر آئے دن ان کو وفاداریوں کی آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن بنانے کام جاری وساری ہے۔ وزیراعظم کو اب اٹھارویں ترمیم کے منظور ہوجانے کے بعد کوئی پریشانی یا خطرہ لاحق نہیں رہا۔ وزراء اپنے اپنے محکموں کے ساتھ کیا حسنِ سلوک فرمارہے ہیں اس کو دیکھنے کی ابھی فرصت نہیں اور نہ ہی ان کی ذمہ داری کہ ان کو تعینات کرنے والے ہاتھ ہی ان کی پاسبانی کیلئے کافی ہیں۔

اس کے باوجود یوسف رضا گیلانی وزیرِ اعظم ہیں۔ ان کی قابلیت اور صلاحیت کا عالم یہ ہے کہ جماعت کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے تمام ارکان میں سے کوئی ان کا ہم پلہ اور وفادار نہیں نکلا، امین فہیم جو پارٹی کو چلا رہے تھے ان کو بھی گھر بٹھا دیا گیا اور بالآخر وہ اسی تنخواہ پر راضی ہوئے تو ان کو بھی بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ اپنے مشیروں اور وزیروں کی ایک فوج ظفر موج جنہیں باریک چھلنیوں اور حساس چھاجوں کی چھان پھٹک کے جن میں ہر ایک کا دامن فرشتوں کے پروں کی طرح اجلا اور شفاف تھا منتخب کیا گیا۔ ملک کی معیشت کو سنبھالا دینے کیلئے ایک بینکر شوکت ترین کی خدمات گئیں کہ اس سے پہلے ملک کو ان بحرانوں میں مبتلا کرنے والا بھی ایک بینکر شوکت عزیز ہی تھا جو خاموشی سے اپنا کردار ادا کرکے وہی پہنچا جہاں حاصل کی کا خمیر تھا لیکن یہ بینکر بھی بالآخر آئی ایم ایف اور دیگر غیر ملکی اداروں کے دروازے پر فریاد کرتا ہوا پہنچا اور آجکل یہ تمام غیر ملکی مالیاتی ادارے ہماری مسیحائی کیلئے دن رات کوشاں ہیں۔ شوکت ترین بالآخر ایوانِ صدر اور منظورِ نظر وزراء کی خواہشات کے سامنے ہاتھ جوڑ کر دل ہار گئے کہ وہ ملک کو مزید،، غیر ملکی رینٹل پاور،، کی صورت میں لوٹنے کی سازش میں مزاحمت پر اتر آئے تھے اور وہ کوئی معاشی معجزہ دکھائے بغیر رخصت کے طالب ہوئے ۔ مہنگائی ہے کہ اب بڑھتی ہی جارہی ہے اور بے روزگاری کا طوفان تھمنے میں نہیں آرہا، تہی دست عوام کی تعداد ساٹھ فیصد سے بھی تجاوز کر گئی ہے اور فاقہ زدہ ماں باپ اپنے بچوں سمیت خودکشیاں کررہے ہیں، فردوس اعوان کی وزارت کا محکمہ آبادی کو کنٹرول کرنے کے اس فارمولے سے پہلے کبھی واقف نہ تھا!

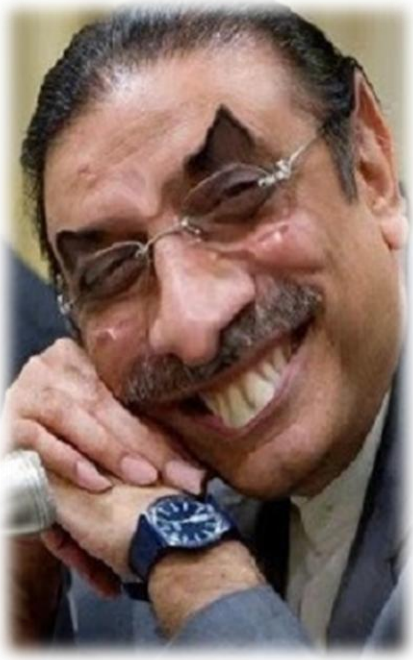

ایوانِ صدر بابر اعوان کے مشوروں سے اعلیٰ عدالت کے احکام کا رخ پھیر دینے کی ناکام کوششیں کررہا ہے، سینیٹر بابر اعوان کے بارے میں پنجاب بینک کے ایک اہم ملزم نے ملک سے فرار اور اس کیس سے بریت کیلئے بابر اعوان کو ساڑھے تین کروڑ روپے کی رشوت اور دبئی میں پچاس لاکھ کی شاپنگ کرانے کا انکشاف کیا تو اس کو ملک کے وزارتِ قانون وعدل کا قلمدان سونپ دیا گیا۔ ملک کے اٹارنی جنرل لطیف کھوسہ کی کرپشن پر اعلیٰ عدالت نے جب حکومت کی توجہ دلائی تو اس کو اس منصب سے ہٹا کر فوری مشیر کے عہدے پر تعینات

کر دیا گیا، نئے اٹارنی جنرل انور منصور نے عدالتِ عالیہ کے مطالبے پر جب سوئس مقدمات کے ریکارڈ حاصل کرنے کی درخواست کی تو بابر اعوان نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف اس ریکارڈ کو پیش کرنے سے انکار کر دیا بلکہ "اوور مائی ڈیڈ باڈی" کہہ کر اٹارنی جنرل کو استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔

جس دن عدالتِ عالیہ میں جعلی تعلیمی ڈگری تسلیم کرنے پر قومی اسمبلی کے رکن،، دستی،، کو رکنیت سے برطرف کیا جاتا ہے، اسی دن عزت مآب وزیر اعظم اس کو مشیر کے عہدے پر تعیناتی کا نوٹیفکیشن جاری کر دیتے ہیں۔ اس ملک کی نیب کی عدالت نے کرپشن کے الزام میں "شیخ ریاض" کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا تھا اس کو جیل سے نکال کر اعلیٰ عہدے پر ترقی دیکر نیب کے ادارے میں تعینات کر دیا جاتا ہے۔ عدالت کی سخت تنبیہ پر جب اس کو دوبارہ جیل میں بھیجنے کا حکم جاری ہوتا ہے تو اس کی رہائی کیلئے صدرِ محترم اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جیل میں دوسرے قیدیوں کی سزا میں تخفیف کے بہانے اپنے من پسند کرپٹ دوست کو بھی جیل سے رہا کرنے کا حکم ارشاد فرماتے ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے صنعتی ادارے پاکستان اسٹیل مل کے سربراہ جو اربوں روپے کی کرپشن میں نامزد تھے، وہ بھی سینہ پھلائے واپس گھر آجاتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات پر اس ملک کے کروڑوں روپے خرچ کر دیئے گئے، اس تحقیقاتی رپورٹ کو روک دینے کی درخواست کر دی گئی لیکن جب دو ہفتوں کی بندش کے بعد رپورٹ منظرِ عام پر آئی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس قتل کی تحقیقات دوبارہ ملک کے اپنے اداروں سے کروائی جائے گی اور اس رپورٹ کے بعد جن افراد پر انگلیاں اٹھائی گئیں ان میں سے ایک فرد رحمٰن ملک جو کہ اس وقت ملک کے وزیرِ داخلہ ہیں ان کی سولہ سالہ برطرفی کو ریٹائرمنٹ میں تبدیل کر کے وفاداری کی یک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے ملک کے خزانے پر کروڑوں روپے کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ ملک کی اعلیٰ عدلیہ سے بڑھتی ہوئی محاذ آرائی کے،، سونامی،، طوفان کی شدت ابھی زیرِ سمندر ہے اس کو روکنے کی بجائے مختلف حیلے بہانوں سے ملکی اداروں میں تصادم کا راستہ کھول دیا گیا ہے، اٹھارویں ترمیم میں پڑھے لکھے ججوں کی تعیناتی اب ملک کے ان افراد کو سونپ دی گئی ہے جن کے انتخاب کیلئے اب تعلیم کی کوئی قید باقی نہیں بلکہ کسی جعلی ڈگری کی بھی ضرورت نہیں اور اس اٹھارویں ترمیم میں جمہوریت کی بقاء کیلئے سیاسی جماعتوں کو اپنی پارٹی کے اندر انتخاب سے بھی استثناء فراہم کر دیا گیا ہے تاکہ قیادت کو اپنی وراثت میں ہی رکھا جائے۔

"Why Everything Is Going To Get Worse Before It Gets Better"? Better"? ایک مشہور انگریزی مقولہ ہے یا غالب کی زباں میں "بے خودی بے سبب نہیں غالب" یہ سارا بحران بے سبب نہیں لگتا۔ خدا خیر کرے! ان تمام کارنامہ ہائے کے بعد "بوٹوں کی دھمک" کو مزید کسی بہانے کی ضرورت نہیں بلکہ ملک کے وسیع تر مفاد میں اب شائد،، بوٹوں کی دھمک،، کہیں تمام ترامیم کو بہا کر نہ لے جائے کیونکہ اس کیلئے تو صرف دو ٹرک اور ایک جیپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب دیکھئے آقا کی مرضی کیا ہے!

بروز سوموار 12 جمادی الاوّل 1431ھ 26 اپریل 2010ء

طاؤس ورباب

باطل پرست عناصر کی سرگرمیوں کو عروج صرف اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب حق پرستوں کی صفوں میں منافقین کا سہارا مل جاتا ہے۔ اسپین میں مسلمانوں نے ساڑھے آٹھ سو سال حکمرانی کی' اس طویل شاندار حکمرانی کے بعد آج وہاں یہ حالت ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملے گا۔ ایسے شاندار ماضی کا یہ عبرتناک حال کیونکر ہوا؟

غیر مسلموں نے طاؤس ورباب اور عیش وعشرت میں ڈوبے ہوئے حکمرانوں کو اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرطبہ' اسبیلہ اور غرناطہ کے گرد دشمن کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا تو یہاں کے حکمراں اور دانشور عوام کو دشمن کی طاقت سے خوفزدہ کر رہے تھے اور اچھے تعلقات استوار کرنے' معاہدات کی نوید سنا کر ان کا دل بہلا رہے تھے اور دانشور طبقہ اپنے قومی ہیروز اور مشاہیر کے کارناموں کی بجائے دشمنوں کی عقل وفراست کے بارے میں عوام کو گمراہ کر رہے تھے۔ خوشامدی چیلے اپنی اس بے غیرتی پر جشن منا رہے تھے' پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ مسلمانوں نے جب ہتھیار پھینکے' خشیتِ الٰہی پر دنیاوی طاقت کا خوف غالب آیا' جب مادی وسائل پر بھروسہ کیا گیا' شکست کے خوف سے قدم زمین میں گڑ گئے' تب طاؤس ورباب میں مگن ان مسلمانوں پر دشمن کی طرف سے خوفناک حملہ کیا گیا اور جہاں کئی صدیوں تک مسلمانوں نے حکمرانی کی وہاں ان کا نام ونشاں مٹا دیا گیا۔

آج بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ چہرے مختلف مگر کردار وہی ہے۔ ایک ایک کر کے مسلم امت کے ستون گرائے جا رہے ہیں۔ عوام کو بے ہنگم موسیقی وفلموں' میلوں ٹھیلوں' کھیل تماشوں اور رنگ رلیوں میں مصروف کیا ہوا ہے۔ رہی سہی کسر ہمارے ملک میں صہیونی آلہ کار "دانشور" پوری کر رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کو جب سے آزادی نصیب ہوئی ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی شتر بے مہار ایسے دانشور بھی سامنے آئے ہیں جن کا ایجنڈا صریحاً شعائر اسلام' مشاہیر اسلام اور پاکستان کے قومی ہیروز پر کیچڑ اچھال کر اپنی پست ذہنی سوچ سے اپنے بونے قد کو چوراہے میں بیٹھ کر بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جہالت کی بنجر زمین پر خودرو مشروم کی طرح اگنے والے پرویز ہود کی بیہودگی سے واسطہ پڑتا ہے تو کبھی پروفیسر مہدی حسن کی جہالت راستہ روکے کھڑی نظر آتی ہے لیکن غیور پاکستانیوں کے جذبات کا ایک ہی ریلہ ان تمام ظلمتوں کو بہا لیجاتا ہے۔ یہ مائنڈ سیٹ کچھ دیر کیلئے پسپائی اختیار کرتا ہے لیکن پھر تاہ دم ہو کر میدان میں اترتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حضرات کے بارے میں کوئی عملی تحریک شروع ہو جو اس مائنڈ سیٹ کا علاج کر سکے۔

آج سے تین سال پہلے پاکستان کی ایک صوبائی جماعت اے این پی کے سربراہ جناب اسفندیار ولی جب امریکا کے دوروں کو جب چھپا نہ سکے تو مجبوراً میڈیا کے سامنے انہیں تسلیم کرنا پڑا تو فرمانے لگے کہ میں امریکا میں "پختونوں کا مقدمہ" پیش کرنے گیا تھا' گویا اس علاقے میں پختونوں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اور پختون اس وقت سخت ناانصافی کا شکار ہیں لہٰذا اب پختونوں کی قسمت کا فیصلہ امریکا بہادر کرے گا۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ

مجوزہ جماعت نے ساری عمر سرخ ریچھ "روس" کی گود میں پرورش پائی' روس نے افغانستان میں جب پختونوں کے خون سے ہولی کھیلی تو اس جماعت کے تمام اکابرین کھلم کھلا روس کی حمائت میں دن رات کوشاں رہے اور امریکا کو جی بھر کر کوستے رہے لیکن اب یکایک کیا تبدیلی رونما ہوگئی کہ اسی امریکا کے ہاں پختونوں کا مقدمہ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوگئی!

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

حالانکہ یہ وہی جماعت تھی جس کو پچھلے انتخابات میں وہاں کے عوام نے بری طرح مسترد کر دیا تھا لیکن اس دفعہ وہاں کی بیشتر جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا جس کی وجہ سے ان کو حکومت میں آنے کا موقع ملا ہے لیکن جب سے اس جماعت کے افراد نے صوبائی حکومت سنبھالی ہے اسی دن سے ان کی جماعت کے اکابرین پاکستان کے مشاہیر یا نظریہ پاکستان کے خلاف تضحیک آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے سینیٹ میں ان کی طرف سے یہ مطالبہ آیا کہ پاکستان کے آئین کی اس شق کو ختم کر دیا جائے جس کی بناء پر ملک کا صدر' وزیر اعظم اور دوسرے کلیدی عہدوں پر صرف مسلمان تعینات ہو سکتے ہیں' اس کے بعد سینیٹ میں کھڑے ہو کر پاکستان کے بانی حضرت قائد اعظم کے بارے میں ہرزہ سرائی کی گئی' سینیٹ کے بیشتر افراد نے جب اس غلیظ گفتگو پر اعتراض کرتے ہوئے سینیٹ سے واک آؤٹ کیا تو صرف ایک مبہم جملے میں تاسف کا اظہار کر کے جان چھڑانے میں عافیت سمجھی۔ اب ایک دفعہ بھر اسی جماعت کے ایک سینیٹر حاجی عدیل نے برملا اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ راجہ داہر کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں اور محمد بن قاسم ان کی نگاہ میں جارح تھا اور وہ اپنے اس مخصوص فنڈ سے جو ان کو مملکتِ خداداد پاکستان کی طرف سے ملتا ہے' راجہ داہر کی ایک یادگار تعمیر کریں گے۔

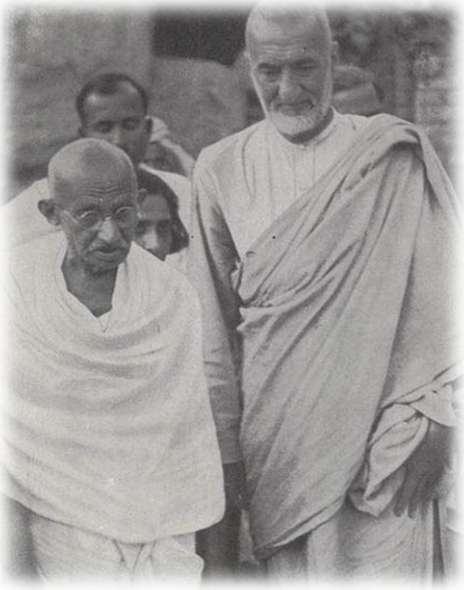

ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ اس خطے میں محمد بن قاسم ایک مسلمان بہن کی دہائی پر پہنچا تھا کہ راجہ داہر جیسے سفاک اور ملحد نے مسلمانوں کے ایک جہاز پر ناجائز قبضہ کر کے تمام مسلمان مردوں کو شہید کر دیا تھا اور تمام مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو لوٹ لی تھی۔ یہ وہی ہندو راجہ داہر ہے جس نے پہلے ہی اپنی سگی بہن کو زبردستی اپنے حرم میں شامل کر رکھا تھا اور اس کے اس بہیمانہ فعل کی خود ہندو بھی مذمت کرتے تھے۔ اسی محمد بن قاسم نے نہ صرف مسلمان بہنوں کو اس کے قید خانے سے رہا کروایا بلکہ وہاں کی رعایا کو بھی اس کے جبر سے آزاد کروایا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں مقیم بے شمار ہندو قبیلے محمد بن قاسم کے دور میں اس کے حسنِ سلوک سے مسلمان ہوئے اور اسی کے نتیجہ میں اس خطے میں اسلام داخل ہوا جس کی بنیاد پر آج بھی سندھ کو "باب السلام" کہا جاتا ہے اور سینیٹر حاجی عدیل کے خاندان نے بھی شائد اسی وجہ سے اسلام قبول کیا ہو گا جس کی بنیاد پر عدیل خان فریضہ حج ادا کر کے اب حاجی کے لقب کو اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں' اگر سینیٹر حاجی عدیل راجہ داہر جس نے اپنی سگی بہن کو جبراً اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا تھا' اس کو اپنا ہیرو مانتے ہیں تو بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اس کیلئے انہیں اپنے ان تمام القاب سے دستبردار ہونا پڑے گا اور یہ کام ان کیلئے

اور بھی بہت آسان ہو جائے گا اگر وہ راجہ داہر کی اولاد کے پاس اپنے پڑوس میں تشریف لیجائیں کیونکہ اس فعل کے بعد ان کے صوبے کے غیور مسلمان پختون یقیناً ان سے حکمرانی کا حق واپس لے لیں گے۔

ان کے اکابرین عبدالغفار خان جو سرحدی گاندھی کے نام سے زیادہ مشہور تھے' قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی جس کی بناء پر صرف اسی صوبے میں باقاعدہ ریفرنڈم کروایا گیا اور اس صوبے کے لوگوں نے ایک واضح اکثریت کے ساتھ پاکستان کے حق میں ووٹ دیا جس کی وجہ سے یہ خطہ پاکستان کا حصہ بنا۔ ان کے اکابرین آج تک اس رسوائی کو بھول نہیں پائے اور اسی سرزمین پر انکی سیاست میں ہمیشہ پاکستان مخالف جذبات ہمیشہ سرِ فہرست رہے۔ اس جماعت کے بانی عبدالغفار خان نے باقاعدہ اس بات کی وصیت کی کہ ان کو پاکستان میں دفن بھی نہ کیا جائے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو افغانستان میں دفن کیا گیا۔ اسی پارٹی کے دوسرے سربراہ جناب ولی خان جو عبدالغفار کے فرزند تھے' نے اسی سرزمین پر بیٹھ کر اس ملک کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح پر باقاعدہ جھوٹے الزامات اور بہتان پر مبنی ایک کتاب بھی تحریر کی جس کو پاکستان میں تو کوئی پذیرائی نہ مل سکی لیکن جن کے ایماء پر یہ ساری کاوش کی تھی وہ بھی آج اس بھونڈی حرکت پر شرمندہ ہیں۔

اب اسفندیار ولی پختونوں کا مقدمہ امریکا بہادر کے پاس لیکر گئے لیکن آج تک اس مقدمے کی تفصیل سامنے نہیں آسکی کہ اس مقدمے کے مندرجات کیا ہیں' کس کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا ہے اور آخر یہ مقدمہ امریکا ہی کے پاس کیونکر لیکر گئے ہیں جس کو وہ ساری عمر ایک استعماری اور جارح قوت کے نام سے پکارتے رہے ہیں؟؟؟ سرحدی گاندھی عبدالغفار کو بھارت نے اپنے ہاں بلا کر لاکھوں روپے کی پوٹلی آخر کس خدمت کے عوض عطا کی تھی 'ابھی تک اس سوال کا جواب بھی باقی ہے؟

پاکستانی عوام نے فراخ دلی سے اس جماعت کے افراد کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عربی کا ایک بہت ہی مشہور مقولہ کے مصداق کہ "ہر شئے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے" اب ان افراد کا سفر اپنے اصل کی طرف شروع ہو گیا ہے 'راجہ داہر کو ہیرو ماننے والے بالآخر انہی میں سے ہیں اور ان کے پاس جانے کیلئے ان کو زیادہ دقت بھی نہیں ہو گی 'بس پاکستان کو خیر باد کہیں اور سرحد پار ان سے جا ملیں جن کے نغمے دن رات الاپتے ہیں!

رہے نام میرے رب کا جس کے ہاتھ میں عزت و ذلت ہے!

بروز منگل 13 جمادی الاوّل 1431ھ 27/ اپریل 2010ء

کئی رموز ہیں پنہاں.....!

پاک وہند کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو غور و فکر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قیام پاکستان کی بنیاد کئی صدیاں پہلے رکھ دی گئی تھی اور بعد ازاں تاریخ حالات کو اس مقصد کے سانچے میں ڈھالتی رہی' اسی لئے بعض مئورخین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیام پاکستان ناگزیر تھا اور یہ مشیتِ ایزدی تھی۔ غور کیجئے تو صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخی سفر کے بعض اہم مقامات اور سنگ میل اس کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستان کی تواریخ میں سے تاریخ فرشتہ کو ایک معتبر حوالہ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ فرشتہ کے صفحہ نمبر 101 پر درج شہاب الدین غوری کا لکھا ہوا ایک خط پڑھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ شہاب الدین غوری نے یہ خط ہندوستان کے مشہور ہندو حکمران راجہ پرتھوی راج کے خط کے جواب میں کئی صدیاں قبل 1192ء میں لکھا تھا۔ ترائن کے میدان میں مسلمان اور ہندو افواج ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ پس منظر کے طور پر یہ بات ہمارے ذہنوں میں رہے کہ شہاب الدین غوری دو سال قبل پرتھوی راج سے شکست کھا چکا تھا اور اب ایک فیصلہ کن معرکے کے لئے میدان میں اترا تھا۔ پرتھوری راج ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت کا سمبل اور مضبوط ترین سمجھا جاتا تھا اور اسے ہندو راجاؤں کی پوری حمایت حاصل تھی۔

جنگ سے قبل غوری نے پرتھوی راج کو باہمی صلح کے لئے جو خط لکھا اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ یا تو موجودہ صوبہ پنجاب، سرحد اور سندھ کے علاقے میرے حوالے کر دو یا پھر فیصلہ کن جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ ان علاقوں کے مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ ان میں مسلمان مقابلتاً زیادہ تھے لیکن حکومت کے ظلم و ستم کے شکار تھے۔ بلوچستان اس اسکیم میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہاں پہلے ہی مسلمانوں کی حکومت قائم تھی۔ بہر حال پرتھوی راج طاقت کے نشے میں مست تھا۔ اس نے غوری کی صلح کی مشروط پیشکش کو ٹھکرا دیا اور یہ علاقے دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجے کے طور پر جنگ ہوئی جس میں پرتھوی راج اور اس کے سینکروں ساتھیوں کو شکست فاش ہوئی جو اپنے اپنے علاقے کی افواج کے ساتھ اپنے دھرم کے مطابق اس مقدس جنگ میں شریک تھے' پرتھوی راج مارا گیا ہندوؤں کی کمر ٹوٹ گئی اور غوری نے اس علاقے پر قبضہ کر کے قطب الدین ایبک کو حکمران نامزد کیا جس نے 1193ء میں دہلی پر قبضہ کر کے ہندوستان میں باقاعدہ ایک مسلمان حکومت کی بنیاد رکھی۔ جنگ ترائن کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کے مقدر کا فیصلہ کر دیا اور ایک مسلمان حکومت کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔

غوری کا خط ہمارے لئے غیر معمولی انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے اور انکشاف کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جو گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں لیکن اس موضوع کی طرف بڑھنے سے قبل یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی تھی جو ان علاقوں سے کہیں کم تر رقبے پر محیط تھی۔ محمد بن قاسم 712ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا' فتوحات کرتے کرتے ملتان تک پہنچا اور صرف تین برس

کے بعد 715 ء میں واپس بلالیا گیا۔ محمد بن قاسم کی رخصتی کے کچھ ہی عرصہ بعد مسلمان مملکت کمزور ہو گئی اور پھر سرداروں اور حکمرانوں کی بغاوتوں کے سبب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ اس لحاظ سے صحیح معنوں میں ایک بڑی اسلامی حکومت کے قیام کا کریڈٹ قطب الدین ایبک کو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام علاقوں میں موجودہ پاکستان پر مشتمل 1192 ء تک مسلمان آبادی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت قدرے زیادہ کس طرح ہو گئی جبکہ 1192 ء تک یہاں کوئی مستحکم اسلامی حکومت بھی قائم نہیں تھی۔ بلاشبہ مسلمان حملہ آور اس دوران حملہ کرتے رہے اور اکثر اوقات مال غنیمت لے کر واپس لوٹ جاتے رہے۔

997ء سے لے کر 1030ء تک محمود غزنوی نے ہندوستان پر 17 حملے کئے جن سے مقامی ہندو ریاستیں کمزور ہوئیں' مسلمان دشمن قوتوں کی کمر ٹوٹی، مسلمانوں کو بالواسطہ تقویت ملی لیکن محمود غزنوی نے بھی ہندوستان میں کسی اسلامی ریاست کی بنیاد نہ رکھی اور اکثر اوقات یہاں سے مال غنیمت لے کر واپس وطن لوٹ گیا گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندو اور مغربی مؤرخین کا یہ الزام غلط ہے کہ یہاں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا کیونکہ جنگ ترائن تک ہندوستان میں نہ کوئی اسلامی حکومت موجود تھی اور نہ ہی مسلمانوں کو اتنی طاقت حاصل تھی کہ وہ بزور شمشیر اسلام پھیلا سکتے۔ ہوا یوں کہ بہت سے اولیائے کرام' صوفیاء اور صالحین اس عرصے میں ہندوستان آ کر آباد ہوئے جن میں خاص طور پر حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش قابل ذکر ہیں جو محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ یہاں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ ان اولیائے کرام کی نگاہ کا فیض تھا کہ مقامی آبادیوں کے دل مسخر ہوتے گئے اور وہ صدیوں کے سفر میں اس طرح حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ 1192ء تک موجودہ سندھ ، سرحد اور پنجاب کے علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی مقابلتاً زیادہ ہو گئی اور یوں قیام پاکستان کی راہ ہموار ہوتی گئی۔

اس مسئلے کے منتخب پہلوؤں پر غور کریں تو ان میں بڑی حکمت کے پوشیدہ راز کھلتے ہیں اور مشیت ایزدی کے واضح اشارے ملتے ہیں غور طلب بات یہ ہے کہ اولیائے کرام تو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے جن میں دہلی، سرہند اور اجمیر شریف خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ان علاقوں میں مسلمان اکثریت میں کیوں نہ ہو سکے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان ان صوبوں یا علاقوں میں اکثریت میں ہوئے جو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے ملحق اور آپس میں پیوست تھے' ورنہ اگر مسلمان سرحدیں اکثریت میں ہوتے تو پھر یوپی یا ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں اکثریت میں ہوتے تو کیا پاکستان کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا یا اسے منوایا جا سکتا تھا؟ جواب نفی میں ہے کیونکہ پاکستان کے مطالبے کی بنیاد ہی یہی تھی کہ صوبہ پنجاب، سرحد سندھ اور بلوچستان اور بعد ازاں مشرقی بنگال جہاں اکثریت میں ہیں اور جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ان علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان مملکت قائم کر دی جائے جہاں مسلمان اپنے دین، ثقافت اور مذہب کے مطابق زندگی گزار سکیں، گویا یہ مشیت ایزدی تھی کہ مسلمان ان علاقوں میں اکثریت میں ہوئے جو جغرافیائی طور پر ایک یونٹ تھے۔ اس لحاظ سے پاکستان کی بنیاد اسی وقت رکھ دی گئی جب شہاب الدین غوری نے صلح کیلئے پرتھوی راج سے ان علاقوں کا مطالبہ کیا۔ اسی پس منظر میں حضرت قائداعظم نے علی گڑھ میں 1944ء میں خطاب کے دوران کہا تھا کہ پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جس دن ہندوستان کی سرزمین پر پہلے مسلمان نے قدم رکھا کیونکہ مسلمان ایک مخصوص انداز زندگی' ایک منفرد کلچر اور سوچ کی نمائندگی کرتا ہے جو ہر لحاظ سے ہندوستان کی دوسری اقوام سے مختلف اور الگ ہے اور "یہ تاریخی جملہ قائداعظم نے اس کئے کہا تھا کہ ہندو مذہب میں جو بچہ جس گھر میں پیدا ہوتا ہے اس کی شناخت اپنے باپ کے مذہب سے پہچانی جاتی ہے اور یہ مذہبی طبقاتی تقسیم

نے ہندوؤں کے درمیان نفرت اور تذلیل کی ایک گہری خلیج حائل کر رکھی ہے لیکن جس دن ہندوستان میں رہنے والا پہلے شخص نے اسلام کے الہامی دین کو قبول کیا تو گویا اس نے مکمل طور پر اپنی پرانی شناخت سے ناطہ توڑ کر ایک ایسے مذہب کو قبول کر لیا جس نے اس کے زندگی کے تمام ضابطہ حیات کو ہندوؤں سے بالکل الگ کر دیا۔ "اس کی مزید تشریح ڈائریکٹر "لندن انسٹیوٹ آف ساؤتھ ایشیا" بریگیڈیئر عثمان خالد کی مشہور زمانہ کتاب "سائوتھ ایشیا کی مستند آوازیں" کے صفحہ نمبر 171 میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مجھے ہندوستان کی تاریخ میں مسلمان اور اسلام میں گہرا ربط نظر آتا ہے اور وہ یوں کہ جب بھی اسلام کو کوئی چیلنج درپیش ہوا یا مسلمانوں کے وجود کو صحیح معنوں میں کسی خطرے کا سامنا ہوا تو ایسی قوتیں نمودار ہوئیں جنہوں نے ان چیلنجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو ان خطرات سے بچانے کے لئے تحریکیں چلائیں۔ تاریخی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں نے 680 برس تک حکومت کی اور ان کے کل 76 بادشاہ ہوئے ۔ سب سے طاقتور حکومت مغلیہ خاندان کی سمجھی جاتی ہے جس کے دور میں اکبر کے دین الٰہی کی صورت میں ہندوستان میں اسلام کو سب سے پہلے ایک سنجیدہ چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت مجدد الف ثانی اکبر کے دین الٰہی کی راہ میں سد سکندری بنے اور انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ مغلیہ خاندان کی حکومت ماسوائے اورنگزیب عالمگیر کے ' ایک لبرل حکومت سمجھی جاتی ہے جس کے کم از کم دو یا تین بادشاہ ہندو ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس تناظر میں مغلیہ خاندان نے ہندوستان میں اسلام کی کیا خدمت کرنی تھی۔ اسلام تو اندر ہی اندر اولیائے اکرام' صوفیا اور اہل نظر کی برکت سے پھیلتا رہا۔

اورنگزیب عالمگیر کا انتقال 1707 ء میں ہوا اور اس کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی مسلمانوں کے لئے انتہائی ابتلا کا دور تھا کیونکہ اس دوران مسلمان حکومتیں گرنے لگیں' مختلف علاقوں پر مسلمان دشمن قوتیں قابض ہو گئیں اور مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے۔ انگریز اکبر کے دور میں تجارتی مقاصد کے پیش نظر ہندوستان میں آئے تھے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پھیلاتے رہے' اثر و رسوخ میں اضافہ کرتے رہے اور اپنی عسکری قوت بڑھاتے رہے چنانچہ انگریزوں نے 1757 ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا' 1799 ء میں ٹیپو سلطان کو شکست دے کر اس کی سلطنت پر قابض ہو گئے تھے' 1764ء میں بکسر کی لڑائی میں مغل بادشاہ شاہ عالم کی شکست کے بعد دہلی کی حکومت بھی انگریزوں کے سامنے سرنگوں ہو گئی' 1808 ء میں رنجیت سنگھ نے پنجاب میں سکھ حکومت کی بنیاد ڈالی اور پنجاب میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا' حتیٰ کہ شاہی مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا۔

مسلمانوں کے اس تنزل اور ابتلا کے دور میں شاہ ولی اللہ نے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی' مسلمانوں میں جہاد بیدار کرنے کے لئے منظم پروگرام شروع کیا' مسلمان دشمن قوتوں کو کمزور کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو حملے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان سرداروں کو خطوط لکھے جن کے مطالعے سے مسلمانوں کی نفسیات اور سوچ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان خطوط کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اور اسلام کی بقا کے لئے کچھ علاقوں میں مسلمان حکومتوں کا قیام ضروری ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سوچ تحریک پاکستان کی بنیاد بنی' یہی بات علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد اور قائداعظم کے نام خطوط میں بار بار کہی اور خود قائداعظم بھی اکثر اوقات اس سوچ کا اظہار کرتے رہے۔ دراصل یہ وہ خواب تھا جو

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد ان کے قومی اور اجتماعی لاشعور میں پلتا رہا اور بالاخر اسی خواب کی تعبیر ان کو مطالبہ پاکستان میں نظر آئی۔

شاہ ولی اللہ کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارلحرب قرار دیا اور سید احمد شہید نے پنجاب کے مسلمانوں کو رنجیت سنگھ کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے جہاد کا آغاز کیا۔1826 ء میں جہادی قافلے صوبہ سرحد کی جانب روانہ ہوئے۔ مجاہدین نے پہلا اور دوسرا مقابلہ جیت کر سرحد پر قبضہ کر لیا'1827 ء میں سید احمد شہید صوبہ سرحد کے امیر المومنین مقرر ہوئے اور انہوں نے شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ رنجیت سنگھ خود پشاور پہنچا اور کچھ قبائلی سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا جن میں یار محمد اور سلطان محمد قابل ذکر ہیں۔ بالاکوٹ کے فیصلہ کن معرکے میں یار محمد مجاہدین کو عین جنگ کے دوران چھوڑ گیا' اپنے باورچیوں کے ذریعے شاہ صاحب کو زہر دلوا دیا۔ 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید ہو گئے'یوں شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کا آغاز 1731 ء میں کیا تھا وہ ایک صدی کے بعد 1831 ء میں ختم ہو گئی۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کا ارادہ تھا کہ وہ اس خطے کے مسلمانوں کو سکھوں سے نجات دلا کر انگریزوں کے خلاف جہاد کریں گے لیکن ان کا یہ خواب ادھورا رہا۔ اسے کسی اور شکل وصورت میں کسی اور طریقے سے شرمندہ تعبیر ہونا تھا قدرت کو یہی منظور تھا۔ دوسری طرف انگریز آہستہ آہستہ اپنا جال پھیلا رہے تھے اور ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لئے شاطرانہ چالیں چل رہے تھے۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور شاہ عالم کی فوجوں کو شکست دینے کے بعد وہ ایک مئوثر عسکری قوت بن کر ابھر چکے تھے' انگریزوں نے اسی حکمت عملی کے تحت 1843 ء میں سندھ کا الحاق اور 29
مارچ 1849 ء کو پنجاب کا اپنے ساتھ الحاق کر کے ان صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ 1856 ء میں انگریزوں نے اودھ کے فرمانروا میر واجد علی کے سسر اور وزیر اعظم میر علی نقی کو اپنے ساتھ ملا کر واجد علی سے دستخط کروا کر اودھ پر قبضہ کر لیا اور میر واجد کو کلکتہ کے منیا برج میں قید کر دیا۔

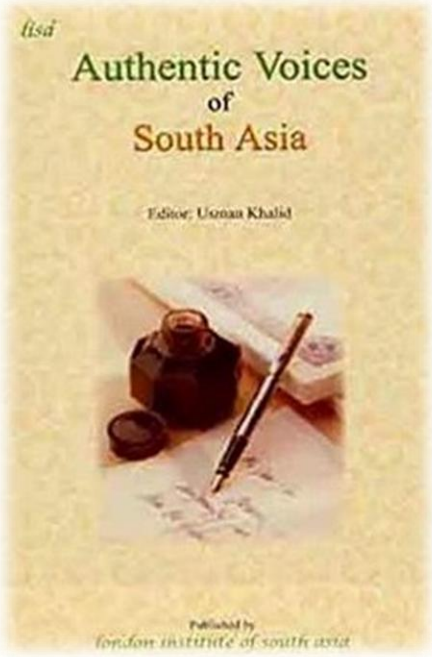

ایک مئورخ کے بقول تین میروں نے ہندوستان میں مسلمان مملکتوں کے مقدر کا فیصلہ کر دیا ۔میر جعفر نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ سے غداری کر کے مسلمانوں کو بنگال کی حکومت سے محروم کر دیا، میر صادق نے ٹیپو سلطان سے
سلطان سے غداری کر کے مسلمانوں کو میسور کی مملکت میں حکمران سے غلام بنا دیا اور میر علی نقی نے میر واجد سے دستخط کروا کر اودھ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت مضبوط بنانے اور سرحد میں مجاہدین سے گفت وشنید اور ان کی شکست میں لاہور کی فقیر فیملی کے ایک سربراہ کا بھی مئورخین ذکر کرتے ہیں جسے رنجیت سنگھ کے دربار میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ انتہائی مشہور شخصیت معیز الدین احمد فرزند مولانا صلاح الدین احمد مرحوم تو دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے پنجاب سیکرٹریٹ کے قلعے انارکلی (آرکائیوز) میں محفوظ پنجاب کے انگریز حاکم کا وہ فرمان اپنے آنکھوں سے پڑھا ہے جس کے مطابق

لاہور کے ایک معروف خاندان کو فوری طور پر سید ہونے کا تاج پہنایا گیا تھا' یاد رہے کہ انگریزی زبان کے سرکاری حکم ناموں میں "امیجئٹ افیکٹ" کے الفاظ ضرور استعمال ہوتے ہیں جس کا ترجمہ "فوری طور پر" ہوتا ہے۔

1857ء کی جنگ آزدی کی ناکامی کے بعد انگریز ہندوستان پر چھاگئے' انگریز آئے تو اپنے ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، مواصلات، ریلوے، ماڈرن ایجوکیشن، اور ایک سیاسی کلچر بھی لائے۔ انگریزوں کی پالیسیوں کے سبب ہندوستان میں نیشنلزم کا شعور مضبوط ہوا' سیاسی جماعتیں معرض وجود میں آئیں 'حق رائے دہی اور انتخابات کا ذکر ہونے لگا جس سے محدود جمہوریت اور پھر اکثریت واقلیت کے احساس نے جنم لیا۔

اس صورتحال کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ اقلیت ہونے کے سبب ہمیشہ ہمیشہ اکثریت کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ چونکہ وہ اپنے مذہب، ثقافت، تاریخی پس منظر اور قومی سوچ کے حوالے سے ایک علیحدہ قوم ہیں اس لئے انہیں ایک علیحدہ وطن کے حصول کے لے جدوجہد کرنی چاہئے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید احمد خان سے لیکر قائداعظم تک تقریباً سبھی مسلمان لیڈروں نے اپنے سیاسی کریئر کا آغاز ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کیا لیکن انہوں نے ہندو ذہنی رویے اور تنگ نظری کو قریب سے دیکھ کر اپنی راہیں الگ کر لیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا اہم ترین سنگ میل لکھنؤ پیکٹ 1916ء تھا جس کا خواب 1928ء میں نہرو رپورٹ نے پاش پاش کر دیا حتیٰ کہ قائداعظم جیسے مستقل مزاج انسان کو یہ بھی کہنا پڑا کہ اب ہمارے راستے الگ الگ ہیں علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد 1930ء نے مسلمانوں کو نئی سوچ دی اور ان میں منزل کا شعور بیدار کیا جبکہ 1935ء کے انتخابات کے نتیجے کے طور پر 1937ء میں چھ صوبوں میں کانگریس کی حکمرانی نے مسلمان عوام کی آنکھیں کھول دیں۔ ان وقعات نے قرارداد پاکستان کی راہ ہموار کی اور 1940ء میں مسلمانان ہند و پاکستان نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک علیحدہ اور آزاد وطن کا مطالبہ کر دیا۔

اس کے بعد برطانوی حکومت نے "مسئلہ ہند" کا حل ڈھونڈنے کے لئے بہت سی کوششیں کیں جن کی تفصیل کتابوں میں محفوظ ہے لیکن ساری کوششیں اور اسکیمیں ایک ایک کر کے ناکام ہو گئیں۔ سیاسی پیشرفت کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے روحانی اشارے بھی ملتے ہیں جو مشیت ایزدی کی جھلک دکھاتے ہیں۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مفسر قرآن، عاشق رسولؐ اور روحانی شخصیت تھے۔ ان کے مریدوں اور چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ ایسے فقیر منش اور صوفی انسان سے آپ صرف حق گوئی کی توقع کر سکتے ہیں' مولانا حضرت تھانوی کے خواہر زادے مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت نے مجھے طلب فرمایا اور بتایا:

"میں بہت کم خواب دیکھتا ہوں مگر آج میں نے عجیب سا خواب دیکھا ہے' میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا میدان حشر ہے۔ اس میں اولیاء" کرام، علماء، صلحاء کرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اس مجمع میں عربی لباس پہنے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے تو مجھے بتایا گیا کہ محمد علی جناح آج کل " اسلام" کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے" بحوالہ تعمیر پاکستان اور علماء ربانی از منشی عبدالرحمٰن ادارہ اسلامیات لاہو 1992ء صفحہ نمبر 92۔

4جولائی 1943 ء کو حضرت تھانوی نے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی دونوں کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا' 1940 ء کی قرار داد پاکستان کو کا
میابی نصیب ہو گی 'میرا وقتِ آخر ہے اگر میں زندہ رہتا تو ضرور اس عظیم مقصد کی کامیابی کیلئے کام کرتا 'مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن بنے۔ قیام پاکستان کے لئے جو کچھ ہو سکے کرنا 'اپنے مریدوں کو بھی کام کرنے پر ابھارنا' تم دونوں عثمانیوں میں سے ایک میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا عثمانی جناح صاحب کا جنازہ پڑھائے گا" "بحوالہ قائد اعظم کا مذہب وعقیدہ از منشی عبد الرحمٰن صفحہ 249" اور قائد اعظم کی شخصیت کا روحانی پہلو از حبیب اللہ (1948 ء) ۔ قائد اعظم کی نماز جنازہ کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ مولانا حسرت موہانی ایک مرد درویش، بے لوث عظیم اور بہادر انسان تھے زندگی کا خاصا حصہ انگریزی راج کے خلاف جدوجہد کرنے کی سزا کے طور پر جیلوں میں گزار دیا اور اکثر اوقات سزا بامشقت پائی اس ضمن میں ان کا یہ شعر زبان زد عام ہے۔

اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

مولانا حسرت موہانی نے مسلم لیگ کے کئی اجلاسوں کی صدارت فرمائی اور اتنے دبنگ انسان تھے کہ مسلم لیگ کونسل کے بھرے اجلاس میں اٹھ کر قائد اعظم کی پالیسیوں پر تنقید کرتے اور خود قائد اعظم ان کا بے حد احترام کرتے تھے 'یہاں قائد اعظم کے جمہوری مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غربت کے باوجود گیارہ حج اور بہت سے عمرے نصیب کئے۔ مولانا نے زندگی کا بقیہ حصہ مسلم لیگ میں رہ کر حصول پاکستان کیلئے دن رات جدوجہد میں گزار دیا لیکن قیام پاکستان کے بعد ہندستان میں رہنے کو ترجیح دی کیونکہ ان کی جدوجہد ذات کے لئے نہیں بلکہ قوم وملت کے لئے تھی۔
محترم ظہیر الاسلام فاروقی ایڈووکیٹ اپنی کتاب" مقصد پاکستان'' (لاہور 1981 ء) میں رقمطراز ہیں"1946 ء میں مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں تھا۔ ٹرین میں پیر سید علی محمد راشدی کے ساتھ مولانا حسرت موہانی بھی ہم سفر تھے۔ راشدی صاحب نے مولانا حسرت موہانی صاحب سے پوچھا کہ " کیا مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان مان لیا جائے گا؟" مولانا حسرت موہانی مرحوم نے جواب میں کہا کہ " پاکستان تو بن جائے گا آگے کی فکر کرو" پھر کہا۔
میں نے رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا آنحضور ص ﷺ نے خود اس کی بشارت دی' بعد ازاں میں نے دیوان حافظ سے فال نکالی اور اس کی تضمین میں یہ اشعار کہے۔

جبکہ حافظ بھی مصدق ہو بہ فال دیواں جب کہے خواب میں خود آ کے وہ شاہ خوباں
پردہ بردار کہ تا سجدہ کند جملہ جہاں تجھ کو حسرت یہ مبارک، سند و مہر و نشاں

مولانا حسین احمد کانگریس کے ممتاز لیڈر اور تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے جن کے بارے میں یہ واقعہ میں نے کئی بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ 46-1945ء کے انتخابات کے ضمن میں کانگریس کے لئے ووٹ مانگنے کی غرض سے بنگال کا دورہ کر رہے تھے۔ ان کے ہمراہ بہت سے مریدان اور سیاسی کارکن بھی تھے۔ اس انتخابی مہم کے دوران ایک دن انہوں نے نماز فجر کی امامت کے بعد اپنے محدود حلقے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج

رات مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے' جب مولانا مدنی یہ کہہ چکے تو ایک مرید اٹھا اور اس نے کہا کہ حضرت چلئے اور مسلم لیگ کا ساتھ دیجئے اب اس کے بعد کانگریس کے لئے انتخابی مہم چلانے کا کوئی جواز نہیں' اس کے جواب میں مولانا مدنی نے کہا کہ دینی معاملات میں حضور ﷺ کی پیروی فرض ہے لیکن تکونیی وسیاسی معاملات میں نہیں۔ اب اصحابِ نظر خود ہی اندازہ لگالیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خواب میں پاکستان کی بشارت بھی دی لیکن اس کے باوجود اپنے سیاسی نظریات پر قائم رہے اور ان افراد کی بھی خبر لینے کی ضرورت ہے جو بھارت کی سرزمین کھڑے ہو کر یہ برملا کہتے ہیں کہ ہم نے پاکستان بنانے کی غلطی میں حصہ نہیں لیا لیکن ان پاکستان کی سیاست کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے مفاد سے لطف اندوز بھی ہو رہے ہیں۔

اس ضمن میں بہت سے واقعات مشہور ہیں لیکن میں نے صرف ان ہستیوں کے حوالے دیئے ہیں جن کی امانت و دیانت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ سیاسی محاذ کی پیشرفت بھی قابل غور ہے اور کچھ ایسے ہی اشارے دیتی ہے کہ انگریز بہر حال ہندوستان کو متحدہ رکھنا چاہتے تھے اور وہ اسی فریم ورک میں ہندوستان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے سرگرداں تھے۔ اس ضمن میں بہت سی کوششیں کی گئی لیکن مشیت ایزدی یہی تھی کہ وہ بار آور نہ ہوں، یہاں کابینہ مشن پلان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسے مسلم لیگ نے قبول کر لیا تھا اور یوں حصول پاکستان دس برس کے لئے ملتوی ہو سکتا تھا کیونکہ کابینہ پلان کے مطابق مختلف گروپ دس سال کے بعد اس انتظام سے باہر نکل سکتے تھے۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ پاکستان کا قیام دس سال کے لئے ملتوی نہ ہو چنانچہ کانگریس نے اس پلان کو مسترد کر دیا اور یوں انگریزوں کے پاس ہندستان کو تقسیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔

تقسیم ہند کے اس پہلو پر بھی ذرا غور کیجئے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو جون 1948ء میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن مارچ 1947ء میں وائسرائے بن کر آیا تو حالات کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچا کہ تقسیم کو زیادہ عرصے تک لٹکائے رکھنا نہایت خطرناک ہو گا چنانچہ اس نے برطانوی حکومت کو قائل کیا کہ ہندوستان کو جلد از جلد تقسیم کر کے آزادی دے دی جائے۔ یوں اعلان آزادی اور قیام پاکستان کے لئے 14/ اور 15/ اگست کی نصف شب کا انتخاب کیا گیا جو مسلمانان پاکستان کے لئے نہایت نیک شگون' مبارک اور صاحبانِ نظر و باطن کے لئے مشیت ایزدی کا واضح اشارہ تھا کیونکہ رات "شب قدر" کی تھی' یہ مہینہ رمضان المبارک کا تھا اور 15/ اگست ہمارا پہلا یوم پاکستان جمعتہ الوداع کے روز منایا جانا تھا ۔ یہ رمزیں صرف رمز شناس ہی سمجھ سکتے ہیں' اور یہ اشارے صرف ان کے لئے ہوتے ہیں جن کے باطن منور اور دل شفاف ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے توہم پرستی' رجعت پسندی اور ضعیف الاعتقادی کا طعنہ دے دیں لیکن مجھے تو یہ اشارے غور فکر کا سامان لگتے ہیں۔ میں ایک ایسے شخص کو جو دنیاوی معیار کے مطابق نہایت پڑھا لکھا تھا یہ سمجھانے کی کوششیں کر رہا تھا کہ پاکستان ایک منفرد قسم کا ملک ہے اور اگر آپ اس کے خمیر اور ضمیر میں جھانکیں تو غور و فکر کا بے پناہ ساماں ملتا ہے کہ اسے کس طرح مشیت ایزدی نے صدیوں تک تاریخ کے سانچے میں ڈھالا اور پھر دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک بنا کر دنیا کے نقشے پر ابھارا۔ اس تناظر میں ان کا یہ سوال ایک فطری رد عمل تھا کہ پھر 1971ء میں پاکستان کیوں ٹوٹ گیا؟ اقبال کے الفاظ میں تو اس سوال کا جواب کچھ یوں ہے۔

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

اگر آپ کو قدرت کی جانب سے ایک تحفہ یا انعام عظیم ملے تو اس کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں اور اگر آپ وہ تقاضے پورے نہ کریں تو پھر وار ننگ ملتی ہے اور کبھی کبھی سزا بھی' مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی صورت میں ہمیں ایک انعام عظیم بخشا جو ہماری کوتاہیوں، کم نظری سیاسی ہوس اور نالائقی سے نصف رہ گیا البتہ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ مشرقی پاکستان آج بھی مشرقی پاکستان ہے صرف ان کا نام بدلا ہے وہ اپنے مزاج، ہندو دشمنی، اسلامی پس منظر اور فکر و نگاہ کے حوالے سے اب بھی مشرقی پاکستان ہی ہے لیکن اس سانحے میں بھی ایک ایسا نقطہ پنہاں ہے جس پر غور کریں تو حیران کن اشارے ملتے ہیں اور فہم و فراست کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے کہ بظاہر پاکستان توڑنے کی ذمہ داری تین سیاسی کرداروں پر عائد کی جاتی ہے جبکہ چوتھا کردار فوجی تھا۔ ذرا قدرت کے انتقام پر غور کریں کہ وہ تینوں سیاسی کردار یعنی اندرا گاندھی' شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو غیر فطری موت کا نشانہ بن کر عبرت کی داستانیں چھوڑ گئے رہا چوتھا فوجی کردار یحییٰ خان تو وہ بھی گھر کی قید میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا' اور اپنے پیچھے عبرت کی کہانیاں چھوڑ گیا۔ عالمی تاریخ گواہ ہے کہ ملک بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں سکڑتے اور پھیلتے رہتے ہیں اور قوموں کے جغرافئے بھی بدلتے رہتے ہیں ابھی کل کی بات ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے روس "یو ایس ایس آر" نامی ایک سپر پاور ٹوٹ کر کئی آزاد مسلم ممالک کو جنم دیا' پولینڈ، بوسنیا اور سربیا وغیرہ کی تاریخ ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے لیکن مجھے عالمی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملی جہاں ملک ٹوٹنے پر کسی گوربا چوف کو پھانسی چڑھایا گیا ہو یا کسی ذمہ دار کردار کو سبق آموز سزا ملی ہو جبکہ پاکستان میں قدرت کا یہ انتقام صرف ایک نسل تک محدود نہیں رہا۔

میں نے عرض کیا کہ غور کرنے والوں کے لئے اس میں عبرت کا بے پناہ ساماں موجود ہے' کبھی آپ نے غور کیا کہ پاکستان توڑنے والے تین کرداروں (شیخ مجیب الرحمان' مسز اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو) کی غیر فطری اور عبرت ناک موت کے بعد ان کی آئندہ نسل میں سے بھی کسی کو موت نصیب نہیں ہوئی' کیا یہ سب کچھ محض اتفاقیہ ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ اتفاق صرف سقوط مشرقی پاکستان کے تین کرداروں کے مرد کو فطری ساتھ ہی کیوں ہوا؟ پھر سبھی کرداروں کے ساتھ کیوں ہو؟ میں خلوص نیت سے سمجھتا ہوں کہ قیام پاکستان کی تاریخ میں مشیت ایزدی کے واضح اشارے ملتے ہیں اور اس کی بشارت ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار دی تھی' اس لئے جو بھی اس ملک کی صحیح معنوں میں خدمت کرے گا وہ اس دنیا میں اور اگلے جہان میں بھی عزت پائے گا اور جو اسے کسی بھی طرح نقصان پہنچائے گا وہ یہاں اور وہاں بھی ذلیل و خوار ہو گا۔
کچھ بھی تو نہیں رہے گا، کچھ بھی تو نہیں بس نام رہے گا اللہ کا!

انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردوں میں دن کی روشنی بھی ہے

بروز جمعرات 15 جمادی الاوّل 1431ھ 29/اپریل 2010ء

نیا درسِ حکمت

سرزمینِ افغانستان اور عراق کو امریکی جارحیت کا نشانہ بنے تقریباً نو برس ہونے کو ہیں، قصرِ سفید کے امریکی فراعین اب بھی اپنے مخصوص انداز میں دنیا کو للکار رہے ہیں کہ،، دہشت گردی اور تہذیب کے درمیان جنگ میں جانبداری کو کوئی گنجائش نہیں، اگر ہم نے ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو اس کا مطلب دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور مزید دہشت گردی پر ابھارنا ہو گا"۔

غار نگری کے ان طویل آٹھ برسوں کے بعد، باراک اوبامہ کے پاس بھی اپنے ملک میں بسنے والی خلائی مخلوق کو بتانے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے پیشرو کے ان تمام مظالم کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کس طرح قصرِ سفید پر حاوی صہیونی طاقتوں کے گماشتے تیل کے ذخائر پر قبضہ جمانے ،نیو ورلڈ آرڈر کے فتنہ ساماں ایجنڈے کی تکمیل اور امریکی قہر و غضب کی دھاک بٹھانے کیلئے اک طرف "نائن الیون" اور دوسری طرف تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا ڈرامہ رچایا۔ ٹونی بلیئر سے مل کر جھوٹی انٹیلی جنس رپورٹس بنوائیں، پھر اپنی قوم کو ڈرانے کیلئے ایک ہولناک تخیلاتی خطرہ تخلیق کیا۔ اقوام متحدہ کے انسپکٹر چیختے رہے کہ ہم نے عراق کا چپہ چپہ چھان مارا ہے، وہاں کوئی ایسا ہتھیار نہیں ملا۔ عراق پر قبضے کے بعد امریکی معائنہ کاروں نے پورا ملک کھنگال ڈالا اور تھک ہار کر بالآخر انہوں نے بھی ایسے ہتھیاروں کی موجودگی سے انکار کر دیا، اس امریکی کمیٹی کے سربراہ نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ اگر امریکا واقعی مہذب ملک ہوتا اور باراک اوبامہ عظمتِ کردار کا ادنیٰ سا بھی جوہر رکھتے تو وہ ایک بلاجواز جنگ پر ان دونوں متاثرہ ممالک سے ساری دنیا کے سامنے معافی مانگتے اور فوری طور پر اس جنگ کے ذمہ داروں پر عالمی عدالتوں میں مقدمہ چلانے کا اعلان کرتے اور اس بات کا اعلان بھی کرتے کہ اس جنگ کی آگ دہکانے والے مجرموں نے ساری دنیا سے جھوٹ بولا تھا، دنیا کو ڈرا کر ایک مکروہ مقصد کیلئے دنیا کی تائید حاصل کی تھی لیکن انہوں نے بھی پچھلے دنوں بگرام کے ہوائی اڈے پر اپنے فوجیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کسی ندامت کے شائبے کے بغیر دنیا کو ایک نیا درسِ حکمت دینا شروع کر دیا۔

کوئی تہذیب کسی کو طاقت کے بل بوتے پر اپنے سے کمزور کو دبوچ لینے کی اجازت نہیں دیتی، کسی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی فرعونیت کی نمائش کیلئے معصوم انسانوں کی زندگی سے کھیلتا رہے۔ پتھر اور دھات کے زمانوں کی تہذیب نے بھی اس طرح کی خونخواری کو سندِ جواز نہیں بخشا۔ قصرِ سفید کے سابقہ فرعون جارج بش نے اکیسویں صدی کا افتتاح افغانستان کی شکار گاہ سے کیا۔ دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور ملک کا دنیا کے سب سے کمزور ملک پر بلاجواز چڑھ دوڑنا کسی طور پر روا نہ تھا۔ دنیا ابھی لاکھوں بے گناہ افغانیوں کی ہلاکت کا ماتم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ ڈیڑھ سال بعد اس نے عراق کو نشانے پر دھر لیا۔ افغانستان اور عراق پر بارود کے وزن، برسائے جانے والے بموں اور اس آگ میں پھونک دیئے جانے والے ڈالروں کا درست تخمینہ سامنے آئے تو اندازہ ہو سکے گا کہ امریکا نے تہذیب کی کتنی پرورش کی اور انسانیت کی کلغی میں سرخاب کے کتنے پر ٹانکے۔

ایک امریکی سرکاری ویب سائٹ کے مطابق عراق میں شہید کئے جانے والوں کی تعداد 36لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور افغانستان میں شہید کئے جانے والوں کی تعداد تقریباً تین ملین سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ عراق میں اب تک 4708/ امریکی اور افغانستان میں 2715/ امریکی ہلاک ہو چکے ہیں اور تقریباً27ہزار امریکی فوجی شدید زخمی ہوئے ہیں اور ان میں سے بائیس فیصد عمر بھر کیلئے معذور ہو گئے ہیں۔ اب تک ان دونوں ممالک میں امریکا کا جنگ پر (تقریباً دس کھرب ڈالر) خرچ ہو چکا ہے، یعنی دوسرے الفاظ میں 839 کھرب پاکستانی روپے سے زیادہ اس جنگ کی آگ میں پھونک دیئے گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ دنیا کا کوئی ہوش مند انسان امریکی رویے کو تہذیبِ انسانی کے کسی بھی معیار پر کیسے درست قرار دے سکتا ہے۔ اب باراک اوبامہ بھی بالکل بش ہی کی زبان بول رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں،، دہشت گردی اور تہذیب کے درمیان کوئی تیسرا منطقہ نہیں ہوتا۔،، ان فراعین کے اصول کے مطابق وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، مکروہ درجے کی دہشت گردی ہے، ایسی دہشت گردی جو آنے والے کئی زمانوں تک انسانی تاریخ کے ماتھے کا بدنما داغ بنی رہے گی۔

پینٹاگون کا کہنا ہے کہ اب تک 6447/ امریکی فوجی ہلاک ہوئے ہیں، فلوجہ ،بصرہ، بغداد، کربلا اور کابل، قندھار، بگرام میں کھلی اور چھپی امریکی درندگی کا نشانہ بننے والوں کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں، شائد اس لئے کہ وہ،، بے مایہ،، انسان تھے۔ ان کی ماؤں نے انہیں اپنی کوکھ سے جنم دینے کی بجائے کھجور کے پتوں سے توڑا تھا، اس لئے ان کا لہو پانی سے زیادہ ارزاں اور ان کی جانیں سوکھے پتوں سے زیادہ حقیر تھیں۔ دجلہ ،فرات، کابل، قندھار کی سرزمین میں رزقِ خاک ہو جانے والوں کے اعداد و شمار سامنے آ بھی جائیں تو کیا ہو گا؟ اصل چیز تو دلوں کے اندر کی بستیاں ہیں جو کھنڈر ہو گئیں، روح و فکر کے اندر کی وہ چٹانیں ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں میں تبدیل ہو گئیں ہیں۔ ان بستیوں، ان چٹانوں اور ان آتش فشانوں کے گوشوارے کون مرتب کرے گا اور ان کے اندر کھولتے لاوے کی مقدار کا تعین کیسے ہو گا؟ امریکا کو کچھ اندازہ ہے اس نے کتنے سینوں کو بارود خانہ بنا دیا ہے؟

باراک اوبامہ نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا..... "دنیا اب زیادہ پر امن اور امریکی زیادہ محفوظ ہو گئے ہیں۔ "ابھی تک کوئی مستند آلہ ایجاد نہیں ہو سکا جو نفرتوں اور محبتوں کا پیمانہ جانچ سکے۔ اعداد و شمار کا کوئی ایسا فارمولہ بھی سامنے نہیں آیا جو متعین طور پر بتا سکے کہ افغانستان اور عراق کی مہمات کے بعد امریکی وقار میں کتنا اضافہ ہوا ہے اور کتنے انسانوں کے دل نفرت و انتقام کے جذبوں سے لبالب بھر گئے ہیں؟؟ زور زبردستی والوں کی سوچ ذرا مختلف ہوتی ہے، وہ اپنے اوزان اور اپنے پیمانے رکھتے ہیں، جارج بش اپنے طور پر مطمئن ہو گا کہ اس کا،، کروسیڈ،، کامیابی سے آگے بڑھتا ہوا پاکستان کے شمال مغربی پہاڑوں تک آن پہنچا ہے، اپنی مرضی کے جن افراد کو اس نے این آر او کے تحت پاکستان کے ایوانِ اقتدار تک پہنچایا تھا وہ اب بھی بڑی کامیابی کے ساتھ ان کے ایجنڈے کو آگے بڑھا رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہ شکست و ہزیمت کی رسوائیاں ان کا مقدر بنتی جا رہی ہیں۔

دہشت گرد اسلامی تحریکوں اور امریکی پالیسیوں پر گہری نظر رکھنے والے معروف امریکی صحافی اور محقق لارنس رائیٹ کا کہنا ہے:

"One line of thinking proposes that the American tragedy of September 11th, was born in the prisons of Egypt."

"ایک نقطہ نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ 11 ستمبر کے امریکی المیے نے دراصل مصر کے قید خانوں میں جنم لیا تھا۔" لارنس کا مفہوم یہ ہے کہ مصر میں اخوان المسلمون اور دیگر پرچم برداروں پر جیلوں کے اندر جو ہولناک مظالم ڈھائے گئے، وہ مغرب اور امریکا مخالف جذبات میں ڈھل گئے، نوجوانوں کے سینوں میں اپنی بزدل حکومتوں اور ان کے سرپرستوں کے خلاف نفرت و انتقام کی ایسی آگ بھڑک اٹھی جو ٹھنڈی ہونے میں نہیں آرہی۔

نفرتیں بونے، اشتعال اگانے اور انتقام کاشت کرنے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کابل سے قندھار، فلوجہ سے بغداد، قلعہ جنگی سے کربلا اور بگرام سے گوانتاناموتک اور امریکی فراعین کہتے ہیں کہ دنیا زیادہ پرامن اور امریکی زیادہ محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہ بہت بڑا جھوٹ ہے۔ ہاں! جس دن امریکا نے اپنی توسیع پسندانہ جبلت، اپنی متکبرانہ ذہنیت اور اپنی سامراجی خصلت پر قابو پالیا اور جس دن انہوں نے واقعی تہذیب کا قرینہ سیکھ لیا، اس دن دنیا واقعی پرامن اور امریکی زیادہ محفوظ ہو جائیں گے..... لیکن اگر وہ،، بموں کی ماؤں،، سے ماؤں کے جگر چھلنی کرتا رہے گا تو مائیں اپنے بچوں کے ماتھوں پر بوسے دیکر انہیں قتل گاہوں کی طرف بھیجتی رہیں گی اور عشاق کے قافلے ان قتل گاہوں سے عَلم چُن کر نئی منزلوں کی طرف سفر کرتے رہیں گے۔

رہے نام میرے رب کا جو زندگی اور موت کا مالک ہے!

یہ سارے ادب آداب ہنر یوں ہی نہیں آجاتے ہیں
عمریں تج دینی پڑتی ہیں اک حرف رقم کرنے کیلئے
میرے مالک مجھ کو غنی کر دے کہ شکست کے بعد
مرا دشمن مری تیغ کا طالب ہے مجھ سے مرے ہاتھ قلم کرنے کیلئے

بروز ہفتہ 17 جمادی الاوّل 1431ھ یکم مئی 2010ء

دجّالی فتنے!

بڑی بڑی سڑکوں، چوراہوں، بلند وبالا پلازوں اور دیگر عمارتوں کی چھتوں پر چمکتے دمکتے اشتہارات، اخباروں کے رنگین صفحات پر مشتمل خصوصی ایڈیشن اور ٹیلیویژن پر بار بار چلنے والے طویل دلکش اشتہارات جس میں ہر طرف پلاٹ کی لوٹ سیل، اپنے خوبصورت گھر کی نوید، گھر جائیداد کے تذکرے اور منافع بخش کاروبار کی ترغیب دیکھتا اور سنتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں، یوں لگتا ہے کہ اس ملک میں ہر طرف خوشحالی ہے، لوگوں کی بھوک پیاس تو ایک عرصے سے ختم ہوگئی ہے، بیروزگاری اور غربت کا نام ونشاں نہیں، امن وامان کا بول بالا ہے اور بس اب ایک یہی کاروبار رہ گیا ہے، ایک ہی لت ہے جو شائد ہر ایک کو لگی ہوئی ہے بس کہیں، کسی بھی جگہ کوئی زمین کا ٹکڑا، کوئی پلاٹ میسر آجائے جو چند سالوں میں مقدر بدل کر رکھ دے گا۔

کوا پریٹو ہاؤسنگ سکیمیں، سرکاری زمینوں پر بننے والی کالونیاں، صحافیوں، افسروں، ججوں، جرنیلوں کیلئے الاٹ کئے گئے بڑے بڑے تجارتی پلاٹ اور وسیع قطعات زرعی اراضی الاٹ کراتے ہوئے صاحبانِ طاقت اور صاحبانِ حیثیت، یہ ملک اور اس کے در وبام اور شہر شہر اس عجیب وغریب ہوس کا جس کو چھت میسر نہیں وہ بھی اسی تگ ودو میں لگا ہوا ہے، چند مرلوں یا گزوں پر اپنی پناہ گاہ یا سر کی چھت تلاش کرلیتا ہے لیکن دوسری شکار ہیں۔ جانب ایک وسیع وعریض گھر میں رہنے والے زمین اور پلاٹوں کی بھوک میں اس قدر حریص ہوگیا ہے کہ اس کا بس نہیں چلتا کہ اس ملک کے ہر شہر، ہر قصبے میں اس کا کوئی پلاٹ یا پھر کوئی زرعی زمین موجود ہو۔

کیا ہم شروع سے ایسے تھے، کیا ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسی ہوس کا شکار تھے، کیا وہ لوگ بھی صبح دفتر آتے ہی فون پر اپنے پلاٹوں کی روزانہ بڑھتی ہوئی مارکیٹ کا اندازہ لگا کر اپنے دل کی ہوس اور تجوریوں کی بھڑاس میں مبتلا تھے، کیا وہ بھی سرکار کی قیمتی زمین ہتھیانے کیلئے بڑے بڑے وزراء، افسران اور حکمرانوں کو قابو میں کیا کرتے تھے؟؟؟؟ یہ وہ سوال ہیں کہ جن کی تلاش میں اگر میں ماضی میں جھانکتا ہوں تو حیران وششدر رہ جاتا ہوں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ انعامات واکرام کی بارشوں نے کیسے لوگوں کو پل بھر میں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا اور کیسے عوام کی اکثریت فاقہ زدہ، بے گھر، بے زمین اور محنت ومزدوری سے رزق کماتے رہ گئی، آنسو اس کے مقدر ہوگئے، ہوس کی یہ کہانی دردناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اگر کسی ملک کے جغرافیے کو تبدیل کرنا ہو تو سب سے پہلے اس ملک اور قوم کے قومی ہیروز ومشاہیر کے بارے میں تشکیک کی فضاء قائم کرو تاکہ وہ قوم اپنے ماضی سے رشتہ ناطہ توڑ کر اپنے وجہ افتخار سے ہاتھ دھو بیٹھے اسی لئے آج مراعات یافتہ طبقہ جو ملک کے وسائل لوٹنے میں دن رات مصروف ہیں اب اسی کام میں مصروف ہیں۔ اسی ارضِ پاکستان پر قومی مشاہیر کا کیا حشر کیا جارہا ہے۔ ایک دفعہ پھر ایک منظم سازش کے تحت پاکستان کے بارے میں غلط فہمی پیدا کی جارہی ہے کہ انہوں نے قیامِ پاکستان کے مطالبے سے منہ پھیر لیا تھا اور آخری عمر میں اشتراکی نظام کے مصورِ گن گاتے تھے اور اس استدلال کو پنڈت نہرو کی کتاب سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پنڈت نہرو کے اس غلط الزام پر بحث ہوچکی اور قارئین کی اکثریت سے اس کی سند بھی مل چکی ہے لیکن اس قماش کے افراد آئے دن اسی پاکستان کی دھرتی پر کس کے ایجنڈے پر کام کررہے ہیں؟ کبھی یہ بڑی

تحقیر سے علامہ اقبال کے بارے میں برملا یہ کہنے میں کوئی حجاب یا جھجک محسوس نہیں کرتے،، آپ لوگوں نے اقبال کو محض اپنا لیڈر بنا رکھا ہے حالانکہ ملکوں کے چند افراد کے سوا کوئی نہیں جانتا،، اور کبھی محسن پاکستان،، ڈاکٹر عبدالقادر کو چور،، کہہ کر زبان درازی کی جرأت کرتے ہیں۔ ان اس کو دو دونوں بیہودہ الزامات لگانے والے،، حسن نثار،، اسی ملک کے ایک کثیر الاشاعت اخبار میں کالم تحریر کرنے کے علاوہ ایک ٹیلیویژن چینل میں ،، چوراہا،، میں بیٹھ کر کم علمی اور جہل خرد کا اکثر اعلان کرتے رہتے ہیں۔

ساری دنیا کو اس بات کا علم ہے کہ لاعلمی کی بناء پر اسی الزام پر ہالینڈ کی عدالت میں ڈاکٹر قدیر پر مقدمہ چلایا گیا تھا اور تمام صہیونی طاقتوں کے دلائل کے باوجود ہالینڈ کی عدالت نے محسن پاکستان ڈاکٹر قدیر کو نہ صرف باعزت بری کر دیا تھا بلکہ ان کے سائنسی علوم اور جدید تحقیق کو ساری دنیا کے سائنس دانوں نے سراہا تھا، اب اتنے سالوں کے بعد اس شتر بے مہار کو کیسے جرأت ہوئی کہ وہ دن دیہاڑے حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ سوال یہ ہے کیا اسرائیل، بھارت، جرمنی، برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک نے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کیلئے کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا تھا؟ امریکا جیسا ملک جس نے دنیا میں سب سے پہلے یہ ٹیکنالوجی حاصل کی، جرمنی سے اس یہودی سائنسدان اور اس کے تین دوسرے ساتھیوں کو اغوا کر کے کیوں لے گیا جس نے سب سے پہلے اس ناپاک جرم کا ارتکاب کیا، اس کے بعد ہی تمام دوسرے ممالک نے اپنی دفاعی ضروریات کیلئے اس ٹیکنالوجی کو ضروری سمجھا لیکن ان تمام ممالک میں تو آج بھی ان سائنس دانوں کو نہ صرف قومی ہیروز سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ اپنی آنے والی تمام نسلوں کیلئے وجہ افتخار بھی ہیں۔

آیئے آج میں پہلے پاکستان سے محبت کرنے والے ان سرفروشوں سے صرف ایک فرد کے ساتھ ملاقات کرواؤں جن کی رگوں میں غیرت، ایمانداری اور پاکستان سے انمٹ محبت اور وفا کا خون گردش کرتا تھا اور پاکستان کے سب سے بڑے صنعتی شہر فیصل آباد کیلئے آج بھی وجہ افتخار ہیں، جن کو ایک لمحے کیلئے بھی ایسے محسن کش افراد کی شکل دیکھنا گوارا نہ تھی!

برسوں سے ایک لاشہ تھا جو ایک ریڑھی پر لوگوں کی توجہ بنا ہوا تھا جس کا ایک مکمل بازو اور دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں مگر دایاں ہاتھ صرف شہادت کی انگلی سے مالا مال تھا، اس کی ریڑھی پر ایک معمولی سی چھتری کے ساتھ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتا رہتا تھا۔ اس کی ریڑھی کے چاروں طرف پاکستان سے محبت کے نعرے درج تھے جو ہر آنے جانے والوں کے خون میں ایک حرارت پیدا کر دیتے تھے۔ بھیک سے انہیں سخت نفرت تھی اس لئے کسی کو اس بات کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کوئی سکہ ان کی طرف اچھال سکے لیکن بہر حال ان کے طعام و قیام کا کوئی ایسا کفیل تھا جو کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ پھر اچانک ایک تبدیلی یہ آئی کہ اسی کفیل نے ان کیلئے ایک ٹرانسسٹر ریڈیو کا اہتمام کر دیا جو ان کے سرہانے ہر وقت خبریں نشر کرتا رہتا تھا۔ بہت سے افراد نے حقیقت جاننے کی کوشش کی لیکن انہوں نے شائد چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

ان کے ریڈیو نے جب 6 ستمبر 1965ء کو بھارت پر پاکستان پر اچانک حملے کی خبر سنائی تو سارے ملک میں جہاں تشویش پیدا ہوئی وہاں اپنا جان و مال قربان
کر دینے کا جذبہ بھی سامنے آیا۔ ریڑھی پر لیٹے اس غیور لاشے میں بھی ایک قیامت سے گرمی اور جوش و خروش پیدا ہوا، اس شہر کے باسیوں نے پہلی مرتبہ ان بند آنکھوں میں دوڑتی ہوئی سرخی اور ہمیشہ سے صرف ہلتے ہوئے ہونٹوں میں قوت گویائی بھی دیکھی۔ تب جا کر اس لاشے کی حقیقت کھلی کہ یہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل انگریزی کے استاد ہیں جو قائداعظم کی اپیل پر تحریکِ پاکستان میں شامل ہو گئے تھے اور اپنے سارے خاندان کے ساتھ جس ٹرین پر پاکستان ہجرت کرتے وقت سفر کر رہے تھے، راستے میں بلوائیوں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا اور سارے خاندان کی قربانی دیکر وہ اس ملک کی خاک کو چومنے کیلئے یہاں پہنچے تھے۔

لوگوں کا ایک جمگھٹا تھا جو پاکستان کے اس سچے عاشق کی ولولہ انگیز تقاریر سننے کیلئے اس کے گرد جمع تھا جو انتہائی نستعلیق اردو اور انگریزی میں اپنے ہم وطنوں سے نہ صرف مخاطب تھا بلکہ دشمن کو اس حالت میں بھی للکار رہا تھا، بار بار ایک اسی بچی ہوئی شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو جذبۂ شہادت کیلئے تیار کر رہے تھے۔ لوگوں کی محبت میں جب اضافہ ہوا تو انہوں نے اپنے کفیل سے کہا کہ وہ انہیں کسی اور جگہ منتقل کر دیں لیکن محبت کرنے والوں نے ان کو ہر جگہ ڈھونڈ لیا اور آخر ایک دن یہ طے پایا کہ پروفیسر عبداللہ خان نوجوان نسل کو پاکستان کی اہمیت اور اس کے مستقبل کے بارے ہفتے میں ایک بار لیکچر دیا کریں گے اور میرے تفاخر میں اللہ نے یہ نعمت لکھ دی کہ میں بھی ان کے شاگردوں میں شامل ہو گیا۔

پاکستان کی تاریخ میں پھر ایک ایسا بھی منحوس دن آیا جب اس پاکستان کو دولخت کر دیا گیا اور یہ غیور لاشہ یہ خبر برداشت نہ کر پایا اور تڑپ کر جاں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اسی سبز ہلالی پرچم کو ان کا کفن بنایا گیا کہ ان کی یہ وصیت تھی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ (لائلپور) فیصل آباد میں اس سے بڑا جنازہ کسی نے نہیں دیکھا اور آج بھی ان کی یاد میں آنکھوں کے کونے بھیگ جاتے ہیں۔ میں اب بھی پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر پاکستان کے یہ عظیم محسن سائنسدان پاکستان کو جوہری طاقت بنانے میں ذرا بھی تاخیر کرتے تو آج خدانخوستہ لاہور کے مال روڈ اور اسلام آباد کی شاہراہِ دستور پر بھارتی بنیاء اپنی دھوتی اور چٹیا کے ساتھ گھوم رہا ہوتا اور حسن نثار اور اس قبیل کے تمام افراد ہندوستانی جھنڈیاں لئے استقبالی لائن میں صف آراء ہوتے۔ کیا اب وہ وقت نہیں آن پہنچا کہ اپنی نئی نسل کو ان دجّالی فتنوں کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے!
رہے نام میرے رب کا جس نے حق و سچ کہنے کا حکم دیا ہے!

بروز سوموار 19 جمادی الاوّل 1431ھ 3 مئی 2010ء

اسلامیانِ ہند کا دیدہ بینا مفکّر

ان دنوں سیکولر ملائیت کے جادو میں مبتلا چند ہندو پاک کے صحافی اور ٹی وی کے شتر بے مہار اینکر پرسن علامہ اقبال کو پاکستان مخالف ثابت کرنے کی مہم میں سرگرمِ عمل ہیں اور اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنے کیلئے چوہدری رحمت الٰہی کی چند تحریروں اور تقاریر کا سہارا لیتے ہیں۔ اس مہم کے محرکات و مقاصد کو سمجھنے کیلئے اسی نوعیت کی پہلی مہم کے احوال و مقامات کی شناسائی ضروری ہے۔ اقبال کو پاکستان کا مخالف ثابت کرنے کی پہلی مہم کا آغاز خود پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی برق رفتار مقبولیت کا اصل راز پالیا تھا، وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ اقبال کی شاعری کا فیضان ہے چنانچہ پنڈت جی نے اپنی کتاب ،، تلاشِ ہند،، میں یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ اقبال پاکستان کے تصور کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس مہم کے دوران مسٹر تھامسن اور مولانا راغب احسن کی سی شخصیات کے استفسار پر علامہ اقبال کے جوابی خطوط کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔ ان خطوط میں اقبال نے بڑی قطعیت کے ساتھ چودھری رحمت علی کی پاکستان سکیم کے ساتھ اپنے تعلق کی نفی کی تھی اور اقبال کی نگاہ میں وہ ایک فاشسٹ طرز کی اسکیم لگتی تھی، اس کے برعکس اقبال کا مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا تصور ایک جدید عوامی جمہوری مملکت کا تصور تھا۔

چوہدری رحمت علی، ٹوانہ خاندان کے بچوں کے اتالیق بنا کر انگلستان بھجوائے گئے تھے (تفصیلات کیلئے دیکھئے: اقبال دی سپر چوئل فادر آف پاکستان۔ سنگِ میل) اور ملازمت ختم ہونے کے بعد ان کا مستقل قیام برطانیہ میں ہی رہا۔ چودھری صاحب کی نت نئی پاکستان اسکیموں سے اسلامیانِ ہند کے فکری انتشار کو بھی ہوا ملی۔ 1940ء کے اجلاس لاہور کے مقابلے میں انہوں نے کراچی میں اپنا اجلاس کر کے قائدِ اعظم کی شان میں گستاخی کرنے کی کوشش کی تھی۔ قراردادِ لاہور منظور ہونے کے بعد انہوں نے کئی مسلمان دانشوروں سے ملاقات کر کے اپنا نقطۂ نظر بھی ان کے سامنے رکھا اور جب کہیں سے بھی ان کو پذیرائی نہ مل سکی تو وہ اپنے دل پر ناکامی کا داغ لئے لندن لوٹ گئے تھے۔

قیامِ پاکستان کو انہوں نے (عظیم غداری) قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کسی ایسے شخص کی پاکستان سکیم سے خود کو ہرگز وابستہ نہیں کر سکتے تھے ۔ یہ مہم ان خطوط کے سہارے بھی کامیاب نہ ہو سکی تھی چنانچہ تحریکِ پاکستان کے دوران اسلامیانِ ہند نے اقبال پر اس بہتان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ۔ وجہ یہ کہ قراردادِ لاہور کے فوراً بعد بابائے قوم نے "لیٹر آف اقبال ٹو جناح" کے عنوان سے اقبال اور اپنے درمیان وہ خط و کتابت شائع کر دی تھی جو اب تک صیغۂ راز میں چلی آ رہی تھی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں قائدِ اعظم نے اعتراف فرمایا تھا کہ قراردادِ لاہور اقبال کے افکار سے پھوٹی ہے:

("His views had finally led me to the same conclusion and found same expression in due course in the united will Muslim India as adumbrated in the Lahore resolution of the all India Muslim League passed on 23rd March. 1940.")

ترجمہ:،، متحدہ ہندوستان میں ان (اقبال) کے نظریات نے آخرِ کار مجھے بھی اِسی نتیجے پر پہنچا دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا تاثر بھی وہی بنا جس کا اشارہ 23 مارچ 1940 کو آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادِ لاہور کے اعلامیہ میں دیا گیا تھا"۔

مسلم لیگ کے 1940ء کے لاہور اجلاس سے منسلک یومِ اقبال کی تقریب کے ایک اجلاس کی صدارت قائدِ اعظم نے فرمائی تھی تو دوسرے

اجلاس کی صدارت شیر بنگال مولوی فضل الحق کے حصے میں آئی تھی۔ ہر دو قائدین نے اقبال کو اسلامیانِ ہند کا دیدہ وبینا مفکّر اور قرارداد لاہور کا صورت گر قرار دیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی شروع کی ہوئی مہم بری طرح ناکام ہو کر رہ گئی تھی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عوام نے ان سیاستدانوں کی بات نہیں مانی جو تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے، جب خود تحریکِ پاکستان کے قائدین اقبال کو اپنا،، دوست، فلسفی، مفکر اور رہنما،، قرار دے رہے تھے تب پاکستان مخالف حلقوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں کو کون پذیرائی بخشتا؟ ایسے میں جب پاکستان قائم ہوا تو قدرتی طور پر دنیا بھر میں علامہ اقبال کو پاکستان کا فکری بانی تسلیم کر لیا گیا۔ بھارت میں اس آفاقی صداقت کو جھٹلانے کا عمل اب تک اس لئے جاری ہے کہ مہابھارت کا خواب چکنا چور ہو گیا اور تعصب کی بناء پر یہ زخم مندمل نہیں ہو رہا۔

قدرتی بات ہے کہ بھارت میں رہنے والے پرستارانِ اقبال مجبوری میں تصورِ پاکستان کے باب میں پنڈت جواہر لال نہرو ہی کی لکیر کو پیٹنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ "اقبال: شاعر اور سیاستدان" کے مصنف اقبال سنگھ اور "دی ارڈنٹ پلیگرم" کے مصنف رفیق زکریا نے اقبال کے تصور پاکستان کو ایک خود مختار اسلامی مملکت کی بجائے اکھنڈ بھارت کا ایک صوبہ قرار دیا ہے۔ جارحانہ ہندو اکثریت کے ملک میں اقبال سے عقیدت و محبت کو سازش کے الزام سے بچانے کیلئے یہ ایک مؤثر استدلال ہے۔ مجھے ان قابلِ احترام پرستارانِ اقبال سے کوئی گلہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی گرانقدر تصنیفات کے اس عیب کی جانب اشارہ تک نہیں کیا مگر میں نہرو کی لکیر کے فقیر صحافی اور ٹی وی کے شتر بے مہار اینکر پرسن کی اس سوچی سمجھی مذموم مہم کا قبلہ درست کرنا اپنا ملی فریضہ سمجھتا ہوں۔

ایک مسلمہ حقیقت کو معرضِ شک میں ڈالنے کی یہ دوسری مہم،، ٹریک ٹو سفارت کاری،، نے جنم دی ہے۔ اس جاری مہم کے چند سرکردہ افراد نے کہیں بین السطور اور کہیں برملا یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جب تک پاکستان اپنی جداگانہ نظریاتی اساس کو دھندلاتے دھندلاتے معدوم نہیں کر دیتا، پاکستان اور بھارت میں دوستی ناممکن ہے اور مسئلہ کشمیر کا حل بھی ناممکن ہے، وہ قاہر و جابر عالمی قوتیں جو اپنے معاشی اور سیاسی استحصال کی خاطر پاکستان اور بھارت کو،، مشترکہ دفاع، مشترکہ خارجہ پالیسی اور مشترکہ کرنسی،، اپنانے پر مجبور کر رہی ہیں وہ دراصل اس مکروہ سازش کے پیچھے نہ صرف اقوامِ متحدہ میں منظور کشمیر کی حقِ خود ارادیت اور کشمیریوں کی بے مثال قربانیوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں بلکہ پاکستان کو مہابھارت میں فقط مسلمان اکثریت کا ایک صوبہ بنانے کی سازش میں مصروف ہیں، چنانچہ پاکستان کیلئے ایک نئی سیکولر نظریاتی اساس کی تلاش میں ایک خاص وظیفہ خوار گروہ اقبال کے جدید اسلامی مملکت کے تصور کی حقیقت کو اپنی مرضی کے الفاظ و معنی پہنا کر آج کی نوجوان نسل کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں۔ اقبال کا تصورِ پاکستان ایک جدید اسلامی مملکت کا تصور ہے اور اسلامی طرزِ حیات کو اس تصور سے الگ کرنا ناممکن ہے۔

1930ء کے خطبہ الٰہ آباد سے ربع صدی پیشتر اقبال نے اپنی نظم،، جوابِ شکوہ،، میں اسلامیانِ ہند کو اللہ تعالیٰ کی زبانی یہ پیغام دیا تھا:۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

اور خاتمِ رسل ﷺ سے اپنی محبت کا ظہار کرتے ہوئے ان تمام باطل عقائد کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

متحدہ ہندوستانی قومیت کے بت کو پاش پاش کرتے وقت انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ "اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے"۔ 1907ء سے لیکر اپنی آخری نظم "حسین احمد" اور اپنے آخری سیاسی بیان،، حسین احمد کے نام،، تک علامہ اقبال نے اپنی دلسوزلے میں جداگانہ مسلمان قومیت کے خدو خال اجاگر کرتے رہے تھے۔ اس جداگانہ مسلمان شناخت کے دشمنوں کو اس بات پر تو اطمینان ہے کہ گزشتہ باسٹھ سالوں سے پاکستان کے حکمران طبقے نے اقبال کی تعلیمات کو فراموش کر رکھا ہے مگر وہ اس بات پر بے حد مضطرب ہیں کہ اقبال کا تصور اسلام پاکستانی اور کشمیری عوام کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ وہ اس امکان سے خوفزدہ ہیں کہ اقبال نے اپنی عہد آفریں تصنیف،، جاوید نامہ،، میں جو قرآنی ریاست کا جو انقلابی نقشہ پیش کیا ہے اگر پاکستانی اور کشمیری قوم نے اسے اپنا روڈ میپ بنالیا تو پھر عالمی شیطانی سیاست کا کیا حشر ہو گا؟ اس امکان کو مٹا دینے کی خاطر لادینیت کے آسیب میں مبتلا عناصر کو ایک بار پھر یہ ضرورت آن پڑی ہے کہ اقبال کو پاکستان مخالف ثابت کرنے کی مہم دوبارہ چلائی جائے۔ اس مہم کے دوران بھی وہی پرانا "سامانِ جنگ" استعمال کیا جارہا ہے۔ اب ان عقل کے اندھوں کو یہ کون سمجھائے کہ یہ سامان تو تحریکِ پاکستان کے دوران ہی ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ کوربصری، جناب خالد احمد کے اس بیان کو جو فرائیڈے ٹائمز کی اشاعت (5 تا 15 / اپریل 2003ء) میں (کیا علامہ اقبال نے پاکستان تصور کیا؟) کے عنوان سے شائع ہوا تھا کو بطور اپنی دلیل استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تھا۔ سوال و جواب ہر دو پیش خدمت ہیں

("Did he imagine a separate state for the Muslims of India or did he propose a separate Muslim state within an India federation in his famous address? Historian seems to have favored the view that Allama Iqbal did not demand a separate Muslim state ،outside، the Indian federation.)

ترجمہ: "کیا انہوں (اقبال) نے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا خواب دیکھا تھا یا اپنے مشہور خطبے میں ہندی فیڈریشن کے اندر ہی ایک علیحدہ مسلم ریاست تجویز کی تھی؟ بظاہر مؤرخین اس نظریے کے حامی ہیں کہ اقبال نے ہندی فیڈریشن سے علیحدہ یا باہر کسی مسلم ریاست کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔"

یہ خطبہ الٰہ آباد کی سراسر غلط اور گمراہ کن تعبیر ہے۔ خطبہ الٰہ آباد کا مرکزی خیال اور بنیادی استدلال یہ ہے کہ:

اوّل۔ اسلامیانِ ہند لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا تجویز کردہ آل انڈیا فیڈریشن کا آئینی خاکہ ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔

دوم۔ اسلامیانِ ہند جدید معنوں میں ایک جداگانہ قوم ہیں۔

سوم۔ اس جداگانہ مسلمان قوم کو اپنی اکثریت کے علاقوں میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کا حق حاصل ہے۔

چہارم۔ موجودہ پاکستان کے خطۂ ارض پر خود مختار اسلامی مملکت کا قیام مقدر ہو چکا ہے۔

جب فکر اقبال کی رو سے آل انڈیا فیڈریشن (اکھنڈ بھارت) کا سرے سے کوئی وجود نہیں تو پھر اس کے اندر پاکستان کا قیام کیونکر ممکن ہے ؟..... جب اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تجاویز کو فلسفیانہ اور جدید جمہوری اصولوں پر ٹھکرا دیا تھا تو برطانوی وزیرِ اعظم نے خطبۂ الٰہ آباد کو،، بہت بڑی شرارت،، سے تعبیر کرتے ہوئے افسوس کیا تھا کہ اقبال نے ہمارے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ 31 دسمبر 1930ء کے برطانوی اخبارات نے اقبال کے اس خطبۂ الٰہ آباد کو آل انڈیا فیڈریشن کے تصور پر ایک انتہائی حملہ قرار دیا تھا (تفصیلات کیلئے دیکھئے "اقبال فراموشی" سنگِ میل)۔ عقل دنگ ہے کہ آدمی برطانوی وزیرِ اعظم کے تجزیہ کو حقیقت افروز سمجھے یا ان دو پاکستانی مؤرخین کو جو جناب خالد احمد کے دوست اور فلسفی اور رہنما ہیں۔

جناب خالد احمد نے اپنے اس کالم میں جن دو پاکستانی مؤرخین کا ذکر کیا ہے وہ تو بھارتیوں سے بھی زیادہ بھارتی ہونے پر نازاں ہیں۔ پروفیسر خالد بن سعید اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے مؤرخین اور ماہرینِ سیاسیات سے لیکر شیخ محمد اکرام اور عزیز احمد کے سے ماہرین ادب و ثقافت تک کتنے ہی دانشمندانِ کرام نے اپنی عہد آفریں کتابوں میں اقبال کو تصورِ پاکستان کا خالق قرار دیا ہے۔ امریکی اور روسی دانشوروں مثلاً فری لینڈ ایبٹ اور گورڈن پولن سکایا نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ پولن سکایا اپنے مقالہ "آئیڈیالوجی آف مسلم نیشلزم" میں اس تاریخی صداقت پر درج ذیل الفاظ میں مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں:

("Iqbal‹s philosophical conceptions led him to the conclusion that his ideas of equality and freedom could be embodied only in an Islamic state. And that consequently the Muslims of India had no other course but self-determination and the creation of Pakistan.")

ترجمہ: "اقبال کے فلسفیانہ نظریے نے انہیں اسی نتیجے پر پہنچایا کہ ان کے برابری اور آزادی کے خیالات صرف اسلامی ریاست میں ہی پنپ سکتے ہیں ۔ اور یہ کہ بالآخر مسلمانانِ ہند کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ماسوائے اپنی شناخت پہچانیں اور پاکستان بنائیں"۔

یہ تو رہا اس زمانے کے سوویت روس کے مؤرخین کا اعترافِ حقیقت، اب آیئے برطانوی مصنف رچرڈ سائمنز کی کتاب "دی میکنگ آف پاکستان" کی جانب، وہ اس حقیقت الحقائق پر یوں روشنی ڈالتے ہیں

("Muhammad Iqbal is today universally recognized in Pakistan as the great poet and prophet of nation. His prestige was so great and his enthusiasm so boundless that he became a political leader. In two important speeches towards the end of his life he appeared to foresee the development of Pakistan. In 1930 in his

presidential address to the Muslim League, ten years before the league adopted the programme of Pakistan, he demanded as separate Muslim state. It was his policy of the mass contact which Jinnah was to adopt with such success a few years later, and which converted the Muslim League from a middle class to a popular party.

ترجمہ: ،،پاکستان میں محمد اقبال آج آفاقی سطح پر ایک عظیم شاعر اور قومی پیغام بر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کی خودی اسقدر عظیم اور ان کا جذبہ اتنالا محدود تھا کہ وہ ایک سیاسی رہنما بن گئے۔ایسا لگتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دور کے دو اہم خطبات میں وہ تعمیرِ پاکستان دیکھ رہے تھے۔مسلم لیگ کے منصوبۂ پاکستان اپنانے سے دس سال پیشتر؛1930 میں مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں انہوں نے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ کر دیا تھا۔ جناح نے بڑے پیمانے پر روابط کا جو منصوبہ چند سال بعد اسقدر کامیابی سے اپنایا اور جس منصوبے نے مسلم لیگ کو ایک درمیانے درجے کی پارٹی کے درجے سے ایک مقبول پارٹی میں تبدیل کر دیا وہ منصوبہ اُنہیں (اقبال) کا تھا۔"

مجھے اب یقین ہے کہ اب جناب خالد احمد اور ان کے حواری جب تحریکِ پاکستان کے ان غیر جانبدار مؤرخین کی دانش سے اعتناء فرمائیں گے تو ان پر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں ہندوستان کے اندر ایک مسلمان صوبے کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ برصغیر کی آزادی کے بین الاقوامی سوال کو قوموں کے حقِ خودارادیت کے اصول پر طے کرنے کی خاطر جداگانہ مسلمان قوم کیلئے الگ اور خود مختار مملکتوں کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اور کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کا مطالبہ بھی سو فیصد درست ہے جس کو اقوامِ عالم نے اقوامِ متحدہ میں منظور کر کے کشمیریوں کے اس جائز مطالبے کی توثیق کر دی ہے۔کشمیریوں پر بے پناہ ظلم و ستم اور ان کی قربانیاں کبھی بھی رائیگاں نہیں جاسکتی انشاءاللہ۔

بروز بدھ 21 جمادی الاوّل 1431ھ 5 مئی 2010ء

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ

علامہ اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کیلئے جو سب سے بڑا کارنامہ سر انجام دیا وہ اس کے ملی تشخص کی حفاظت اور احساس کو بیدار کرنا ہے۔ وہ ہندوؤں کی چال کو ،جو متحدہ قومیت کی صورت میں پروان چڑھ رہی تھی، بھانپ گئے تھے، چنانچہ وطنیت کے عنوان سے ان کی مشہور نظم 1908ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں وہ فرماتے ہیں:

اس عہد میں مے اور ہے جام اور ہے

ساقی نے بناء کی روش لطف و ستم اور

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم او ر

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر ہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(نظم وطنیت، وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) صفحہ 160 بانگ درا

وہ اپنے مشہور خطبہ الہ آباد میں فرماتے ہیں: "اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کرتے ہیں اوران کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شائد ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے، اس لئے کہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کار فرما ہے۔"

علامہ اقبال فرماتے ہیں: لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کیلئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے ، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا..... یہ ایک زندہ اور

عملی سوال ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز اور متمیز تہذیب کے حامل ہو سکیں "۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی نصب العین کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کریں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟"

"میں نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کیلئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کیلئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانانِ ہند کے سامنے ہے "،،۔ "..... مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے ماتحت اس ملک میں مسلمانوں کو آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کیلئے بڑی
سے بڑی قربانی سے بھی نہیں دریغ کریں گے۔"

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم ریاست قائم کرنا پڑے گی"۔ "اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے"۔ "اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظامِ قانون کو عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے لیکن اس ملک میں شریعت اس کی توسیع ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن نہیں تو دوسری طرف صرف خانہ جنگی ہے"۔ اسلامی نظام کا نفاذ اور

"میری رائے میں اسلام کا مستقبل بہت کچھ پنجاب کے کسانوں کی آزادی پر انحصار کرتا ہے تو پھر نوجوانوں کی حرارت کو مذہب کی حرارت کے ساتھ مل جانا چاہئے تاکہ زندگی کی دمک بڑھے اور ہماری آئندہ نسلوں کیلئے عمل کی ایک نئی دنیا پیدا ہو"۔ "ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں، اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی اور ان کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کیلئے کیوں مظطرب ہیں"۔ وہ خطبہ ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

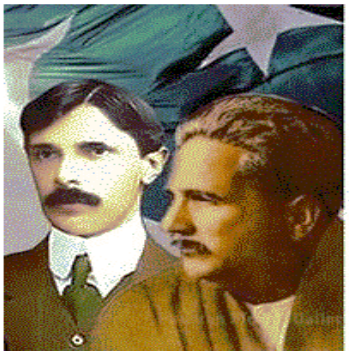

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام کے مطالعے سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان، اگر آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو

جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا"۔ "میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں"۔ "مسلم ہندوستان کیلئے ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے سے بڑی مسلم اکثریت کے واسطے ایک یا زیادہ مسلم مملکتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبے کا وقت آ گیا ہے، جواہر لال نہرو کی ملحد اشتراکیت کا شائد یہی بہتر جواب ہے جو آپ دے سکتے ہیں"۔ "پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں"۔

اجلاس منعقد لاہور 21 مارچ 1931ء میں نیشلزم پر ان کا تبصرہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے:
"میں نیشلزم کے خلاف ہوں جیسا کہ یورپ میں اس سے مفہوم لیا جاتا ہے، اس لئے نہیں کہ اس تخیل کو ہندوستان میں نشو و نما پانے کی اجازت دے دی گئی تو اس سے مسلمانوں کو کم مادی فائدہ پہنچے گا۔ میں اس لئے اس کے خلاف ہوں کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت کے جراثیم دیکھتا ہوں ۔ میرے خیال میں یہ جدید دور کی انسانیت کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے، حب الوطنی صحیح طور پر ایک قدرتی نیکی ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں وہ خاص درجہ رکھتی ہے تاہم جو چیز دراصل اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کا عقیدہ ہے، اس کی تہذیب ہے، اس کی تاریخی روایات ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کیلئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے اور جس کیلئے انسان کو اپنی جان تک قربان کر دینی چاہئے"۔

"ہمارا مطمع نظر بالکل صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ آنے والے دستور میں اسلام کیلئے ایسی پوزیشن حاصل کریں جو اسے ملک میں اس کی قسمت کی تکمیل کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس مطمح نظر کی روشنی میں قوم کی ترقی کرنے والی قوتوں کا جگانے اور ان قوتوں کو جو اب تک خوبیدہ پڑی ہیں منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کی لو دوسروں سے قرض نہیں لی جا سکتی، اسے خود اپنی روح کے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے"۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملت فیضا پر اک نظر" میں حضرت علامہ اقبال نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اس طرح کی:

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے، ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان، نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی ہے بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جنابِ رسالتِ مآب ﷺ نے قائم فرمائی
تھی ، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی سب کیلئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے..... اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائص مخصوصہ و شمائل پر منحصر نہیں ہے غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔"

"اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں، بالفاظِ دیگر اسلامی

تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے، اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی جوں ہی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا،، حضرت علامہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نئی نسل کیلئے تعلیمی سہولتوں کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی اکتنازی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گردوپیش کی ان قوموں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی۔ " آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے فروری 1931ء کے اجلاس میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے فرمایا:
"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ دنیا میں کچھ خدا اور انسان کی کی خدمت میں دے ڈالے، اس کے امکانات ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں، وہ اب بھی ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی درجہ اس کی ذات، رنگ، اس کے کمائے ہوئے،، ڈویڈنڈ،، کی مقدار سے متعین نہ ہوتا ہو بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے، جہاں غرباء مال داروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں، جہاں انسانی سوسائٹی شکموں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہو ۔ان تمام اقتباسات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت علامہ مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر ایک علیحدہ قوم تصور کرتے تھے اور اسی بنیاد پر وہ ایک علیحدہ خطہ چاہتے تھے جسے وہ اسلامی ریاست کا نام دیتے تھے۔ کوئی ذی ہوش انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ساری جدوجہد اسلام ہی کے نام پر تھی۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو ان محدود حصوں میں قوم سمجھنے کیلئے تیار نہ تھے اور یہی چیز انہوں نے مسلمانوں کو سکھائی، وہ فرماتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس، اقوامِ مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

(مذہب ص248 بانگ درا)

اقبال جہاں جہاد کا درس دیتا ہے وہاں اس نے اجتہاد کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور اس خطے میں اقبال واحد شاعر ہے جس نے صرف مسلمانوں کیلئے نہیں بلکہ نیچی ذات کے ہندوؤں کیلئے بھی آواز اٹھائی ہے:

آہ شودر کیلئے ہندوستاں غم خانہ ہے

درد انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

(نانک ص239 بانگ درا)

اس لئے آج چوراہے میں بیٹھے ٹی وی کے دانشور یہ کہتے ہیں کہ اقبال رجعت پسند شاعر تھا دراصل وہ اقبال کا نام استعمال کر کے اپنے چھوٹے قد کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان اور قائد اعظم دونوں اقبال کی دریافت ہیں اس لئے جو اقبال کو نہیں مانتا وہ شوق سے پاکستان میں تو رہے لیکن اسے پاکستانی کہلوانے کا کوئی حق نہیں۔

بروز جمعتہ المبارک 23 جمادی الاوّل 1431ھ 7 مئی 2010ء

آخر کب تک؟

کسی مسلمان لیڈر کو تو آج تک زبان کھولنے کی توفیق نہ ہو سکی اور سب کے سب دست آموز کی طرح وہی راگ الاپ رہے ہیں جس کی سامراجیوں نے تلقین کر رکھی ہے یعنی مسلمان بنیاد پرستوں کو سیدھا کر کے چھوڑیں گے اور تمام "مسلمان دہشت گردوں" کو مار مکائیں گے مگر ان میں سے کسی کو بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ ان سامراجیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہتے یا پوچھ ہی لیتے، وہ جو کچھ کر توت کرتے رہے ہیں اور ابھی تک کر رہے ہیں یا کر کے مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں، اس پر تمہاری نظر کیوں نہیں پڑتی؟

کیا کوئی یہودی بنیاد پرست نہیں ہے؟ ظالم صہیونیوں نے دہشت گردی کے ریکارڈ نہیں قائم کر رکھے؟ اسرائیل کا کون سا وزیر اعظم ہے جو اپنے وقت کا سب سے بڑا دہشت گرد نہیں تھا؟ کیا ہندو بنیاد پرست اور دہشت گرد کسی کو نظر نہیں آتے؟ بال ٹھاکرے، ایڈوانی اور نریندر مودی جیسے ہزاروں ہندو بنیاد پرست اور دہشت گرد علی الاعلان مسلمانوں کے قتلِ عام پر نہیں اکساتے اور مسلمانوں کو دھمکاتے نہیں ہیں؟ کیا یہ دہشت گردی نہیں ہے؟ کیا یہ ثابت نہیں ہو چکا کہ نائن الیون کی طرح گودھرا ریلوے سٹیشن کا خونی ڈرامہ مسلمانوں کو خواہ مخواہ ملوث کرنے کیلئے مودی نے نہیں سٹیج کیا تھا جس میں ہندوستان کی "را" کا کرنل پروہت اپنی پوری جماعت کے ساتھ شامل تھا اور بھارت کے جس فرض شناس تفتیشی افسر نے اس سارے گروہ کو بے نقاب کیا تھا، ممبئی حملے میں ڈرامائی انداز میں اس کو قتل کر دیا گیا تا کہ آئندہ کسی بھی فرد کو ایسی جرأت نہ ہو۔ آج مہذب دنیا کی عیسائی حکومتیں جن میں انکل سام سرِ فہرست ہے، وہ مسلمانوں کو دہشت زدہ نہیں کر رہیں؟ ان کا نام کیوں نہیں لیا جاتا، عالمی صہیونیت کے گماشتوں نے اپنے ذرائع ابلاغ کے تمام کیمرے صرف مسلمانوں پر ہی کیوں فوکس کر رکھے ہیں؟

لیکن اس تاریکی میں بھی قدرت خود بخود روشنی کی کرنیں پیدا کر دیتی ہے۔ بھلا ہو ایمنسٹی انٹرنیشنل کی خاتون صدر کا، جس نے سب سے پہلے 4 فروری 2005ء میں حق کی آواز بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی بنیاد پرست اور دہشتگرد نہیں بلکہ دنیا اس وقت یہودی، ہندو اور عیسائی بنیاد پرستوں کے نرغے میں ہے۔ ہر مذہب کے تنگ نظر، متعصب اور بے رحم بنیاد پرست اپنی اپنی اقلیتوں پر مظالم توڑ رہے ہیں اور ان کے انسانی حقوق تلف کرنے کے مجرم ہیں۔ اس میں اگر یہ تھوڑا سا اضافہ کر لیا جائے تو بات مزید خوبصورت بن جاتی ہے کہ ان مذاہب کے یہ سنگدل بنیاد پرست دہشت گردی کے گھناؤنے ڈرامے خود سٹیج کرتے ہیں اور ان کا تمام ملبہ مسلمانوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ صورتحال بڑی خطرناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔

دنیا کو یہ حقیقت کھول کر واضح کرنا ہو گی، اسلام اور مسلمانوں کو تو صہیونیت زدہ مفسدین نے خواہ مخواہ نشانہ بنا رکھا ہے مگر یہ حقیقت کھولے کون؟ مسلمان لیڈروں نے تو گویا اپنے ہونٹ سی رکھے ہیں بلکہ وہ تو سامراجیوں کے سائے میں مزے سے حکومت کر رہے ہیں اور اپنے اپنے بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کو سدھار رہے ہیں۔ دشمنانِ اسلام جو مسلمانوں پر مظالم توڑ رہے ہیں اور ہر جگہ ان سے ظالمانہ امتیازی سلوک کر رہے ہیں اس پر خاموش

نہیں رہا جاسکتا، کم سے کم زبانی شکائت میں کیا رکاوٹ ہے؟ کوئی اکیلا انسان جب دشمنوں کے گھیرے میں آجائے اور اسے اپنی موت نظر آنے لگے تو وہ زبانی اور بلند آواز میں واویلا کرنے اور رونے سے تو باز نہیں رہتا مگر ایک ہمارے لیڈر بھی ہیں جو چاروں طراف سے خطرات میں گھرتے چلے جارہے ہیں اور آہستہ آہستہ دشمن کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے مگر یہ نہ واویلا کرتے ہیں نہ شکائت، بلکہ یہ تو روتے بھی نہیں! بخدا اگر کسی ایک صبح کو ہر مسلمان لیڈر اس خفیہ سازش پر بیک وقت رونے لگ جائیں تو مہذب دنیا کے دل دہل جائیں اور سامراجی اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

ایمنسٹی انٹر نیشنل کی اسی خاتون صدر نے حال ہی میں ایک بھارتی ادارہ ابلاغیات کو خاص انٹرویو دیتے ہوئے بڑی کھری کھری باتیں کہیں، وہ فرماتی ہیں کہ "دنیا بنیاد پرستی کی لپیٹ میں ہے"۔ گویا جو متعصب دنیا اس وقت مسلمانوں کو ستا رہی ہے در حقیقت وہ اپنے اپنے مذہب کی بنیاد پرست دنیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف متعصب ہیں مگر وہ الزام صرف مسلمانوں کو دے رہے ہیں۔ محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دنیا کی اس روش سے "بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کو خطرات لاحق ہیں، دنیا کے نام نہاد عیسائی لیڈروں اور ان کی عیسائی حکومتوں نے اپنے ہاں کی مسلمان اقلیتوں کیلئے زندگی زندگی اجیرن بنادی ہے حالانکہ،، غیر مہذب،، اسلامی دنیا میں عیسائی اقلیتیں امن و آرام سے ہیں، انہیں غیر مہذب مسلمان مغرب کے مہذب عیسائیوں کی طرح تنگ نہیں کر رہے"۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل کی خاتون صدر کا یہ ارشاد فوری توجہ کا مستحق ہے کہ "عالمی سطح پر ہر مسلمان کو مشتبہ دہشتگرد تصور کر لیا گیا ہے۔ دہشت گردی کے حوالے سے متبادل تصور پیش کرنے کی ضرورت ہے، جنگوں کی بجائے امن اور انسانی حقوق کے کلچر کو فروغ دینا ہو گا۔

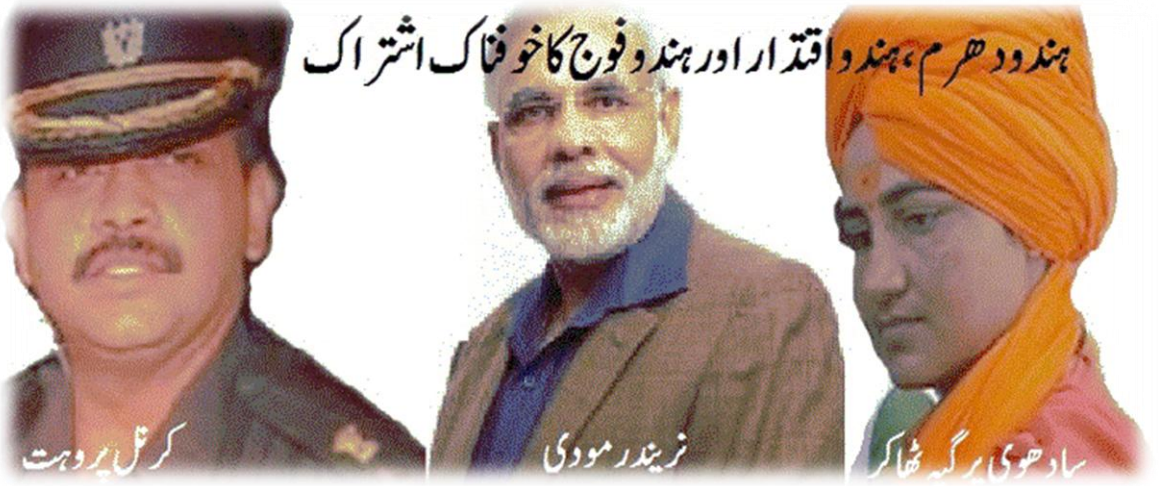

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تین چار صدیوں سے صہیونیت زدہ مغرب نے اسلامی دنیا کے خلاف خفیہ اور اعلانیہ جارحانہ جنگ شروع کر رکھی ہے اور مسلمان مدافعانہ پوزیشن پر مجبور ہیں بلکہ اب تو مدافعت کی بھی سکت نہیں رہی۔ اس کے اصل محرک تو یہودی ہیں جو کبھی اشتراق کے لباس میں حملہ آور تھے مگر اب انہوں نے صہیونیت کی وردی پہن لی ہے اور بڑی تعداد میں عیسائی دنیا کو بھی،، صہیونی،، بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دنیا کی مالیات اور ابلاغیات پر چونکہ یہودی چھایا ہوا ہے اس لئے وہ سب کچھ خرید بھی سکتا ہے اور سب کچھ دنیا میں پھیلا بھی سکتا ہے۔ یہی یہودی ہے جو چودہ صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کے حسد اور عداوت کی آگ میں جل رہا ہے اور جلتا رہے گا۔ اقبال کے زمانے میں تو شائد صرف یورپ کی رگ و جاں پنجہ یہود میں تھی مگر آج انکل سام کی بھی رگ جاں ان کے پنجے میں ہے بلکہ انکل سام کی تو دم اور سر بھی پنجہ یہود میں ہے اور کسی دن ایسی پٹخنی دیں گے کہ اس کا

حشر سرخ سامراج سے بھی بدتر ہو گا لیکن اس وقت وہ انکل سام پر سوار ہے اور دنیا سے اسلام اور مسلمانوں کو نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آج دنیا کے چاروں کونوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ کے جو شعلے بلند ہو رہے ہیں، ان کا اصل سبب یہی ہے۔

یہودی بنیاد پرستوں نے مسلمانوں کے خلاف عیسائی اور متعصب ہندو بنیاد پرستوں کو بھی بھڑکا رکھا ہے۔ آج وہ انکل سام کی اندھی فوجی طاقت اور اسلحے سے مسلمانوں کو ختم کرانے کیلئے بڑی بے قراری سے جتن کر رہا ہے، دنیا میں آج جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کا ذمہ دار صرف مسلمانوں کو ٹھہرانا صہیونی سازش ہے۔ اوّل تو جو وسائل یہود و ہنود اور عیسائی بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کے پاس ہیں، مسلمانوں کے پاس اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، پھر مسلمان (بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کی تعریف ابھی باقی ہے) کے پاس ایسے وسائل نہیں کہ وہ نائن الیون جیسا ہولناک ڈرامہ اکیلے سٹیج کر سکیں۔ اس میں صہیونی پردہ نشینوں کے نام تو ابھی پردے میں ہیں مگر ایک بات کھل کر واضح ہو گئی ہے کہ انکل سام کے جن جاسوس اداروں میں یہودی مؤثر کردار کے مالک تھے، ان جاسوس اداروں نے اس ڈرامے میں اتنا حصہ ضرور ڈالا ہے کہ اسے آرام سے سٹیج ہونے دیا ہے۔ پھر اس ڈرامے سے سب سے زیادہ فائدہ اسرائیل اور عالمی صہیونیت نے اٹھایا بلکہ جس دلدل میں انکل سام کو پھنسایا گیا ہے، اس کے فوائد بھی اسرائیل کے حصے میں آنے تھے مگر یہودی کا مقدر ڈوب گیا اور اب کسنجر کی وصیت اور مشورے کے باوجود انکل سام اس دلدل سے باعزت باہر آنے کی فکر میں ہے جو بظاہر ممکن نظر نہیں آتا لیکن ایک بات کھل کر واضح ہوئی ہے کہ دنیا میں دیگر فسادات کی طرح نائن الیون میں بھی یہودی اور عیسائی بنیاد پرست اور دہشت گرد بھی ملوث ہیں، اگرچہ تمام ملبہ صرف چند سر پھرے مسلمان دہشت گردوں پر ڈال دیا گیا جو آلہ کار بنائے گئے تاکہ دنیا بھر کی نفرتیں مسلمانوں پر انڈیلی جا سکیں۔

باراک اوبامہ جب بھی کبھی امریکی جارحیت کو ختم کرنے کا کوئی پروگرام مرتب کرتے ہیں تو یہی صہیونی لابی کوئی نہ کوئی ایسا ڈرامہ رچانے میں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے کہ امریکا باوجود اپنی معاشی تباہی کے اس دلدل سے باہر نہ آ سکے۔ چند دن پہلے نیویارک کے ٹائمز اسکوائر میں ناکام کار بم دھماکے کا ایک نیا ڈرامہ سامنے آ گیا اور اس میں ملوث پاکستانی نژاد امریکی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ادھر بھارت نے ممبئی ڈرامے میں ملوث اجمل قصاب کو سزائے موت سنا دی ہے اور سنا ہے کہ آج کل ایک بے گناہ مسلمان بیٹی "عافیہ صدیقی" کو بھی سزا سنائی جائے گی۔ ان تمام معاملات اور خبروں کو ملا کر پڑھیں تو کیا اس کو بھی آپ اتفاق سمجھیں گے یا سوچی سمجھی سازش؟

بروز اتوار 25 جمادی الاوّل 1431ھ 9 مئی 2010ء

فوری بائیکاٹ!

مذہب سے بیزار اور حقیقتاً قرآن وسنت کا منکر ایک گروہ جو کبھی خود کو لبرل، سیکولر، ترقی پسند اور آجکل روشن خیال کہلاتا ہے، وہ وطن عزیز میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت کا شدید مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہے چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد سے آج تک یہ گروہ اسلام دشمنی میں پیش پیش ہے۔ اس گروہ نے اسلامی قوانین پر مشتمل ملکی دستور کی تشکیل اور پاکستان کا "اسلامی جمہوریہ" نام رکھنے کی مخالفت کی، ادب وثقافت اور سیاست وحکومت کی آڑ میں اسلام پر حملے کئے، شعائر اسلامی واقدارِ اسلامی کا مذاق اڑایا اور جدیدیت اور مغربیت کے نام پر مسلمانوں کو گمراہ اور ان میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔

یہ مٹھی بھر عناصر ریاستی سرپرستی میں اور کبھی ریاستی اقتدار میں شامل ہو کر اور کبھی بیرونی قوتوں کے احکامات پر اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے رہے اور کبھی راجہ داہر کو اپنا ہیرو اور محمد بن قاسم کو بیرونی حملہ آور قرار دیتے ہوئے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام دشمن ان عناصر کی ریشہ دوانیوں کو قرآن وسنت کے علم برداروں اور پیروکاروں نے نہ صرف علمی وعقلی دلائل سے ناکام بنایا بلکہ سیاسی و سماجی محاذ پر بھی شکست دی۔ پاکستان کی باسٹھ سالہ تاریخ میں دینی اور لادینی عناصر کے درمیان کشمکش کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ جب بھی لادینی عناصر نے اسلام اور پاکستان کے قومی ہیروز کے خلاف محاذ گرم کرنے کی کوشش کی تو دینی عناصر اور محب وطن نے دلائل وبرہان اور عوامی قوت وحمائت سے اسے مسترد کر دیا۔

پاکستان کے قومی مشاہیر پر کیچڑ اچھالنے کی قیادت کچھ ایسے افراد نے سنبھال رکھی ہے جن کا میڈیا میں خاصا عمل دخل ہے جو مغرب کی امداد پر چلنے والی این جی اوز کے ساتھ منسلک خصوصاً انکل سام کے زیرِ سایہ صہیونیت زدہ چند دانشور،، پاکستان دوستی،، کا عملی ثبوت دیتے ہوئے اپنی محققانہ کاوشوں میں یہ راگ الاپتے ہوئے نہیں تھکتے کہ یہ ایک،، ناکام ریاست،، ہے کیونکہ ہماری قوم کے کرپٹ وخائن لیڈر اور اعلیٰ ملازمتوں پر فائز لوگ اس ملک کی دولت لوٹ لوٹ کر مغرب کے بینک اور تجوریاں بھرتے چلے آرہے ہیں مگر پھر بھی اس سرزمین پاک کے معدنی اور پیداواری خزانے نہیں ختم ہو رہے ہیں۔ ہمارے،، مہربان پڑوسی،، سمیت دنیا کے تمام اسلام دشمن بھیڑیئے اس ملک کو توڑنے اور ناکام کرنے میں لگے ہوئے ہیں مگر پھر بھی یہ دولتِ خداداد قائم ہے لیکن اس کے برعکس کھجور کی گٹھلی جتنا دہشت گردی اور سازش کی پیداوار ملک اسرائیل ہے جسے چلانے کیلئے سارا بجٹ انکل سام مہیا فرماتے ہیں اور اس کے مستقبل کو محفوظ بنانے پر انکل سام سمیت پورا مغرب کمربستہ ہے لیکن اس کے باوجود اسرائیل ایک "کامیاب ریاست" ہے۔

اس سے پہلے قرآن وسنت کے منکروں کی قیادت ایک فاسق کمانڈو پرویز مشرف کے ہاتھ میں تھی جو امریکی احکامات واشاروں پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں سے قرآن وسنت ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے، اور ان مقاصد کی تکمیل میں ریاست کے تمام وسائل کو بھی بڑی بیدردی کے

ساتھ جھونک دیا گیا۔ انہی کے دور قیادت میں ان تمام افراد کی سرپرستی بھی فرمائی گئی اور میڈیا کی آزادی کا بھی خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ ملک میں سیکولر مغربی تہذیب واقدار کی سرپرستی وحوصلہ افزائی میں ان افراد کو میڈیا میں خوب بڑھاچڑھا کر پیش کیا گیا۔ پہلی مرتبہ "کتا تہذیب" اور "اتاترک آئیڈیل ازم" "سب سے پہلے پاکستان،، قوانین اسلامی، دینی مدارس، نصاب سے آیاتِ قرآنی کا اخراج، پاسپورٹ سے مذہب کے خانے کے خاتمے، داڑھی، حجاب، آغاخان امتحانی بورڈ، بسنت اور میراتھن ریس سمیت مختلف عنوانات سے اس ملک کی اساس پر حملے کئے گئے لیکن پاکستان کے عوام نے ان تمام سازشوں کو ناکام بنادیا۔

وہ خود تو پاکستان کو خیر باد کہہ کر اپنے آقاؤں کو ہاں قیام پذیر ہیں لیکن این آراو کے تحت آنے والی حکومت میں ان افراد کو وہ سبھی سہولیات میسر ہیں جو ان کو پہلے سے میسر تھیں اوراب انہوں نے ایک نئے ایجنڈے کے تحت پاکستان کے قومی مشاہیر کے خلاف تشکیک کی مہم شروع کردی ہے تاکہ نوجوان نسل کے نوخیز دل ودماغ میں اس تشکیک کے زہر سے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کی جاسکے۔ ان کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کیلئے مجھے کالم "دجالی فتنے" تحریر کرنا پڑا۔ حیرت انگیز طور پر قارئین کی ایک بڑی تعداد کا ردعمل مجھے موصول ہوا۔ پڑھنے والوں کی آراء کو ایک کالم میں جمع کرنا تو ممکن نہیں لیکن صرف چند کر مفرماؤں کے جذبات پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اب بھی نوجوان نسل کا جذبہ قابل ستائش ہے!

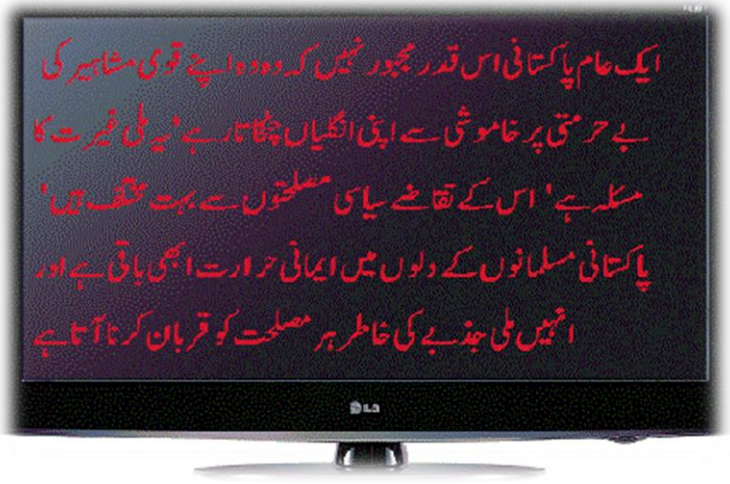

مانچسٹر سے ڈاکٹر آصف تحریر کرتے ہیں: "میڈیا کی آزادی کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے قومی ہیروز کو نازیبا الفاظ سے مخاطب کیا جائے، یہ انتہائی ناقابل برداشت ہے اور اس کا کوئی فوری علاج ہونا چاہئے ۔ "کوپن ہیگن ڈنمارک سے میاں اقبال نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ،، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم کسی ایسے چینل کو اپنی جیبوں سے فیس ادا کرکے اس کی ایسی نشریات دیکھیں جہاں ہمارے اکابرین کو برا بھلا کہا جارہا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یورپ اورامریکا میں رہنے والے اس چینل کا اس وقت تک بائیکاٹ کریں جب تک ایسے ناہنجار افراد کو فارغ نہیں کر دیا جاتا۔،، نیویارک سے ڈاکٹر تحسین فرماتے ہیں کہ،، ہم نے اس چینل کو وطن کی محبت کیلئے دیکھنا شروع کیا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی دشمن کے ایجنڈے پر کام کررہے ہیں۔ ان کا کوئی فوری سدباب ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں ایسی مؤثر تحریک شروع کی جانی چاہئے کہ ایسے لوگوں کو دوبارہ ایسی جرأت نہ ہو۔"

لندن سے پروفیسر حنیف اپنے شدید غصے کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ "میرے پاس تو پہلے ہی کوئی ایسا خاص وقت نہیں بچتا ہے کہ میں اس چینل کی نشریات دیکھ سکوں لیکن پاکستان کی محبت نے مجھے اس بات پر مجبور کیا تھا کہ اس چینل کی نشریات کو دیکھ کر ملک کی یاد تازہ رکھ سکوں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں بادیٔ النظر میں پاکستان کے کسی دشمن کی مدد کررہا ہوں، اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس چینل کا بائیکاٹ سب سے پہلے میں کروں

گا اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کسی بھی ایسے چینل کو ہم سپورٹ نہیں کریں گے جہاں ایسے.....ملت فروش میرے ملک کے اکابرین کی تضحیک کریں۔"

برمنگھم سے صادق قریشی صاحب تحریر کرتے ہیں،، ہم سیکولر گروہ کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے، اس میں بسنے والے 17 کروڑ مسلمان اللہ اور اس کے آخری نبی محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور پاکستان کو اللہ اور رسول کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور میں اس کا خود گواہ ہوں۔ پاکستان کے اکابرین کا مذاق اڑانے والے سیکولر اس بات کو یاد رکھیں کہ جس طرح ماضی کے حکمران سیکولرازم کا پرچار کرنے میں ناکام رہے ہیں اسی طرح یہ مادر پدر آزاد افراد بھی ناکام رہیں گے۔ میں اس ملک کے دینی طبقوں سے گزارش کروں گا کہ وہ امریکا اور اس کے ایجنٹوں کے مقابلے میں ان ملک دشمن عناصر کے خلاف اتحاد اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے اس چینل کا بائیکاٹ کریں۔ ہمیں ان سازشوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جو ہمارے قومی ہیروز کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کر کے ملک کے اصل سیاسی ایشوز سے ہماری توجہ ہٹانا چاہتے ہیں۔

ان بے شمار اور طویل ای میلز سے چند آراء آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ دنیاداری کے مفادات اور سرکاری مجبوریاں حکمرانوں کو مصالحتی چادر اوڑھنے پر مجبور کر سکتی ہیں مگر ایک عام پاکستانی اس قدر مجبور نہیں کہ وہ وہ اپنے قومی مشاہیر کی بے حرمتی پر خاموشی سے اپنی انگلیاں چٹخاتا رہے، یہ ملی غیرت کا مسئلہ ہے، اس کے تقاضے سیاسی مصلحتوں سے بہت مختلف ہیں، پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں ایمانی حرارت ابھی باقی ہے اور انہیں ملی جذبے کی خاطر ہر مصلحت کو قربان کرنا آتا ہے۔ یہ ایمانی حرارت ہی تو تھی جس کے سہارے عرصہ دراز تک دنیا پر امت مسلمہ کا راج رہا، اس حرارت کی شعلہ زن تپش کے آگے قیصر وکسریٰ کی فولادی چھاؤنیاں بھی ریت کی دیوار ثابت ہوئیں، ہر باطل ومتکبر قوت خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی، ہر سو اسلام کی حقانیت و صداقت کا علم بلند ہوا، اور امن و آشتی کی فضاء ہموار ہوئی۔

یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم ہیں، انہوں نے حال ہی میں اٹھارویں ترمیم کے بعد ایوانِ صدر کی محتاجی کے تمام بکھیڑوں سے نجات حاصل کر کے "عروس واقتدار،، کی آرائش وزیبائش کا کام سنبھالا تو ہے لیکن اس کے باوجود نہ ان کے چہرے کی جھریاں تحلیل ہوئی ہیں، نہ چندھیائی ہوئی آنکھوں میں چمک آرہی ہے، نہ مرجھائے ہوئے ہونٹوں میں گلاب مہک رہے ہیں اور نہ جھومر سے سجے ماتھے سے کوئی چاند طلوع ہو رہا ہے۔ وزارتِ عظمیٰ سے بے نیاز وزیر اعظم اگر اپنی توجہ اس حساس معاملے کی طرف کریں تو انہیں یہ آستیں کے سانپ بالکل واضح نظر آئیں گے لیکن شائد یہ نیک کام ان کے مقدر میں نہیں۔ آج کل ساری حکومتی مشینری کو صرف یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ کس طرح کرپشن کے سوئس مقدمات سے گلو خلاصی حاصل کی جائے لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا!

حکمت مشرق ومغرب نے سکھایا ہے مجھے

ایک نکتہ کہ غلاموں کیلئے ہے اکسیر

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو

ہوتے ہیں پختہ

عقائد کی بناء پر تعمیر

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں

ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

بروز منگل 27 جمادی الاوّل 1431ھ 11 مئی 2010ء

مہندی کے رنگ

فلوجہ شہر بغداد سے 69 کلو میٹر دور مغرب میں آباد ہے۔ ناجائز امریکی قبضے کے ایک سال بعد اس شہر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مارچ کے آخری دنوں میں امریکی اہلکاروں نے اس شہر کا انتظام سنبھالا اور شہر میں گشت شروع کر دیا، اس گشت کے دوران انہوں نے گھر گھر تلاشی کا آغاز کر دیا، وہ راتوں کو لوگوں کا جگاتے، عورتوں، بچوں بوڑھوں اور جوانوں کی تلاشی لیتے اور جاتے ہوئے نقدی اور زیورات لیجاتے۔ یہ سلسلہ طول پکڑ گیا تو لوگ امریکیوں سے نفرت کرنے لگے اور بالآخر ایک روز انہوں نے امریکی قافلے پر حملہ کر دیا۔ امریکی فوجیوں کیلئے یہ ایک بالکل نئی صورتحال تھی، وہ گھبرا کر پسپا ہو گئے، جس سے لوگوں کو حوصلہ ملا اور پھر پورے فلوجہ میں آگ لگ گئی، پوری آبادی باہر نکلی، انہوں نے امریکی ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، ٹرک اور دوسرا فوجی ساز و سامان کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا، امریکیوں کو پکڑ پکڑ کر مارا، ان کی نعشیں جلا دیں۔

فلوجہ کی اس ،، بغاوت ،، کی اطلاع دوسرے شہروں تک پہنچی تو وہاں بھی قابض فوجوں کے خلاف ،، انقلاب ،، آ گیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے عراق کے بارہ شہر اس تحریک کا حصہ بن گئے اور اپریل کے پہلے ہفتے فلوجہ کے ساتھ ساتھ رمادی، بقوبہ، عمارہ، کربلا، کوفہ، الکوت اور نجف جیسے شہر امریکی فوج کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ لیکن بات ہو رہی تھی فلوجہ شہر کے اس واقعے کی جس نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا، اتحادی افواج نے ،، بغاوت ،، کچلنے کیلئے فلوجہ کا محاصرہ کر لیا اور ضروریاتِ زندگی کی ترسیل پر پابندی لگا دی۔ جب یہ اطلاع دوسرے شہروں تک پہنچی تو ہزاروں لوگوں نے تیار خوراک کے ٹفن اور پانی کے کنستر اٹھائے اور فلوجہ شہر کی جانب چل پڑے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہمارے بہن بھائی فلوجہ میں بھوکے پیاسے ہیں ،اس گھڑی میں ہم ان کی مدد کریں گے۔ جب یہ جلوس مرکزی شاہراہ پر پہنچا تو امریکی اہلکار ان ہزاروں لاکھوں ٹفن اور کنستر بردار لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اس تحریک کا دوسرا معجزہ بھی ملاحظہ کیجئے! فلوجہ میں سنی العقیدہ لوگ اکثریت میں آباد ہیں لیکن انہیں سب سے پہلی اور بڑی حمائت شیعہ رہنما مقتدیٰ الصدر سے ملی، اس حمائت نے بھی پوری دنیا کے مغربی دانشوروں کو ہلا کر رکھ دیا۔

آپ فلوجہ کی اس ،، عوامی بغاوت ،، کو عراق پر امریکا کی پالیسیوں کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں، آپ اسے 21 ویں صدی کا ویتنام بھی کہہ سکتے ہیں، آپ اسے عراق سے امریکا کی ذلت بھری پسپائی کا نقطہ آغاز بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ اس انقلاب کی وجہ کیا ہے؟ لوگ کیوں پہلے ایک ہی سال میں دنیا کی واحد سپر پاور کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، وہ کیا وجہ ہے جس نے لوگوں کو امریکیوں کی جلی ہوئی نعشوں کو ٹھڈے مارنے پر مجبور کر دیا اور وہ لوگ بھی جن کے پاس بڑے ہتھیاروں اور جنگی منصوبہ بندی کا فقدان ہے؟ آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ اس سارے انقلاب کے پیچھے بھی صدام حسین ہے، وہ صدام جو خود پھانسی کے پھندے پر جھول گیا، جس کے دو بیٹے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ صدام یقیناً بے شمار لوگوں کیلئے ظالم، جابر، قابض اور سفاک ہو گا، وہ مطلق العنان بھی تھا، اسے دولت جمع کرنے اور مخالفین کو قتل کرنے کا شوق بھی تھا لیکن جہاں تک عراقی عوام کا معاملہ ہے، صدام عوام کیلئے ایسا معیارِ حکومت چھوڑ گیا جس پر پورا اترنا اب شائد کسی کے بس کی بات نہیں۔

صدام کے دور حکومت میں،، ضرورت سے دگنی تنخواہ کا قانون پاس ہوا، اس قانون کے مطابق چھوٹے ملازمین کی ماہانہ ضروریات کا حساب کر کے انہیں دگنی تنخواہ دی جاتی تھی۔ تنخواہ کو مہنگائی سے نتھی کر دیا گیا تھا، اگر ملک میں ضروریاتِ زندگی کے نرخ میں دس فیصد اضافہ ہوتا تو ملازمین کی تنخواہوں میں بھی کسی نوٹس کے بغیر دس فیصد اضافہ ہو جاتا۔ عدل وانصاف کی یہ صورتحال تھی کہ لوگ اپنی نقدی اور زیورات اپنے گھروں میں رکھتے تھے لیکن سالہاسال کسی چوری کی اطلاع نہیں ملتی تھی۔ 2000ء میں بغداد شہر میں صرف دس ایف آئی آر درج ہوئیں، پورے ملک میں "ون ڈے ،ون پیپر" سسٹم رائج تھا، آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں، حکومت سے کوئی سہولت لینا چاہتے ہیں تو آپ سرکاری دفتر جائیں، آپ کو تمام منظوریاں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ملیں گی اور آپ کو اس کام کیلئے دوبارہ اس دفتر میں نہیں آنا پڑے گا۔

صدام کا "اتوار" عوام کیلئے ہوتا تھا، اس روز کوئی بھی شہری صدام حسین کو فون کر سکتا تھا، صدام حسین اس کا فون خود اٹھاتا تھا اور اس کی جائز شکائت کا اسی وقت ازالہ ہو جاتا تھا۔ صدام حسین عراق کے پسماندہ علاقوں کا دورہ کرتا، کسی گاؤں کے کسی گھر میں اچانک وارد ہوتا، سیدھا فریج کے پاس جاتا اور کھول کر دیکھتا، آیا اس میں اہلِ خانہ کی ضروریات کی چیزیں موجود ہیں؟ اگر چیزیں کم ہوتیں تو فوراً اس خاندان کیلئے وظیفے کا بندوبست ہوتا، جانے سے پہلے کچھ نقدی چپکے سے گھر والوں کے حوالے کرتا۔ پورے عراق میں عوام کیلئے بہت اچھے اسکول، ہسپتال اور کیمونٹی سنٹر تھے، پورے عراق میں تعلیم وصحت کی سہولت مفت اور یکساں تھیں، پورے عراق میں انصاف کا عمل سات دن میں پورا ہو جاتا تھا اور پورے عراق میں دنیا کی تمام نعمتیں موجود تھیں اور سب لوگوں کیلئے ان کا حصول ممکن تھا لہٰذا صدام حسین نے عوام کی عادتیں اتنی،، بگاڑ ،، دی تھیں کہ اب کسی بھی شخصیت یا طاقت کیلئے یہ معیارِ حکومت برقرار رکھنا ممکن نہیں۔

یہی وہ وجہ تھی جس نے ایک ہی برس کے بعد عراقی عوام کو امریکا جیسی فرعونی طاقت کے سامنے کھڑا کر دیا اور آج تک اسی استقامت کے ساتھ امریکا اور اس کے اتحادیوں کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔ لوگ نئے دور کا پرانے عہد سے تقابل کرتے ہیں تو انہیں آج کے عراق اور صدام کے عراق میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے، کہاں وہ فراوانی کہ دنیا جہاں کی نعمتیں دروازے پر پڑی تھیں اور کہاں یہ وقت کہ تیل کے دوسرے بڑے ملک میں لوگ پٹرول کیلئے قطار میں کھڑے ہیں لہٰذا عراق کے پانچ کروڑ لوگ امریکا کیلئے سلگتے ہوئے بم بن گئے ہیں اور ہر آئے دن یہ بم امریکیوں اور ان کے اتحادیوں کے درمیان پھٹ رہے ہیں۔

ادھر کرغیزستان میں عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، حکومت کی کرپشن، اقربا پروری، عوام کی مرضی کے بغیر امریکا کو اپنی زمین پر اڈے بنانے کی اجازت، امریکی حکومت کی بے پناہ حمائت بالآخر یہ قیامت کا موجب بنی کہ وہاں کے وزیرِ داخلہ کو لوگوں نے مار مار کر ہلاک کر دیا اور اس کے علاوہ

حکومت کا جو بھی آدمی ہاتھ لگا، عوام نے اس کی تکا بوٹی کر دی۔ ملک کے وزیرِ اعظم نے استعفیٰ دیکر کہیں چھپنے میں اور ملک کے صدر نے بھاگ جانے میں عافیت سمجھی۔ اخبار میں جو تفصیل چھپی ہے وہاں صرف لفظ "کرغیزستان" کو ہٹا کر لفظ "پاکستان" تحریر کر دیا جائے تو قطعاً تعجب کی بات نہ ہو گی کہ موجودہ حالات کو دیکھ کر ایسی ہی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

فلوجہ شہر کے باہر کھڑے عراقی اور کرغیزستان کے عوام تیسری دنیا کے تمام حکمرانوں کیلئے ایک پیغام ہیں، یہ جمہوری نظام کی تعریف میں رطب اللسان جیسے غیر حقیقی اور غیر فطری مسائل کے شکار لیڈروں سے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ دنیا کے حافظے میں وہی حکمران زندہ رہتے ہیں جو عوام کو سہولت دیتے ہیں، جو عوام کی خدمت کرتے ہیں، ملکی قانون کی پاسداری کرتے ہیں، ملک کی عدالتوں کا مذاق نہیں اڑاتے، ملکی دولت لوٹ کر اپنی تجوریاں نہیں بھرتے ۔

صدام حسین کا اقتدار ختم ہو چکا، اس کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا لیکن جس ہمت اور دلیری کے ساتھ اس نے پھانسی کے تختے پر "اللہ اکبر" کے نعرے بلند کئے، وہ آجکل عراقیوں نے اپنے موبائل ٹیلیفون کی گھنٹیوں میں محفوظ کر لئے ہیں تاکہ ہر لمحہ ان کو صدام یاد رہے اس لئے کہ انہیں صدام کا طرزِ حکومت ساری عمر یاد رہے گا اور اسی طرزِ حکومت کی وجہ سے صدام آج بھی ان کے دلوں میں زندہ ہے، اور اس کی محبت میں مہندی کے رنگ کی طرح آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عراق کی ہر دیوار پر یہ حقیقت سورج کی طرح لکھی ہوئی ہے! ہمارے ہاں ایک طرف تو قوم کو اٹھارویں ترمیم کی کامیابی کے افسانے سنائے جا رہے ہیں، گویا ہمارے حکمرانوں نے ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہا دی ہیں اور عوام ان نعمتوں کے بعد دن رات ان کے گن گائیں گے اور دوسری طرف ملک کی اعلیٰ عدلیہ کے احکامات کی تضحیک اڑائی جا رہی ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم میرا رب ان تمام سازشوں سے واقف ہے!

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ

"ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے، یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ (سورۃ البقرہ 17۔19)

بروز جمعرات 29 جمادی الاوّل 1431ھ 13 مئی 2010ء

مرگِ مسلسل

مجھے اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی کوئی فکر نہیں۔ افق تا افق پھیلی ایسی شخصیتوں کا گھیرا اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ کسی گھیرے میں آ ہی نہیں سکتیں ۔ جب ایسے لوگ مر جاتے ہیں تو ان کی لاشوں کے سرہانے کھڑے فاتحین جشن فتح منا رہے ہوتے ہیں تو بھی ان کی آسودہ روحیں گھیرے توڑ کر نئے قالبوں میں ڈھل رہی ہوتی ہیں اور ان کے ہر قطرۂ خون سے نئے چمنستان کھل رہے ہوتے ہیں۔

ایمن الظواہری کی بیوی "عزہ" کہتی ہے "ڈاکٹر صاحب نے مجھے کبھی بھی اپنی سرگرمیوں کے متعلق نہیں بتایا لیکن ایک بات وہ تواتر سے کہتے ہیں "میں شہید کی موت مرنا چاہتا ہوں" ایمن الظواہری کی کچھ یادداشتیں سات سال قبل معروف اخبار "شرق الاوسط" میں شائع ہوئی تھیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے "میں سید قطب شہید سے ملا تو اس نے کہا "برادر عزیز! آگے بڑھتے رہو' تمہارا راستہ خون سے لت پت ہے' یاد رکھو! کبھی اپنا سر دائیں یا بائیں نہ موڑنا' صرف اوپر دیکھنا' اوپر' آسمانوں کی طرف"۔

آسمانوں کی طرف دیکھنے والے بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت کے پیمانوں میں سمائی نہ کھانے والے پراسرار لوگ! سو مجھے اس کی کوئی فکر نہیں' مجھے تو اپنی فکر ہے کہ میں زندہ رہنے کیلئے مسلسل مر رہا ہوں' ہر سانس کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں۔ میرا دماغ سن ہوتا جا رہا ہے' کہنے کو کچھ سوجھتا ہی نہیں' سوجھتا بھی ہے تو وسوسے اور واہمے دامن گیر ہو جاتے ہیں کہ قلم سے نکلا کون سا لفظ کس کی طبع نازک پر گراں گزرے؟ دل اندر کے کرب سے پھٹا جا رہا ہے اور آہ تک بھرنے کا یارا نہیں۔ آنسو سوکھ چکے ہیں اور آنکھیں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی ہیں۔ سوالوں کا جنگل گھنا ہوتا جا رہا ہے اور جواب دینے والوں کا کہنا ہے کہ "وسیع تر قومی مفاد" کو صرف وہی جانتے اور سمجھتے ہیں۔

جب پہلی مرتبہ وانا آپریشن عروج پر تھا اور بارہ سو خاندان' عورتوں اور بچوں سمیت پناہ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور فضاؤں میں گن شپ ہیلی کاپٹروں کی گونج اور توپوں کے گولوں نے قیامت بپا کر رکھی تھی عین اس وقت کا امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے مولانا عبدالقادر قصوری کے پوتے کے پہلو میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ "ہم پاکستان کو "نان نیٹو اتحادی" کا عزاز بخشنے والے ہیں" وانا کی گلیوں میں خون ناحق بہہ رہا تھا' ایف سی کے جوانوں کا لہو' پاک فوج کے جانبازوں کا لہو' سادہ پرکار قبائلیوں کا لہو اور جانے کہاں کہاں سے آئے ہوئے اہل حرم کا لہو! کولن پاؤل کا ان میں سے کسی کے لہو کے ساتھ کوئی رشتہ نہ تھا کہ سب محمد ﷺ کے قبیلے کے لوگ تھے۔ اسے شہادتوں اور ہلاکتوں سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔

امریکا ایک تیر سے کئی شکار کھیلنے کا خوگر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ہماری پیٹھ پر تھپکی دینے کیلئے بالکل انتظار نہیں کیا' عین اس وقت جب ہم محض اس کی خوشنودگی اور دلداری کیلئے آگ و بارود کا کھیل کھیل رہے تھے اس نے ہمارے دامن میں "نان نیٹو اتحادی" کا طلائی سکہ اچھال دیا۔ مزدور کو اس کی

پسینہ خشک ہونے سے قبل مزدوری ادا کر دینا اعلیٰ اخلاقی اقدار ہے لیکن کسی جانثار کی جانثاری کی قیمت عین اس وقت ادا کرنا جب وہ انتہائے وفا سے لہو نذر جاناں کر رہا ہو' اس کے جذبۂ خلوص کی توہین ہے۔

نیٹو امریکی بالادستی کی زنجیروں میں جکڑا ایک ایسا اتحاد ہے جس کا بنیادی مقصد دنیا بھر میں امریکی عزائم کے آتشکدوں کو وسائل اور افرادی قوت کا ایندھن فراہم کرنا ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے اس نے چند برس پہلے سات نئے ارکان کو اس کلب میں شامل کرنے کا اعزاز بخشا اور اب ان غلاموں کی تعداد 26 ہو چکی ہے۔ قصر سفید سے اکثر یہ حکم نامہ جاری ہوتا ہے کہ "نیٹو کے سارے نئے اور پرانے ارکان پر لازم ہے کہ وہ کولیشن کو فوجی قوت فراہم کریں چاہے اس مقصد کیلئے انہیں اپنا عسکری بجٹ بڑھانا پڑے۔" نیٹو کے باضابطہ ارکان کے علاوہ کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جو عملاً امریکی مفادات کے مدار کا سیارہ بن چکے ہیں لیکن وہ نیٹو کے عالی نسب حجرے میں داخل ہونے کا استحقاق نہیں رکھتے تاہم انہیں دالان میں بچھی "دریوں" پر بیٹھنے کی اجازت ہے۔

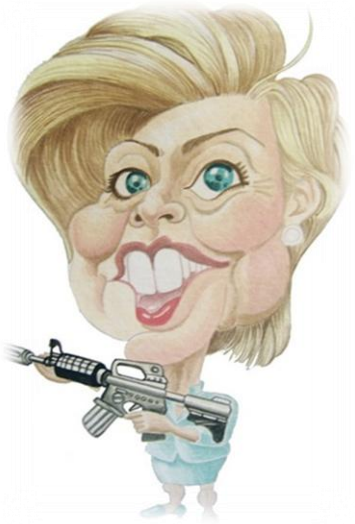

ان نان نیٹو اتحادیوں میں بحرین' مصر' اردن' آسٹریلیا' جاپان' اسرائیل' فلپائن' ارجنٹائن' تھائی لینڈ اور جنوبی کوریا شامل ہیں۔ برسوں سے امریکی چھاؤنی کی شکل اختیار کر لینے اور عراق کے خلاف امریکی یلغار کی لشکر گاہ کا کردار ادا کرنیوالے کویت کو بھی نان نیٹو اتحادی بنایا جا چکا ہے' یوں اب تک چار مسلم ممالک مصر' بحرین' اردان اور کویت کے سر پر یہ کلاہ افتخار سجائی جا چکی تھی کہ پاکستان کو بھی اس مجلسِ فضیلت کا پانچواں رکن نامزد کر دیا گیا۔ اس دن سے لیکر آج تک پاکستان سے وفاداری' جاں سپاری' فدویت گزاری اور خدمت شعاری کا کام لیا جا رہا ہے اور مصر' بحرین' اردن اور کویت کے بازو بھی کورنش بجالانے میں دن رات مصروف ہیں کیونکہ امریکا کو پچاس کی دہائی کی طرح ایک بار پھر جنوبی ایشیا میں ایک کھونٹے کی ضرورت تھی جس کیلئے اس نے پاکستان کا انتخاب کیا۔

"نان نیٹو اتحادی" دوسرے درجے کی مخلوق ہیں جو حقیر سی مراعات اور بے نام سے مفادات کیلئے استعمار کے "نمبر دار" بنائے جاتے ہیں۔ ان کے بھی دو درجے ہوتے ہیں' درجہ اوّل اور درجہ دوم' جب سے پاکستان کو اس شکنجے میں جکڑا گیا ہے ابھی تک یہ طے نہیں کیا گیا کہ پاکستان کا درجہ کیا ہو گا لیکن اتنا طے ہے کہ پاکستان "نان نیٹو اتحادیوں" کے بے وقعت لیکن ایلیٹ کلب کا پہلا ایٹمی مسلمان ممبر ہے۔ اس اعزاز سے پہلے پاکستان کسی نہ کسی طور پر غیر جانبداری کی جو بکل مارے بیٹھا تھا اس کو تار تار کر کے اس کی خارجہ پالیسی پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی گئی کہ پاکستان مکمل طور پر امریکی آغوش میں چلا گیا۔ "ڈومور" کی تکمیل پر گاہے بگاہے امداد کے جامے بھی پہنائے گئے' مطالبات کی فہرست دونوں اطراف سے جب بڑھنے لگی تو ہی سہی کسر "نان نیٹو اتحادی" کا طوق ڈالنے سے پوری کر دی گئی۔ اس کے اڈے پہلے ہی امریکی تحویل میں تھے' ایف بی آئی پہلے ہی سرگرم تھی' اس کے قومی مفادات پہلے ہی امریکی مفادات کے باجگزار تھے کہ "کیری لوگر بل" کے خوشنما لباس میں مشکیں کس کر این آر او زدہ حکمرانوں کے تفاخر میں اضافہ کر دیا گیا اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کو مکمل طور پر "اسٹیٹ آفس" کا ضمیمہ بنا دیا گیا۔

قوم نے کیری لوگر بل کی غلامانہ شرائط پر دہائی دی 'منتخب پارلیمنٹ نے جب شور مچایا تو فوری طور پر ہمارے وزیر خارجہ اس معاہدے میں کوئی تبدیلی کرائے بغیر' 'فوٹو سیشن" کا ڈرامہ رچا کر فتح کی نوید لیکر واپس لوٹے اور پارلیمنٹ میں ایک لمبی چوڑی تقریر ارشاد فرمانے سے پہلے ہی اس بل کو کابینہ نے منظور کرالیا گیا۔ ماسکو جو یقیناً نئے سرے سے ساری صورتحال کا جائزہ لے رہا ہے اور چین نے بھی ان حالات میں اپنی ترجیحات کی نئی درجہ بندی کرلی ہے۔ ہمسایہ ایران کو بھی ہر حال میں اپنے مفادات سب سے زیادہ عزیز ہیں اور بھارت کے تیور بھی ڈھکے چھپے نہیں۔ اس بات سے کون واقف نہیں کہ اسرائیل کی منظوری کے بغیر اردن 'مصر' بحرین اور کویت جیسے نان نیٹو اتحادیوں کی جھولی میں آج تک مونگ پھلی کا دانہ تک نہیں ڈالا گیا' اسی طرح شاطر بھارت نے اس ایلیٹ کلب کی رکنیت کا عزاز قبول کرنے کی کبھی حامی نہیں بھری لیکن اس کی مرضی ومنشاء کے بغیر امریکا ہمیں بندوق کی ایک گولی بھی دینے کا روادار نہیں کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے اسٹریٹجک پارٹنر ہیں اور یہ بھی طے نہیں کہ امریکا عراق اور افغانستان سے کب نکلے گا لیکن ایک لمبے عرصے تک ہمارا عرق نکالنے کا پورا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

ہماری حکومت کے وزیرِ خارجہ بڑے فخر سے اپنی پالیسیوں کی کامیابیوں کا موازنہ پچھلی حکومت سے کرتے ہیں کہ اب ہم سے "ڈومور" کا مطالبہ نہیں کیا جاتا' اسٹریٹجک مذاکرات کے بعد تو گردن میں تناؤ اور بھی بڑھ گیا تھا لیکن "ٹائم اسکوائر" میں ناکام بم دھماکے میں پاکستانی نژاد امریکی فیصل شہزاد کی گرفتاری پر ہلیری کلنٹن کی برہمی نے کامیاب خارجہ پالیسی کا پول کھول دیا ہے۔ سنا ہے کہ اب شمالی وزیرستان میں "ڈومور" کا حکم دیا جائے گا جہاں امریکی افواج بھی اپنے بہادری کے جوہر دکھانے کیلئے قدم رنجہ فرمائے گی۔ پاکستان کی بہادر افواج کا وہاں کیا ردعمل ہو گا' آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ہلیری کلنٹن نے تو کھلے الفاظ میں اسامہ' ملا عمر اور ایمن الظواہری کے ساتھ ہمارے سیکورٹی کے اداروں کی شناسائی کا الزام دہرایا ہے اور ان سنگین دھمکیوں نے شاہ محمود قریشی کی سر جوڑ کر مسکرانے کی لاج بھی نہیں رکھی۔

مجھے اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی کوئی فکر نہیں' وہ گھیرے میں آجائیں یا پکڑے جائیں' کوئی فرق نہیں پڑتا' ایسے پر اسرار بندوں کے احوال و مقامات ہم جیسے حشرات الارض سے بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ 29/ اگست 1966ء کو سید قطب شہید کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو ایمن الظواہری پندرہ سال کا بچہ تھا۔ اسی سال اس نے "المبعادی" کے اسکولوں میں پڑھنے والے پر عزم طلباء کی ایک تنظیم بنائی اور استعمار کے ایجنٹوں سے لڑنے کی قسم کھائی۔ جب اسے قاہرہ کی ایک پہاڑی پر صلاح الدین ایوبی کے تعمیر کردہ قلعے کی زنداں میں ڈالا گیا تو وہ اکیس سال کا جوان تھا۔ جیل میں داخل ہوتے ہی اس کے سارے کپڑے اتار دیئے گئے' اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی' ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنادی گئیں اور بجلی کے تاروں سے بنے ہوئے کوڑے مار مار کر اس کو لہولہان کر دیا گیا۔ اس کا ایک قیدی رفیق منتصر زیاد بتاتا ہے کہ "ظواہری کو ہر روز صبح وشام تک اس طرح مارا جاتا کہ اگر یہ کوڑے کسی ہاتھی کی پشت پر بھی پڑتے تو بلبلا اٹھتا لیکن ہم نے کبھی اس کی آہ یا چیخ نہیں سنی"۔

مجھے الظواہری کی کوئی فکر نہیں' مجھے تو اپنی فکر کھائے جارہی ہے کہ میں مسلسل مر رہا ہوں اور ہر سانس کے ساتھ ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں۔ بارِ الٰہی! ہمیں اس مرگِ مسلسل سے کب نجات ملے گی؟

بروز جمعتہ المبارک 30 جمادی الاوّل 1431ھ 14 مئی 2010ء

روم سے اسلام آباد تک

ٹرایبون کے سامنے بگھی آکر رکی اور جہازوں کا نگران اس سے اترا، اور ٹرایبون کے پاس آکر بولا "مصر کے ساحلوں پر جہاز سامان لادنے کیلئے تیار کھڑے ہیں، بتائیں کیا چیز لاد کر لائیں، روم کے بھوک سے نڈھال لوگوں کیلئے گندم یا بگھیوں کی ریس کے سٹیڈیم کیلئے اعلیٰ قسم کی ریت؟" ٹرایبون ایک دم چیخا "کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟ یہاں کے حالات کنٹرول سے باہر ہو چکے ہیں، بادشاہ پر طاقت کا بھوت سوار ہے، فوج اس سے دل ہی دل میں اتنی نفرت کرنے لگی ہے کہ کسی بھی وقت بغاوت پر اتر سکتی ہے اور لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، خدا کیلئے جلدی سے ریت منگواؤ، ہمیں ان کے ذہنوں سے ان مشکلات اور پریشانیوں کو دور کرنا ہے۔"

اور پھر جلد ہی شہر میں نقارے بجا دیئے گئے کہ جلد ہی ایک بہت بڑی بگھیوں کی دوڑ منعقد ہونے والی ہے جس کے ساتھ تین سو سے زائد گلیڈی ایٹر کے جوڑے موت تک لڑیں گے، بارہ سو مجرموں کو شیروں کے سامنے ڈالا جائے گا، ہاتھیوں، گینڈوں، بیلوں چیتوں اور جنگلی سؤروں کی لڑائیاں ہونگی اور سب سے اہم بات 20 نوجوان خوبصورت دوشیزاؤں کو پاگلوں اور دیوانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اس سارے کھیل کو دیکھنے کیلئے کوئی ٹکٹ نہیں ہوگا۔ پہلی 36 قطاریں اعلیٰ نسل، اہم شخصیات کیلئے مخصوص ہونگی اور پھر پورا سٹیڈیم تین لاکھ پچاس ہزار افراد کے ساتھ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بھوکے ننگے لوگ بھی، دولت کے نشے میں بدمست بھی اور حکمران ان کی تالیوں، شور اور نعروں سے یہی سمجھ رہے تھے کہ روم میں سب جگہ خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔

ٹرایبون روم میں وہ عہدہ ہوتا تھا جسے لوگ منتخب کرتے تھے تاکہ وہ ان کے حقوق کی حفاظت کرے لیکن بادشاہ کے شوق اور مشاغل کے سامنے وہ ایک بے بس قسم کے وزیراعظم سے زیادہ نہ تھا۔ وہ بس اتنا کرتا کہ ان میلوں ٹھیلوں کے زمانے میں مفت روٹی تقسیم کر دیتا، یوں بادشاہ کی تسکین ان کھیلوں کے انعقاد سے ہو جاتی اور وہاں موجود لوگ چونکہ اس دن پیٹ بھر کر کھانا کھائے ہوتے اس لئے خوب ناچتے، گاتے بجاتے، اچھلتے کودتے، کسی کو اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ اس سٹیڈیم کے باہر جہاں کروڑوں لوگ رہتے ہیں، وہ بھوک کے کس عذاب سے گزر رہے ہیں۔

روم کی دولت مند اشرافیہ جو محل نما مکانات میں رہتی، شہد میں بھنی ہوئی بلبلوں سے ناشتہ کرتی اور بیش قیمت پکوانوں سے دوپہر اور رات کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتی۔ ان کھیلوں کے زمانے میں بالکل بسنت جیسا سماں ہوتا تھا۔ پورا شہر روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوتا، فواروں میں خوشبودار رنگین پانی ڈال دیا جاتا اور گزرنے والے اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے۔ شہر بھر میں موسیقاروں کی ٹولیاں گھومتیں اور ڈرم، بانسری، وائلن اور دیگر سازوں پر دھنیں بجائی جاتیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو محبت کے کیوپڈ دیوتا کا لباس پہنا کر اس سارے منظر میں رنگ بھر اجاتا، مردوں اور عورتوں کی مخلوط میراتھن ہوتی۔ پہلے پہل تو روم والے پورے جلوس میں شامل ہوتے اور پھر یہ صرف عورتوں کے نظارے کا ایک ذریعہ بن گئی اور پھر فلورا کے نام سے برہنہ عورتوں کی دوڑ رواج پکڑ گئی۔

سارے روم میں دانشور، قلمکار، فلاسفر اور ادیب ان کھیلوں کو روم کا طرۂ امتیاز بتاتے، دانشوروں نے اسے غربت کا غم بھلانے، آگے بڑھنے، مذہبی جکڑ بندیوں سے آزادی اور حریت کا نام دیا۔ صرف ایک فلاسفر سنیکا ان کھیلوں کا مخالف تھا جسے بھوک و افلاس سے مرتے لوگ نظر آتے تھے، اسے کھیل تماشے سے ایسی نفرت تھی کہ ان سارے دنوں میں گھر میں بیٹھا آنسو بہاتا رہتا اور پھر ایک دن بادشاہ نے بلایا، غیظ و غضب کا عالم تھا۔ بے بس ٹریبون کی سفارش بھی اس کو نہ بچا سکی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تم میرے حکم سے میرے سامنے خودکشی کرو۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی یہ فاتح قوم جب اس مقام پر آ پہنچی جہاں ترقی، عروج اور خوشحالی کو ناپنے کا پیمانہ یہ ہو گیا کہ لوگ کتنی تعداد میں ان تماشوں میں شریک ہوئے تو پھر اس قوم کی یوں اینٹ سے اینٹ بجادی گئی کہ صحراؤں کے بدو اور ریگستان کے گنوار ان پر چھا گئے اور روم اس کے بعد اپنے عروج کی داستان تک بھول گیا۔ تاریخ قوموں کے ایسے انجام سے بھری پڑی ہے اور حکمرانوں اور دانشوروں کی خام خیالیوں سے بھی آشنا ہے جو لوگوں کی شدید بھوک، غربت، افلاس اور قحط کے عالم میں چند دنوں کے عیش کو ترقی کی معراج کہا کرتے تھے لیکن پتہ نہیں کیوں، پاکستان میں جب کسی ایسی تقریب، ایسے جشن، ایسے پر شکوہ تہوار کی رونق دیکھتا ہوں، ہوٹلوں کی لمبی میزوں پر انواع و اقسام کے کھانوں پر خوش گپیاں کرتے لوگوں کے چہرے پڑھتا ہوں تو مجھے کروڑوں جیالے جو غربت کی لکیر سے نیچے فاقہ زدہ زندگی گزار رہے ہیں اور ہر دو گھنٹے بعد خودکشی کرنے والے شخص کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا ہے، خاکروبوں کی ملازمت حاصل کرنے کیلئے اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی لائنیں نظر آجاتی ہیں، آٹے، چینی اور دیگر زندگی کی ضروریات حاصل کرنے والے بوڑھے مرد اور عورتوں کی قطاریں جن پر پولیس والے بڑی بیدردی کے ساتھ لاٹھیاں برساتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، شدید گرمی میں لوڈشیڈنگ کے عذاب میں مبتلا چیختی چنگاڑتی عوام سڑکوں پر ٹائر جلا کر سینہ کوبی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ابھی یہ سارے جان لیوا عذاب سے جان نہیں چھوٹی کہ ان جیالوں کی محبوب لیڈر بے نظیر بھٹو کے قتل کی رپورٹ سامنے آگئی، زرداری صاحب نے بی بی کا تو پوسٹ مارٹم ہونے نہیں دیا لیکن میڈیا دن رات اس رپورٹ کے ہر پہلو کا پوسٹ مارٹم کر رہا ہے۔ بی بی کی پارٹی کے وہ رہنما جنہوں نے دن رات بی بی کے ساتھ گزارے اور اس کی شہادت کے غم میں آج بھی نوحہ کناں ہیں، اپنی ہی حکومت کی کارکردگی سے انتہائی مایوس اور شرمندہ ہیں بلکہ اب تو ان کی اپنی پارٹی کے کئی حکومتی افراد کی طرف انگلیاں اٹھ رہی ہیں اور ان کے مطالبے شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

اسی دباؤ کو ختم کرنے کیلئے زرداری صاحب اب تک کئی متضاد بیانات دیکر بی بی کی المناک موت کی تحقیق کا رخ موڑ چکے ہیں۔ زرداری صاحب نے پہلے ساری قوم کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ بی بی کے قاتلوں کو جانتے ہیں لیکن ملک کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے واضح طور پر بیت اللہ محسود کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا، زرداری صاحب نے بیت اللہ محسود کو بری کرتے ہوئے اب حال ہی میں افغان مہاجرین کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کہا کہ ہم نے جن کو تیس سال پناہ دی انہوں نے ان کی اہلیہ کو قتل کر دیا اور آج انہوں نے اچانک اقوام متحدہ کے کمیشن کی رپورٹ کے نتائج کو

یکسر مسترد کرتے ہوئے جس میں وزیر قانون بابر اعوان اور وزیر داخلہ رحمان ملک کے مشکوک کردار کے حوالے سے سنگین سوالات اٹھائے گئے ہیں، اس مقدمے کی تحقیقات کرنے والے حکام کو ان دونوں رہنماؤں سے تفتیش نہ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

جیالے ابھی اس صدمے میں گم سم تھے کہ اچانک ان پر ایک اور بجلی آن گری، ان کے محبوب قائد ذوالفقار علی بھٹو کی پوتی فاطمہ بھٹو نے اپنے باپ مرتضیٰ بھٹو کے قتل کا الزام بے نظیر بھٹو اور زرداری صاحب پر اور اپنے چچا شاہنواز بھٹو کے قتل کا ذمہ دار بھی اپنی پھوپھی بے نظیر کو ٹھہرایا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے بے نظیر کے قتل کے شبہ کا اظہار بھی صدر زرادی پر کیا ہے۔ حال ہی میں اس نے برطانیہ کے میڈیا کے سامنے اپنے ان الزامات کو تواتر کے ساتھ دہرایا ہے اور اپنی کتاب میں بھی ان الزامات کی تفصیلات تحریر کی ہیں۔

معروف ایوارڈ یافتہ برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب نے بھی اپنی چشم کشا رپورٹ میں بہت سی اہم باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ ہسپتال بورڈ کے رکن اطہر من اللہ نے بتایا کہ "ڈاکٹر بہت زیادہ پریشان تھے کیونکہ وہ بی بی کو نہ بچا سکے، انہوں نے پولیس چیف کو تین مرتبہ بتایا کہ پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے لیکن وہ کسی اور کے ساتھ مسلسل فون پر مصروف تھے اور پوسٹ مارٹم کرنے سے روک دیا حالانکہ قانون کی رو سے یہ لازم تھا۔" کرسٹینا نے اپنی رپورٹ میں مزید یہ بھی لکھا کہ اگر اس بات کا تعین نہ ہو سکا کہ بی بی کی موت کس طرح واقع ہوئی تو اس بات کا امکان نہیں کہ قاتل کو تلاش کیا جا سکے گا۔ "لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ زرداری کے صدر ہوتے ہوئے دو سال سے زائد عرصے میں تحقیقات شروع نہ ہو سکی۔ ان تمام حالات میں پارٹی کا جیالا اپنی وفاداریوں کا خون ہوتے دیکھ کر خون کے آنسو رو رہا ہے۔

تو ایسے لمحے میں مجھے روم کا وہ واحد فلاسفر سنیکا ضرور یاد آتا ہے جو کہتا تھا تم جس جشن کو ترقی کی معراج سمجھتے ہو، یہ بھوک پر پردہ ڈال کر اپنی آنکھوں کو دھوکہ دے رہے ہو۔ ایسے لوگوں کے خلاف اگر عوام نہ بھی اٹھیں تو پھر بھی وہ اتنے کمزور ضرور ہو جاتے ہیں کہ بدو اور گنوار بھی ان پر حملہ کر دیں تو خلقت گم سم ان کی موت کا تماشہ دیکھا کرتی ہے کہ اسے تماشہ دیکھنے کی عادت ہو چکی ہوتی ہے!

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے راز سے بھی واقف ہے!

بروز ہفتہ یکم جمادی الثانی 1431ھ 15 مئی 2010ء

شوق کا سفر

میرے خانۂ دل میں بھی ایک شور سا برپا ہے۔ کتنی ہی دیواریں ہیں کہ ایک ایک کر کے گر رہی ہیں۔ ہزار کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ پاکستان ایک معجزاتی ریاست ہے جس کو میرے رب نے ایک عظیم مقصد کیلئے تخلیق کیا ہے۔

قارئین کی ایک بڑی تعداد ابھی تک کالم،، دجالی فتنے،، پر اپنی قیمتی آرءار سال کر رہے ہیں لیکن ایک تحریر ایسی بھی موصول ہوئی جس نے میرے جسم و روح تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں کافی دیر تک گم سم اپنی گم گشتہ یادوں کو جمع کرتا رہا۔ باباجی کو جب تحریر پڑھ کر سنائی تو وہ بھی بے اختیار آبدیدہ ہو گئے، یقیناً تخلیقِ پاکستان کے کئی شہدا آنکھوں کے سامنے اپنے لہولہان لوتھڑوں کے ساتھ حاضر ہو گئے ہونگے!

"میں پچھلے ڈیڑھ سال سے آپ کے کالم پڑھ رہی ہوں لیکن آپ کا کالم،، دجالی فتنے،، میں پروفیسر عبداللہ کا پڑھ کر دل کے کئی پھپھولے پھوٹ گئے جو میں نے پچھلے باسٹھ سالوں سے اپنے دل کے نہاں خانے میں سب سے چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ تخلیقِ پاکستان کے وقت میری عمر بارہ برس تھی اور میرا سارا خاندان صدیوں سے مشرقی پنجاب کے ایک مشہور شہر بٹالہ میں مقیم تھا۔ والد محترم اپنے علاقے کے ایک مشہور بڑے زمیندار تھے اور اپنے فلاحی کاموں کے سلسلے میں پٹھانکوٹ اور امرتسر میں بھی کافی مشہور تھے۔ زمینوں کے حساب کتاب کیلئے لالہ شرماجی بطور منیم پشت در پشت ہمارے ساتھ ہی مقیم تھے اور ان کی بیٹی پشپا اور میں اکھٹے پلے بڑے تھے۔ کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم اس طرح الگ ہونگے کہ زندگی میں کبھی ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھ سکیں گے۔

میرے والد گھر سے کئی کئی دن جب دور ہوتے تو پتہ چلتا کہ ملک کا بٹوارہ ہونے جا رہا ہے اور مسلم لیگ کی تحریک زور پکڑ رہی ہے اور والد محترم مسلم لیگ کی حمائت میں گاؤں گاؤں قریہ قریہ نئے ملک کی افادیت کیلئے دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔ انہی دنوں ملک کی تقسیم کی افواہوں نے جب زور پکڑا تو ہمارے گھر کے بیرونی دالان میں گاؤں کے افراد جمع ہوئے، سب اس بات پر خوش تھے کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل ہو جائے گا اور ہم ایک آزاد مسلمان مملکت کے شہری قرار دیئے جائیں گے جہاں اللہ اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے قوانین کے تحت خلافتِ راشدہ جیسی حکومت ہو گی۔ گویا سارے گاؤں میں ایک ایسی عید کا انتظار ہونے لگا جو صدیوں کے بعد نصیب ہونے والی تھی۔

آدھی رات کو اپنا چہرہ چھپائے میری سہیلی،، پشپا،، نجانے کس طرح دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئی، میرے کمرے سے وہ خوب واقف تھی، میرے ساتھ اس نے زندگی کے کئی شب روز گزارے تھے، اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا، اس نے رونا شروع کر دیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں نے بغلی کمرے میں اپنی ماں کو فوراً اٹھایا۔ پشپا نے بتایا کہ تم جس طرح ہو سکے اپنی حفاظت کا بندوبست کر لو کہ گاؤں پر حملہ ہونے والا ہے اور میرا باپ اس سازش میں شریک ہے۔ میری ماں نے مجھے یہ پیغام دیکر بھیجا ہے کہ آپ کو مطلع کر دوں، اب مجھے جانے دیجئے وگرنہ وہ میرے ٹکڑے کر دیں گے۔

ابھی اس خبر سے گھر والے سنبھل نہ پائے تھے کہ حویلی کے پچھواڑے سے بلوائیوں کا ایک ریلا داخل ہوا، ہاتھوں میں تلواریں، بھالے اور کرپانیں لہراتے ہوئے اپنے خوں آشام ارادوں کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے ماں باپ، میرے پانچ بہن بھائیوں سمیت گھر کے تین ملازمین کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ میں خوف کے مارے بھوسے کے اس کمرے میں چھپ گئی جس کے اندر داخل ہونے کی مجھے ساری عمر جرأت نہیں ہوئی تھی۔ حویلی کو آگ لگا دی گئی اور اس بھوسے کے کمرے کو بھی آگ دکھا دی گئی جہاں میں چھپی ہوئی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو گیا کہ کہ میں اس آگ میں بھسم ہو جاؤں گی لیکن میں نے وہاں سے نکلنے کی اس لئے کوشش نہ کی کہ اس طرح عزت کی موت کو گلے لگانا کہیں بہتر ہے، کم از کم عزت و عصمت تو محفوظ رہے گی۔ لیکن اللہ کو مجھے بچانا شائد اس لئے مقصود تھا کہ میں اس شوق کے سفر کی روداد اپنی اس نسل کو سنا سکوں جو پاکستان کی قیمت سے واقف نہیں، اور ان افراد کو بھی شرم دلا سکوں جو آج اس پاکستان اور اس کے بنانے والوں کے خلاف زبان درازی کر رہے ہیں ۔

اس بھوسے والے کمرے میں دھوئیں کی شدت اور آگ کی حدت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں فوری طور پر پچھلے دروازے ۔ میں بھاگ کر سے جانوروں کے باڑے کی طرف نکل جاؤں اس باڑے میں داخل ہوئی تھی کہ کسی نے میرے اوپر چادر پھینک کر ایک کونے کی طرف دھکہ دے دیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ہمارا ملازم چچا جسونت سنگھ تھا جس نے ہم سب بہن بھائیوں کو اپنے ہاتھوں میں کھلایا تھا۔ چند منٹوں کے بعد وہ مجھے اپنے گھر میں لے گیا جہاں میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی۔ پانچ دن اس کے گھر میں اس کے خاندان نے میری حفاظت کی اور بالآخر ایک دن مجھے وہ مسلمانوں کے ایک کیمپ میں چھوڑ گئے اور آج تک جس "کیسری رنگ کی چادر" میں مجھے وہ چھپا کر لائے تھے وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ دو دن کیمپ میں رہنے کے بعد ہمیں ٹرین میں بٹھا دیا گیا اور جب ٹرین نے اپنی منزل کی طرف رینگنا شروع کیا تو میرے گھر کے تمام شہداء خون میں لت پت میری آنکھوں کے سامنے آ گئے اور مجھے نہیں پتہ کہ وہ بوڑھی عورت کون تھی جو مجھے دلاسہ دیتے وقت خود بھی اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ یہ کہہ رہی تھی کہ کوئی بات نہیں اب ہم اپنے ایسے گھر میں جا رہے ہیں جہاں ہمیں کوئی خوف نہ ہو گا اور ہماری طرف کوئی میلی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا۔

ٹرین پہلے ہی آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ اچانک پھر ویسا ہی منحوس شور اٹھا جیسا میں نے اپنی حویلی کے در و دیوار میں سنا اور دیکھا تھا۔ بلوائیوں نے گاڑی پر حملہ کر دیا اور آن کی آن میں بلوائی ٹرین میں داخل ہو گئے اور اس کے بعد کا منظر بیان کے لائق نہیں۔ ہر سامنے آنے والی چیز کا کاٹ کے رکھ دیا گیا اور ان لاشوں کے ڈھیر کے نیچے میں کس طرح بے سدھ گر گئی مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ٹرین کس طرح اس ارضِ پاکستان پہنچی ۔ مجھے تو اس وقت پتہ چلا کہ جب ایک خاکی وردی والا زور سے چلایا کہ "صاحب یہ لڑکی زندہ ہے"۔ مجھے خون کے اس دریا سے نکال کر فوری طور پر ایک

خیمے میں لایا گیا جہاں کچھ فوجی مجھے طبی امداد دینے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ بعد میں مجھے ایک ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا جہاں ایک رحم دل خاتون خالہ شفیقہ نے مجھے پہچان لیا اور میرے گھر کے تمام افراد کا نام لیکر مجھ سے ان کا احوال پوچھتی رہیں۔

مجھے اپنے ساتھ گھر میں لے آئیں اور میری دلداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ زندگی کے معاملات دوبارہ شروع ہو گئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان فرشتہ سیرت افراد نے مجھے بیٹی سے بہو بنالیا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکا منتقل ہو گئی جہاں ان کی مدد سے میں نے بھی پی ایچ ڈی کر لی۔ واپس پاکستان آکر چند سال گزارے لیکن یہ پاکستان انہی لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا اب جن کی اولادیں اس پاکستان اور اس کے مشاہیر کے خلاف تشکیک پھیلا ۔ ہم دونوں میاں بیوی تو حالات سے مجبور ہو کر امریکا واپس آ گئے اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے شاگردوں میں اس وقت رہے ہیں بھی پاکستان کے بہت سے بیوروکریٹ اور اسمبلی میں بیٹھے ہوئے ممبران موجود ہیں بلکہ چند امریکی شاگرد تو امریکا کے اعلیٰ عہدوں پر بھی براجمان ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی نے ساری عمر بالخصوص پاکستانی شاگردوں کو تعلیمی میدان میں ہر طرح سے سپورٹ کیا کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر واپس وطن لوٹیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے اس،، شوق کے سفر،، سے بھی ضرور آگاہ کیا کہ ان کو پاکستان کی قدر و منزلت کا پتہ چل سکے۔

ہم دونوں میاں بیوی بڑی خوشحال ریٹائرز زندگی گزار رہے ہیں، پاکستان کے حالات کے بارے میں ہم بھی اسی طرح پریشان ہیں جس طرح میرے وطن کے دوسرے کروڑوں بیکس اور مجبور انسان لیکن اس کے باوجود مجھے اس بات کا ہمیشہ سے یقین رہا کہ ایک ایسا دن ضرور آئے گا کہ اسی ملک سے اقبال اور محمد علی جناح کے بیٹے اٹھیں گے اور اس ملک کی قسمت سنوار دیں گے لیکن آپ کے کالم پڑھ کر اور الیکٹرانک میڈیا کی وساطت سے پاکستان کے جو حالات دیکھ رہی ہوں دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور خصوصاً آپ نے جو "یوٹیوب" کے لنکس ارسال کئے ہیں اس کو دیکھ کر پاؤں تلے سے زمین نکلنے خدارا آپ اپنے اس کالم میں ان افراد کی آراء کو ضرور جگہ دیں جو میری طرح اس شوق کے سفر کے مسافر رہیں ہیں۔ آپ کی اس بات میں لگی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ قائداعظم اور پاکستان دونوں اقبال کی دریافت ہیں، جو ہمارے ان مشاہیر کی تضحیک کرتے ہیں تو غیرت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ اس دریافت شدہ جنت سے واپس ان بلوائیوں کی جہنم میں چلا جائے لیکن ایسے لوگ غیرت جیسی انمول نعمت سے واقف نہیں ۔ اللہ میرے اس پاکستان کی حفاظت فرمائے آمین۔

آپ کی بہن ڈاکٹر کشور منصور واشنگٹن"۔

قارئین! مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں کہ اس کے بعد کچھ اور تحریر کر سکوں!

بروز سوموار 3 جمادی الثانی 1431ھ 17 مئی 2010ء

گناہِ کبیرہ

گدھ ہیں یہ سب۔ گدھوں کا راج ہے یہاں۔ مردار خور گدھ... چلتی پھرتی لاشوں کو نوچنے والے گدھ۔ گدھ تو پھر لاشوں کو نوچتا ہے، یہ ایسے سفاک ہیں جو زندہ انسانوں کو پہلے چلتی پھرتی لاشوں میں بدلتے ہیں پھر انہیں نوچنے لگتے ہیں۔ یہ ہے سماج؟ کیا سماج ہے یہ! ہر بونے کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے یہاں۔ اور عوام...! وہ کب ہیں انسان... جی رہے ہیں کب...! بس سانس آ جا رہی ہے۔ اس ظالم اور مدقوق نظام ہی نے جیتے جاگتے انسانوں کو مدقوق کر دیا ہے۔ خون تھوک رہے ہیں وہ۔ چلتے پھرتے انسانوں کا قبرستان۔

آئین، آئین کا راگ، تاراج، تاراج کا کھیل... اور اس پر رقص کرتے ہوئے مدہوش گدھ۔ حکمرانوں کا ذاتی خزانہ بھرا ہوا ہے اور باقی عوام بھوک سے نڈھال ڈھانچے۔

بس یہی سنتا ہوں اللہ خیر کرے کوئی خیر کی خبر نہیں ہے' اور خدا بھی تو کہتا ہے تم اپنی مدد کرنے پر تُل جاؤ تب میں تمہاری مدد کو آئوں گا۔ تم کچھ کر دکھاؤ پھر فرشتے میں اتار دوں گا' مدد کو، نصرت کو۔ تم سر سے کفن باندھو، موت کو للکارو، تمہیں زندگی میں دوں گا، ایسی زندگی کہ پھر تمہیں کوئی مردہ نہیں کہے گا۔ ارے ایسی زندگی جو موت کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دے گی۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ پھر میں تمہارا حامی و ناصر بنوں گا۔ پہلے تم آؤ اپنی مدد پر، پھر دیکھو میں تمہارے چاروں طرف اپنے فرشتے کھڑے کر کے تمہیں محفوظ کروں گا۔ تم پہلے آگ میں کود و۔ ارے اس کو گلزار تو میں بنائوں گا۔ کر کے تو دیکھو، اٹھ کر تو دیکھو... لیکن پہلے تم کچھ کر دکھاؤ۔

اور ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم ٹی وی دیکھتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں، بحث بحث کھیلتے ہیں، سیمینار سیمینار کرتے ہیں۔ سہارا بننے کے بجائے ٹانگیں کھینچتے ہیں ایک دوسرے کی۔ دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے مر جائیں بس "میں" زندہ رہوں، بس "میں" ۔ "میں" کا منحوس چکر۔ کیا لوگ ہیں ہم بھی اسے سادگی نہیں عیاری کہتے ہیں۔ اپنے پالن ہار سے بھی دھوکا، منافقت، جھوٹ اور ریاکاری۔ ہم انتظار کرتے ہیں اپنے رب کا، وہ بھی نیم دلی سے۔ اس کی مدد کا، بے یقینی کے ساتھ۔ ہمیں اس پر بھروسا ہی نہیں ہے۔ اور میرا رب کہتا ہے پہلے تم اترو میدانِ کارزار میں، پھر دیکھو تماشا، اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھو... پھر دنیا دیکھے گی کیسے اترتے ہیں فرشتے قطار اندر قطار۔ پھر سج جائے گا یہ میدان۔ لیکن پہلے تم۔
ہر جگہ آگ اور خون کی بارش، ہر جگہ معصوم انسانوں کا قتل عام۔ ذرا اس لہو کو دیکھیے... ایک رنگ کا ہے ناں کسی کا بھی ہو۔ وہ بچپن میں ایک فقیر گلی میں گنگنایا کرتا تھا' کیا خوبصورت سچ تھا:

ہر آدمی الگ سہی، مگر امنگ ایک ہے
لہو کا رنگ ایک ہے

بارود کی منحوس بو سے اٹا ہوا ہمارا ہر شہر، ہر گائوں۔ خاک و خون میں نہائے ہوئے انسان۔ سسکتی ہوئی انسانیت اور پھر اس پر منرل واٹر سیل بند بوتلوں والے، ٹھنڈے یخ کمروں میں واٹر بیڈ کے مزے لوٹنے والے، بڑی بڑی جہازی گاڑیوں میں سیر سپاٹا کرنے والے اور پھر مزید بلٹ پروف گاڑیاں منگانے والے۔ انواع اقسام کے لذیذ کھانے اور اپنی بکواس کرنے کے ماہر ہمارے حکمران... ان کا پیٹ جہنم کی آگ ہی بھر سکتی ہے۔ انسان کے روپ میں چلتے پھرتے خوب صورت درندے، عوام کی بوٹیاں تکہ کباب کی طرح اڑا رہے ہیں۔ خیر ہی خیر ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

کیوں ہو رہا ہے یہ سب کچھ ؟ ہمارے ٹیکسوں سے مزے اڑا رہے ہیں۔ یہ اتنے سارے لوگ کس مرض کی دوا ہیں! او یارو، ذرا سوچو، کیوں نہیں سوچتے تم۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ کیوں نہیں سوچتے! کان میں روئی ٹھونس کر بیٹھے رہو گے! شتر مرغ کی طرح گردن ریت میں کب تک دیئے رکھو گے! سوچو... خدا کے لیے... سوچو، کچھ کرو۔

سوداگروں نے فروخت کر دیا، سب کچھ بیچ ڈالا ہے۔ ہماری کوئی وقعت نہیں ہے۔ ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مردار ہیں ہم اور مردوں کی کوئی نہیں سنتا۔ کیوں نہیں اس کے محرکات معلوم کرتے... کیوں اس پر نہیں سوچتے ...اتنے سارے خود کش بمبار کہاں سے نازل ہو گئے... کیسے ؟ بتایئے ...ان مبینہ خود کش بمباروں کا راستہ کیوں نہیں روکا جاتا! اور اب تو وہ ہماری حفاظت کے دعویدار۔ ہر طرح کے اسلحہ سے لیس خود نشانہ ہیں۔ اب ان کی حفاظت کون کرے! اب حل نکالا بھی تو کیسا... مہنگائی بڑھا دو تا کہ کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہ ملے، بنیادی انسانی حقوق بھی فنا کر دو۔ بس جبر ہی جبر۔

خون ہی خون۔ انسانوں کا خون ہے یہ... ہر جگہ رائیگاں جانے والا لہو۔ کب بند ہو گی خون کی ہولی؟ کس کی ذمہ داری ہے اسے بند کرنا؟ کون کرے گا یہ ...بتایئے ؟

بدلو اس ذلیل نظام کو... مدقوق نظام، جبر کا نظام، انسانوں پر قائم درندوں کا نظام، منحوس اور بے برکت نظام۔ ہم آپس میں لڑ لڑ کر مر جائیں گے... یہی تو ان کا مقصد ہے۔ لڑائو، الجھائو، منتشر کرو، کچھ سوچنے نہ دو، راگ رنگ کی محفلیں دکھائو، تھرکتے ہوئے نیم برہنہ جسموں کی کیٹ واک کراؤ۔ الجھائے رکھو انہیں اور مزے اڑاؤ۔

میں آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ کہاں ہیں... ہیں بھی یہاں، یا پھر کہیں اور نکل گئے! سوئے ہوؤں کو جگایا جا سکتا ہے، جو سونے کی اداکاری کرے اسے کون جگا سکتا ہے! ایک مرتبہ پھر ایک فرد کو بچانے کیلئے ملک کے اداروں میں تصادم ہونے جا رہا ہے۔ ملک کی عدلیہ کے احکام کو کون نافذ کرے گا۔ قانون کی بالادستی کا مذاق وہ اڑا رہے ہیں جنہوں نے ملک کے قوانین کی پابندی کا حلف اٹھا رکھا ہے۔

نیویارک ٹائم اسکوائر میں ایک ناکام کار بم حملے کو ناکارہ بنادیا گیا اور اس کے مجرم کو چند گھنٹوں میں پکڑ کر ساری دنیا کے میڈیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ کارکردگی کا حاصل اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات 'مجرم فیصل شہزاد پاکستانی نژاد امریکی ہے اور پچھلے سال اس نے پاکستان میں تین ماہ گزارے اس نے ان تمام بھیانک کاموں کی تربیت حاصل کر کے یہ خوفناک جرم کا ارتکاب کیا۔ میں اپنے 14 مئی کے کالم "مرگِ مسلسل" میں اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اب باری شمالی وزیرستان کی ہے۔ ایک ہی دن 27 ڈرون حملوں نے شمالی وزیرستان میں جو قیامت برپا کی ہے' پاکستان میں اس کھلی دہشتگردی اور جارحیت کی مذمت پر کہیں نہ شور اٹھا ہے اور نہ کسی غم و غصہ کا اظہار ہوا ہے۔ دفتر خارجہ نے بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں اور حکومتی افراد میں سے بھی کسی نے اس کے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اطلاع درست تھی کہ ہماری حکومت نے امریکا سے خود ڈرون حملوں کی تعداد بڑھانے کو کہا تھا۔

اٹھارویں ترمیم نے جس پارلیمنٹ اور وزیراعظم کو ملک میں پہلی مرتبہ اس قدر طاقتور کیا ہے 'وہ ابھی تک خاموش تماشائی کیوں ہے؟ پاکستان میں پہلی مرتبہ فوجی سپہ سالار نے تمام فوجیوں کو پاکستان کے تمام سول اداروں سے واپس بلا کر عملاً سیاست سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا لیکن کیا پاکستان کے دفاع سے سے بھی بری الذمہ ہو گئے؟ اسی آئین نے ہماری بہادر افواج کو بھی پابند بنایا ہے کہ کسی بھی بیرونی جارحیت کا منہ توڑ جواب دے پھر وہاں سے بھی یہ خاموشی آخر کب تک؟ پاکستان کی سالمیت کا ہر آئے دن یہ کھلا مذاق اخر کب تک؟ کیا پاکستانی عوام اپنی بے بسی کو اسی بے شرمی سے برداشت کرتی رہے؟ ملک کی دوسری سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ (ن) بھی اس سنگین معاملے کو ایک "نان ایشو" قرار دیکر داخل دفتر کرنے کا اعلان کر رہی ہے تو ان بے گناہ افراد کو سفاکی اور درندگی کے ساتھ قتل کر دینے کی ایف آئی آر کس کے نام کٹوائی جائے؟ امریکا' موجودہ حکومت' پاکستانی پارلیمنٹ یا بہادر افواج؟

جاگنا ہو گا تمہیں۔ تمہارا ہے یہ ملک۔ یہ پاک سرزمین تمہاری ہے۔ اور تم اس مٹی کو برباد ہوتا دیکھ رہے ہو، اپنی دھرتی کو اجڑا ہوا دیکھ سکتے ہو تم... تو ضرور دیکھو۔ مگر میں تو اس گناہ کبیرہ میں شامل نہیں ہو سکتا!!!

رہے نام میرے رب کا جس نے غیرت کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے!

تیری دنیا کو لگ گئی ہے نظر

اس کا صدقہ اتار دے مولا

بروز بدھ 5 جمادی الثانی 1431ھ 19 مئی 2010ء

کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟

ڈاک میں موصول ہونے والی یہ بھیانک تصویر میری آنکھوں میں کندہ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے اسے میز کی دراز میں مقفل بھی کر دیا ہے لیکن پھر بھی اس کے وحشتناک نقش و نگار کے پیچھے چھپا ہوا معصوم چہرہ ایک ٹکٹکی باندھے مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ تصویر میرا پیچھا چھوڑ دے ،کچھ لکھنے کیلئے بیٹھا ہوں تو الفاظ روٹھ گئے ہیں، سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس تصویر نے میرے دل و دماغ کو کیوں تہہ وبالا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ اس تصویر کو میرے دل کے نہاں خانوں میں جس محبت کے فریم نے چھپا رکھا ہے، اچانک اس پر حملہ کر دیا گیا ہے!

وہ میری آرزؤں کے محور پاکستان کا فرزند ہے۔ اس نے پاکستان کیلئے اپنے گھر بار اور اپنے عزیزوں کی قبروں کو بھی خیر باد کہا، اس نے پاکستان کی فصیلِ دفاع ناقابل تسخیر بنانے کیلئے ہالینڈ کی بھاری تنخواہ اور ڈھیروں آسائشوں کو ٹھوکر مار کر چکلالہ کی تپتی ٹین کی چھت کی بیرک میں ایک عزمِ صمیم کے ساتھ بیٹھنا اپنا اعزاز سمجھا۔ 1998ء میں جب بھارت نے جوہری دھماکہ کیا تو اس لے لیڈروں نے پاکستان کو برہنہ دھمکیوں کی زد میں رکھ لیا۔ دو ہفتوں بعد چاغی کی چوٹیوں سے پیغام جاری ہوا کہ برہمنی سامراج اپنی حدوں میں رہے کہ اب ہم بھی ایک ایٹمی قوت ہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر قدیر خان، قومی ہیرو کی حیثیت سے اہل وطن کی دھڑکنوں میں بس گیا۔ وہ ان کی دعاؤں میں لو دینے، ان کے نغموں میں رس گھولنے اور ان کے خیالوں میں خوشبو بن کر مہکنے لگا۔ اس کے دنوں کی تپش اور راتوں کے گداز نے قوم کو سربلند کر دیا تھا اور وہ اس کی شکر گزار تھی۔ پھر سات سمندر پار سے جلتی بلتی ہوا کا ایسا جھونکا آیا کہ ہنستا بستا چمن اجاڑ ہو گیا۔ ایک دن اسے کچھ اس طرح دربار میں لایا گیا جیسے وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے چل رہا ہو۔ اس کو حکم دیا گیا کہ ٹیلیویژن پر آکر محبت کرنے والی قوم سے اپنے سارے کبیرہ صغیرہ، ناکردہ گناہوں کی معافی مانگے کہ اسی میں اس کی اور ارضِ پاکستان کی عافیت ہے۔ میرے دل میں بسنے والے اس ہیرو نے ارضِ وطن کیلئے اس قربانی کو بھی اپنے لئے اعزاز سمجھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس ملک کے اقتدار پر قابض ناجائز قبضہ گروپ اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے اس کی عزت و آبرو کی قربانی مانگ رہا ہے، اس نے ایک لمحہ تاخیر نہیں کی اور کرب وبلا کے اس میدان میں اکیلا و تنہا اپنی قوم سے اشکبار آنکھوں سے معافی مانگنے آن پہنچا۔

قوم نے اپنے ہیرو کی اس بے حرمتی کو دیکھنے ،ماننے اور یقین کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ایک بار پھر قوم کے دلوں کی رفعتوں کو چھونے لگا، لیکن جنہوں نے اسے پھانسنے کیلئے فرضی گاہکوں کا سوانگ رچایا اور جو پاکستان کے جوہری پروگرام کے تصور سے ہی انگاروں پر لوٹنے لگتے ہیں، وہ اسے رسوائیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل کر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ انہیں شکائت ہے کہ ،، مجرم ،، سے براہِ راست باز پرس کا موقع نہیں دیا جارہا۔ ان کا فتنہ شعار میڈیا پیہم اس کی ،، سیاہ کاریوں ،، کی داستانیں تراش رہا ہے۔ ان کے اخبارات ورسائل اس کے دامانِ صد چاک کا ایک ایک تار ادھیڑ ڈالنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہم ان کی خدمت میں اتنی عرضی گزارنے سے بھی قاصر ہیں کہ ،، ہم نے اسے معاف کر دیا ہے، تم بھی معاف کر دو ،، لیکن

وہ بھلا اس آدمی کو کیسے معاف کر دیں جس نے پہلی بار کسی مسلمان ریاست کو نا قابل تسخیر بنایا بلکہ عالمِ اسلام کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں سے باہر نکالا کہ وہ نہ صرف استعمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں بلکہ سر اٹھا کر چل سکیں۔

میں اس خاکی لفافے کو کھول کر عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس میں معروف امریکی جریدے،،ٹائم،،کا 14 فروری 2005ء کا شمارہ تھا۔ سرخ حاشیے سے آراستہ ٹائٹل پر ایک شخص کی بھیانک سی تصویر تھی جو کسی ہنر مند نقاش نے بنائی تھی۔ چہرے کے مسخ شدہ خدوخال ہٹلر کی جھلک دے رہے تھے ۔اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں بلا کی سفاکی تھی اور سیاہیوں میں لتھڑے اس کے چہرے کا ایک ایک زاویہ وحشت و درندگی کا نمونہ تھا۔ ٹائٹل پر ہی پیلے رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا "خوف و دہشت کا سوداگر" اور اس کے نیچے رقم تھا "جامع رپورٹ: اے کیو خان کس طرح دنیا کا بڑا جوہری کھیپیا بن گیا؟" اندرونی صفحات پر ڈاکٹر خان کی ایک چھوٹی سی تصویر کے نیچے آمنے سامنے کے دو صفحات پر چیختی چنگاڑتی سرخی ہے "وہ شخص جس نے بم فروخت کیا اس کے نیچے تحریر تھا۔ "کس طرح پاکستان کے اے کیو خان نے مغربی انٹیلی ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ایٹمی ہتھیاروں کی سمگلنگ کا عالمی نیٹ ورک قائم کیا؟ ایسا نیٹ ورک جس نے دنیا کو اور زیادہ خطرناک جگہ بنا دیا،، اور پھر کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

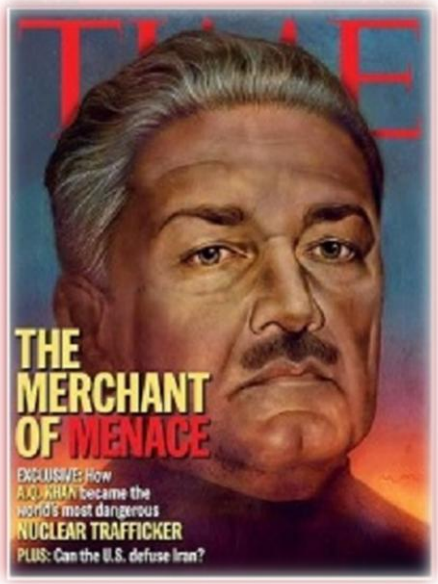

"اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ عبدالقدیر خان پاکستانی دارلحکومت میں واقع اپنے گھر سے نکلتا اور ٹہلتا ہوا سڑک کے اس پار درختوں میں گھرے پارک کی طرف نکل جاتا تھا جہاں بندر اس کے منتظر ہوتے تھے اور وہ انہیں کھانا کھلاتا تھا لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ایک قومی ہیرو، ایک کروڑپتی، جدید ترین گاڑیوں کے ایک بیڑے اور دبئی سے ٹمبکٹو تک پھیلی جائیدادوں کا مالک تھا۔ اب 68 سالہ خان سڑک پار کر کے بندروں کو کھانا کھلانے نہیں جا سکتا، اب وہ کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اس کا جدید طرز کا چوڑا چکلا گھر اسلام آباد کی فیصل مسجد سے متصل سبز پوش پہاڑی ڈھلوانوں پر واقع ہے جو سبز بیلوں سے ڈھکی دیواروں کے پیچھے سے جھانک رہا ہے۔ عام آدمی کیلئے گھر کی صرف ایک نشانی اس کے مکین کے "بدکار پیشے" کا پتہ دیتی ہے اور چھتری نما بادل کی شکل میں تراشی گئی چنبیلی کی ایک جھاڑی ہے جو ڈرائیو وے کے آخر میں کھڑی ہے، اب وہ اس گھر میں نظر بند ہے۔ حکومتِ پاکستان اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی صحت بری طرح گر رہی ہے اور امکان یہی ہے کہ اس کی زندگی کے باقی گنے چنے دن اسی گوشہ گمنامی میں تمام ہو جائیں گے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر آکر اپنے ملک کے نہائت ہی قیمتی راز فروخت کرنے کا اعتراف کئے اسے ایک سال ہو گیا ہے اور دنیا نے اب اس کے "پر فریب دھندے" کی وسعتوں کا پتہ چلانا شروع کیا ہے تا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کس طرح ایک فردِ واحد نے کرۂ ارضی کو غیر محفوظ بنانے میں خطرناک تریں حکومتوں سے بھی زیادہ خوفناک کردار ادا کیا"۔

کئی صفحات پر محیط اس رپورٹ میں ڈاکٹر اے کیو خان کیلئے وہ ساری اصلاحات استعمال کی گئیں ہیں جو کالے دھندے میں ملوث اخلاق باختہ اوباشوں کیلئے

استعمال کی جاتی ہیں، ایسے تمام القابات اس کے نام کے ساتھ جوڑ دیئے گئے ہیں جو سیاہ کار غنڈوں، مجرموں، بدمعاشوں اور بدکاروں کیلئے وقف ہوتے ہیں۔ مضمون کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ اگر دنیا میں صرف ایک انسان کو سب سے خوفناک اور مکروہ ترین مجرم قرار دینا ہو تو وہ صرف ڈاکٹر عبد القدیر خان ہے جو اسلام آباد کے ایک گھر میں بیٹھا زندگی کے آخری دنوں کی تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ شمار کر رہا ہے۔

لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ ہالینڈ کی عدالت نے اسے نہ صرف باعزت بری کر دیا بلکہ اس کے سائنسی علم کی تحسین بھی کی۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جو تحقیقات روزِ روشن کی طرح تاریخ کا ایک انمٹ حصہ بن چکی ہیں ان سے بھی دنیا کو آگاہ کیا جائے۔ امریکا بہادر جس نے سب سے پہلے دنیا کے اس خطرناک بم کے استعمال کو اپنے لئے وجہ شجاعت سمجھا، اس نے بھی جرمنی سے تین یہودی سائنسدانوں کو اغوا کر کے اس خطرناک بم کی بنیاد رکھی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی نے بھی ایٹمی صلاحیت اسی طریقے سے حاصل کی جس کا الزام ڈاکٹر اے کیو خان پر لگایا جا رہا ہے اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اسرائیل نے ایٹمی صلاحیت امریکا کی آشیر باد سے حاصل کی۔ بھارت اور سوویت یونین کے کئی سائنسدانوں پر جوہری رازوں کی اسمگلنگ کا جرم تو ثابت بھی ہو چکا لیکن ان تمام افراد اور ملکوں کے خلاف چشم پوشی کیوں کی گئی؟

ڈاکٹر اے کیو خان پر ان بیہودہ الزامات کی تو ابھی تک تصدیق نہیں ہو سکی لیکن یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ کسی بھی اسلامی ملک کا جوہری طاقت کا مالک ہونا یہود و ہنود کو گوارہ نہیں۔ عراق کو جن بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر تہس نہس کر دیا گیا، عراق کے چودہ لاکھ بے گناہ افراد اور افغانستان کی آدھی آبادی کے پرخچے اڑا دیئے گئے، آج خود امریکا کا کولن پاؤل اور دوسرے سرکردہ امریکی حکومت کے اہلکار اس جھوٹ پر شرمندگی کا اظہار کر چکے ہیں لیکن ابھی تک اس خوں آشام قوتوں کے ایجنٹ جھوٹے پراپیگنڈے کا سہارا لیتے ہوئے ان کی بولیاں بول رہے ہیں۔ پاکستان کا جوہری پروگرام تو بھارت کے مکروہ عزائم کا ردعمل ہے لیکن کوئی بھارت سے یہ تو پوچھے کہ ان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے ساری دنیا کے سامنے تحریری طور پر کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کا وعدہ کیا تھا پھر کیا وجہ ہے کہ اب تک یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا اور یہ وعدہ یاد دلانے پر ایک لاکھ سے زائد بے گناہ مظلوم و مقہور کشمیریوں کو ذبح کر دیا گیا۔ ہر آئے دن اسرائیل اپنے ناجائز قبضے کو وسعت دینے کیلئے فلسطینیوں کے خون کی ہولی کھیل رہا ہے

میں نے یہ میگزین پرانی کتابوں والی الماری کی ایک دراز میں مقفل کر دیا ہے لیکن اس کے ٹائٹل پر بنی خوفناک تصویر میری پتلیوں میں کندہ ہو کر رہ گئی ہے۔ مارگلہ کی پہاڑیوں سے فصلِ بہار کے قافلے اسلام آباد کا رخ کرنے لگے ہیں۔ اے کیو خان کا گھر ان کے راستوں کے پہلے پڑاؤ پر واقع ہے اور وہ یقیناً لمحہ بھر کو رک کر اس گم گشتہ ہیرو کا پتہ پوچھتے ہیں۔ رت بدل جانے کے بعد بندروں کے غول بھی پہروں اس کے گھر کے بند پھاٹک پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں کیونکہ بہاریں اور بندر، بھلے لوگوں اور محسنوں کو دیر تک یاد رکھتے ہیں۔

"ٹائم" کے ٹائٹل پر چھپی بھیانک تصویر میں چھپا ایک معصوم چہرہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے اور جیسے پوچھ رہا ہو "کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟"

بہت اداس تھا منظر چراغ بجھنے کا

لپٹ کے رو دیا، میں بھی ہوا کے جھونکے سے

بروز جمعتہ المبارک 7 جمادی الثانی 1431ھ 21 مئی 2010ء

انسان خسارے میں

ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو پیشانی میں ہے، اسے پیش آنا ہے۔ جو کاتب تقدیر نے لکھا ہے اسے پورا ہونا ہے۔ خیر یا شر۔ برا یا بھلا۔ جو کچھ بھی آنے والے ایک پل کے پردے میں چھپا ہے۔ پل گزرتے ہی سامنے آجانا ہے۔ اگلے پل کے پیچھے کیا چھپا ہے، کیا سامنے آئے گا۔ پچھلے پل کا تسلسل یا اس کے بالکل برعکس۔ کون جانے، کس کو معلوم؟

انسان کے بس میں کب کچھ ہے۔ جو کچھ ہے سلطان کے بس میں ہے جو رحمان و رحیم بھی ہے، قہار و جبار بھی۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا کوئی کاٹھی جو وقت کے بے لگام گھوڑے پر ڈالی جا سکے۔ کوئی لگام نہیں جو اس گھوڑے کا منہ موڑ دے؟ کیا کوئی چابک نہیں جو اس اڑیل کو صحیح سمت میں نہیں، رواں رکھ سکے؟ کیا کوئی رکاب نہیں جو سوار کو سواری کی پیٹھ سے چپکا سکے' اسے اوندھے منہ گرنے سے بچا سکے؟

نہیں ایسا نہیں ہے' رب رحمان نے انسان کو سمجھایا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو پیشانی میں ہے اسے پیش آنا ہے۔ کاتب تقدیر نے لکھا ہے اسے پورا ہونا ہے۔ لیکن ہونی کیا ہے' پیش کیا آنا ہے' کاتب تقدیر نے کیا لکھا ہے' سوائے اس کے کہ "بما کسبت ایدیھم"۔ جو کچھ تم نے اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ اس نے راستے دکھائے ہیں۔ "ھدینہ النجدین"۔ بھلائی اور برائی کے راستے۔ اس نے تو سمجھایا ہے۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا"۔ ہم نے الہام کیا ہے، برائی کا بھی، بھلائی کا بھی۔ اس نے تو بار بار یاد دلایا ہے۔" قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا" کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔' لا یضیع عمل عامل منکم' ' (وہ کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا)۔ اور پھر اس نے کہا ہے تول لیا جائے گا تمہارا ہر عمل اچھا یا برا، چھوٹا یا بڑا' اور فیصلہ کر دیا جائے گا تمہارے فلاح یا خسارے کا۔ اس نے انسان کو متنبہ کیا ہے۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وقت کی قسم تمام انسان خسارے میں ہیں۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے" اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس خسارے سے کیسے بچا جائے۔ اس نے وقت کا منہ زور گھوڑا ہی تخلیق نہیں کیا' اس نے کاٹھی بھی دی ہے، لگام بھی' چابک رکاب بھی۔ ایمان کی کاٹھی' عمل صالح کی لگام۔ تواصی حق کی چابک اور تواصی صبر کی رکاب۔ تاریخ سے پوچھ کر دیکھئے۔ کون ہے جس بھی دی ہے، نے وقت کے بے لگام گھوڑے کو قابو کرنے کے لیے ان اجزاء کو استعمال کیا ہو، اور ناکام رہا ہو۔ کون ہے جس نے ان اجزاء سے دامن چھڑایا ہو اور کامیاب ہوا ہو۔

لیکن ہمارا معاملہ عجیب ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ "تمنا برق کی رکھتا ہوں اور افسوس حاصل کا"۔ سمجھانے والے سمجھاتے رہ جائیں۔ راہ دکھانے والے راہ دکھاتے رہ جائیں۔ ہم کسی کی کب سنتے ہیں۔ ہم کہ عقل کل ٹھہرے، کب کسی کی مانتے ہیں۔ ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن نہ اس کے دین کو مانتے ہیں نہ یوم الدین سے ڈرتے ہیں۔ ہم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، لیکن اس سے ہدایت نہیں لیتے۔ ہم نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے ہیں، لیکن ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ زندگی ہم فرعونوں کی طرح گزارتے ہیں لیکن عاقبت موسیٰ کی مانگتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اعتدال پسند، روشن خیال اور جمہوریت کے شیدائی کہتے نہیں تھکتے، لیکن اپنے رویوں میں انتہا پسندی، تاریک خیالی، اور آمریت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ کہیں اقتدار کا سنگھاسن نہ ڈول جائے۔ اقتدار قائم رکھنے کا خاندانی راز بزرگوں سے سیکھا کہ باپ دادا نے بھی اطاعت میں زندگی گزاری' جس کسی نے حق کی طرف توجہ دلائی اس کو زنداں کی تاریکی میں پھینک دو کہ اس کا علاج یہی ہے!

کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تو دین حق کی مرہونِ منت ہے' اس کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی سازش تو ان حق کی قوتوں سے جنگ کے مترادف ہے۔ اس کے سامنے بھلا پہلے کون ٹھہرا ہے۔ وہ تو اپنے بندوں کو یاد دلاتا ہے "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفْ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمَوَالِ وَالأنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ---- اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطرہ' فاقہ کشی' جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے' ان حالات میں جو صبر کریں اور جب کوئی مصیبت آن پڑے' تو کہیں کہ' ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے' انہیں خوشخبری دے دو' ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہونگی' اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

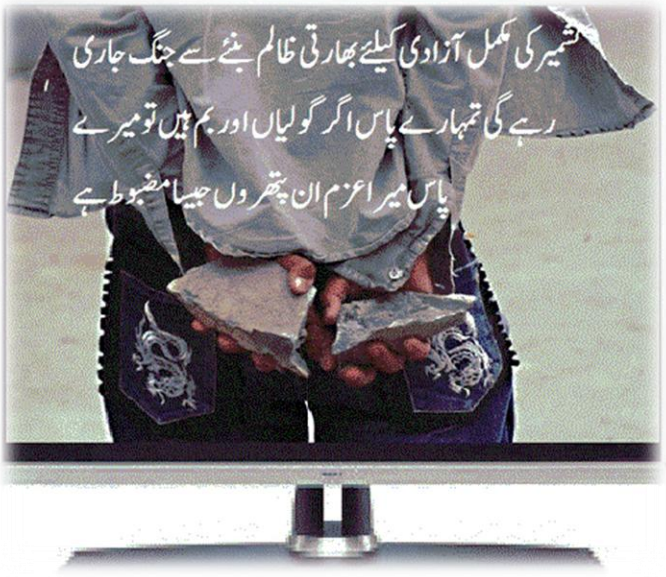

اس کھلی خوشخبری کے بعد بھلا کوئی حق پرست کیسے ان زندانوں سے ڈر سکتا ہے!

کیا ایک لاکھ سے زائد جانوں کی قربانی اس بات کی روشن دلیل نہیں کہ جس رب نے ہر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے' وہ ہر حال میں حریت کیلئے اپنی جاں تک قربان کر دینے کا عزم رکھتا ہے۔ اس مردم شماری سے اگر سروں کی گنتی مقصود ہے تو پھر ان مجبور و مقہور بے گناہ سر فروشوں کی تعداد بھی سامنے آنی چاہئے جو کشمیر کی آزادی کیلئے قلم کر دیئے گئے۔ ان اجتماعی قبروں میں دفن گمنام شہداء کا بھی حساب ہونا چاہئے جن کی مائیں ابھی تک نوحہ کناں ہیں' جن کے معصوم بچے اپنے والدین کی صورت دیکھنے کو ترس رہے ہیں۔ ان معصوم جوان بچیوں کا بھی حساب ترتیب دینا ہو گا جن کی عصمتیں لوٹ لی گئیں۔

چھ دہائیاں پہلے اسی ملک کے پہلے زیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے خود پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی کو ٹیلیگرام میں کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کا وعدہ کیا تھا اور بعد میں بھارتی وفد نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کا وعدہ کیا تھا اور آج تک وہ قرار دادیں عمل درآمد کی منتظر ہیں' اور اس تمام عرصے میں کشمیریوں کو حق خود ارادیت سے محروم رکھ کے بھارت نے خود اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور ایک لاکھ سے زائد شہداء اور ہزاروں بیٹیوں کی عصمت وعفت کی قربانی اور وقت نے کشمیر کا فیصلہ سنا دیا ہے کہ ریاست کشمیر کے باسی بھارت کے ساتھ رہنے کیلئے قطعاً تیار نہیں۔ اگر بھارت کو اپنی کامیابی کا ایک فیصد بھی یقین ہوتا تو اب تک وہ اس عمل سے گزر چکا ہوتا۔ کشمیریوں کی ثابت قدمی اور بے پناہ قربانیوں کے سامنے اس نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایسے حیلے بہانے ڈھونڈ رہا ہے کہ کس طرح کشمیریوں کی تعداد کو کم دکھا کر عالمی فورم کے دباؤ کو کم کیا جا سکے۔

کیا دنیا کو اتنا بڑا دھوکہ دینے میں وہ کامیاب ہو سکیں گے کہ ہندوستان میں تو پچھلے پچاس سالوں میں مسلمانوں کی آبادی 20٪ سے زائد بڑھ جائے اور کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی جائے۔ جموں' کٹھوعہ اور اس کے گردونوح میں غیر ریاستی باشندوں کو غیر قانونی طور پر آباد کرنے کی مکروہ سازش اسی بنیاد پر کی گئی ہے کہ تناسب میں تبدیلی لائی جا سکے جو کہ عالمی قوانین کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے۔ کشمیر کے مرد حر سید علی گیلانی نے بروقت کشمیری قوم اور ساری دنیا کو اس سازش سے خبر دار کیا ہے کہ " حکومت مردم شماری کی مہم کے تحت نہ صرف یہاں تعینات فوج اور فورسز کی گنتی کر رہی ہے بلکہ ان بھکاریوں کی بھی گنتی کی جا رہی ہے جو پچھلے چھ مہینوں سے مقیم ہیں۔"مزید اس حکومتی خطرناک چال سے آگاہ کرتے ہوئے جناب سید علی گیلانی نے بالکل صحیح فرمایا"دراصل ایک منظم سازش کے تحت بھارت کی ہندو شدت پسند تنظیموں کے ان عزائم کو پورا کرنے کی کوشش کی جا جموں وکشمیر کے مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنا ہے۔" رہی ہے جن کا مقصد

تاریخ کا یہ عبرتناک عمل ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ کشمیریوں نے اپنے ایک لاکھ شہداء سے زائد کی قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر روس اور امریکا اپنی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر عراقیوں اور افغانیوں کو نہ دبا سکے تو بھارت تو ان سے زیادہ طاقت ور نہیں ہے۔ مجھ سے ایک امریکی صحافی نے سوال کیا کہ " آخر نہتے کشمیری اور کتنی دیر لڑتے رہیں گے ؟""بہتر ہوتا اگر تم یہ سوال بھارتی حکومت سے کرتے کہ وہ کتنی دیر اور کشمیریوں سے لڑنے کی ہمت رکھتے ہیں!"میرے دل سے اٹھنے والی یہ آواز شائد کشمیریوں کے ترجمانی کر سکی یا نہیں لیکن اس امریکی صحافی نے فوری اس بات کا اعتراف کیا کہ مظلوم کی طاقت کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکا'یہی تاریخ کا عبرتناک سبق ہے جو بالآخر ان ظالموں کا مقدر بنے گا۔"

مجھے چند دن پہلے ایک کشمیری نوجوان کی ایک طویل ای میل موصول ہوئی'اس نے اپنے طویل پیغام میں یہ تین سوال بھی پوچھے ہیں!
1۔ بھارت دنیا کے کئی پلیٹ فارم پر سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن اس نے آج تک کسی آزاد پریس میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کو کشمیر کی حالتِ زار دیکھنے اور ان کی آزادانہ رائے کو دنیا کے سامنے لانے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟

2۔اگر چند لمحوں کیلئے(صرف سمجھانے کیلئے)فرض کرلیاجائے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے تو بھارت کے آئین کی کون سی شق اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کے ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو بے رحمی سے قتل کردے؟

3۔اگر بھارتی سیکورٹی فورسز کے افرادرات کی تاریکی میں حکومتی اندھی طاقت اور اسلحے کے زور پر ایک گھر میں داخل ہو کر ایک بوڑھی عورت سے لیکر ایک دس سالہ بچی کی عصمت دری کردے اور گھر کے تمام افراد کو گولیوں سے بھون کر اپنے جرم کو چھپانے کیلئے اس گھر کو نذرِ آتش کردے' بعد ازاں اس بدنصیب گھر کا ایک زخمی بچ جائے اور انصاف نہ ملنے کی صورت میں وہ خود انتقام لینے کیلئے کوئی کوشش کرے تو اسے آپ دہشتگرد کہیں گے؟

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ۔"آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں'مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہونگے"۔

رہے نام میرے رب کا جو چالوں کو خوب سمجھتا ہے!

بروز اتوار 9 جمادی الثانی 1431ھ 23 مئی 2010ء

خونِ شہداء کی شفق رنگی

علامہ اقبال کی دو نظموں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کو پورے برصغیر کے مسلمانوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور یہ نظمیں تقریباً ایک صدی قبل کہی گئیں تھیں اور ان کی معنویت ایسی ہمہ جہت ہے کہ مسلمانوں پر ابتلاء اور آزمائش کے ہر دور میں وہ مایوسی کی کیفیت پر غلبہ پانے میں مددگار بن جاتی ہے۔ موجودہ صورتحال میں جو عراق اور افغانستان پر امریکی جارحیت سے پیدا ہوئی ہے "جوابِ شکوہ" کے دو بند قابل غور ہیں۔

عہدِ نو برق ہے 'غارتگر ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملت ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل برانداز ہے خوں شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امریکا نے جس فرعونی تکبر کے ساتھ جارحیت کی ہے اور جس بیدردی سے انسانی حقوق پامال کئے ہیں اور جس جابرانہ تمکنت کے ساتھ اقوامِ متحدہ کو رسوا کیا ہے 'اس کے اسی رویے نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پوری دنیا میں اس جارحیت کی جس طرح مذمت کی گئی ہے اس کی کوئی دوسری نظیر تاریخ میں آسانی سے نہیں مل سکے گی۔ امریکا کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ساری دنیا کے انسانوں کی غالب اکثریت کو اس طرح امریکا کا مخالف نہیں بنا سکتا تھا جس طرح صہیونی قوتوں کے ایماء پر امریکی جارحانہ عمل نے بنا دیا ہے۔ خود مسلمان ملکوں میں بڑے پیمانے پر اتنے طویل عرصے تک امریکا کے خلاف اتنے مظاہرے نہیں ہوئے ہیں جس طرح ان ملکوں میں ہوئے ہیں جہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے اور اس حقیقت سے یہ بات واضح ہے 'عالمگیر سطح پر انسانی ضمیر کی بیداری کا یہ دور نسلی علاقائی اور مذہبی تعصبات سے آزاد ہو رہا ہے اور اعلیٰ انسانی قدروں کا شعور انسانوں کی فکر و نظر کو روشن :کرتا چلا جا رہا ہے۔ تعصب کسی بھی نوعیت کا ہو وہ انسان کو انسان کا دشمن بنا دیتا ہے بقول اقبال

شجر ہے فرقہ آرائی 'تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے جو جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

اور اس وقت عراق و افغانستان میں امریکی جارحیت و مظالم اور کشمیر میں بھارتی افواج کے بے بناہ ظلم و ستم کے خلاف جو بھرپور احتجاج ہو رہا ہے وہ انسانوں کے مابین ان رشتوں کی بیداری کی ایک بڑی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان رشتے دو ہی ہیں 'انسانی رشتہ اور ایمانی رشتہ ' اور انسانی رشتے کو فوقیت اس لئے حاصل ہے کہ ایمانی رشتہ بھی انسانوں ہی کے درمیان قائم ہوتا ہے اور اس لئے قائم ہوتا ہے کہ اس سے اعلیٰ انسانی قدروں کا شعور پیدا ہوتا ہے اور پھر مستحکم ہوتا ہے۔ ہمارے ہادیٔ برحق ختم الرسل ﷺ کا خطبہ حجتہ الوداع اس کی سب سے محکم دلیل اور سب سے روشن مثال ہے۔ نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں ہمارے رسولِ کریم ﷺ نے "یاایھاالناس" فرما کر پہلی مرتبہ ساری نسل انسانی کو مخاطب فرمایا:

"اے گروہِ انسانی! تمہارا رب ایک ہے 'تمہارا باپ ایک ہے 'عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر 'گورے کو کالے اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر تقویٰ (یعنی اعلیٰ کردار) کے سبب سے"۔ یہ اعلان انسانی تاریخ کا سب سے اہم اعلان ہے۔ انسانوں کی حریت کا اور انسانوں میں مساوات کا اعلان ۔ غور کیجئے کہ رسول کریم ﷺ جن لوگوں سے مخاطب تھے وہ سب اہل ایمان تھے 'ان تمام اہل ایمان نے حج کے فریضے کی ادائیگی کی تھی 'وہ بڑا متبرک اجتماع تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی حیات مقدس میں وہ اہل ایمان کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ وہ عظیم الشان تعداد بجائے خود فریضہ نبوت کی تاریخ ساز ادائیگی کا سب سے بڑا ثبوت بھی تھی اور ہمارے حضور ﷺ کیلئے بلاشبہ طمانیت قلبی کا باعث بھی تھی لیکن حضور ﷺ نے اہل ایمان کے اس اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے بھی اس مقدس اعلان کو صرف اہل ایمان سے خطاب تک محدود نہیں فرمایا بلکہ "یاایھاالناس" فرما کر اخطاب کو ساری نسل انسانی تک اس مقدس کی معنی آفرینی کے سائے کو پھیلا دیا کیونکہ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو یہاں موجود ہیں وہ اس مقدس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں نہیں ہیں چنانچہ نسل انسانی کی حریت اور مساوات کا وہ پیغام چودہ سو برس سے اقصائے عالم میں گونج رہا ہے۔

امریکا اس وقت دنیا کی واحد سب سے زیادہ تباہ کن وسائل رکھنے والی طاقت بن گیا ہے۔ اس کیفیت کو برداشت کرنے کیلئے قومی سطح پر مثالی اعلیٰ ظرفی کے اظہار کی ضرورت ہے لیکن مثالی تو لگ وہاں تو معمولی اعلیٰ ظرفی کی توقعات بھی پوری نہیں ہو سکیں بلکہ یہ بات تو امریکی اقتدار کے نمائندہ حضرات بالکل بھول گئے اور امریکا کو واحد عالمی طاقت کی حیثیت سے نمایاں ہونے میں کلیدی کردار ایک مسلمان ملک یعنی پاکستان ہی نے ادا کیا ہے اور جب سوویت یونین کی فوجیں افغانستان سے واپس گئیں تو پاکستان نے گویا اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھ کر مسرت کا اظہار کیا تھا اور اسے کفر و اسلام کی جنگ قرار دیکر گویا اسلام کی فتح کی علامت سمجھا گیا تھا۔

راقم الحروف بھی جذباتی حوالے سے اظہارِ مسرت کرنے والوں میں شامل تھا (میں آج بھی روسی جارحیت کے خلاف پاکستان کے

کردار کو بالکل درست اور دلی طور پر سراہتا ہوں) لیکن غور کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ جذبات کے غلبے سے بچا جائے اور تدبر سے کام لیا جائے چنانچہ چند برسوں ہی میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ امریکا کا تنہا عالمی طاقت بن جانا پاکستان کیلئے نفع سے زیادہ خسارے کا سودہ ثابت ہوا ہے لیکن یہ تو بات سے بات نکل آئی' اصل بات ہو رہی تھی کہ امریکا کی عراق اور افغانستان کے خلاف بالکل بلاجواز جارحیت کی' اور یہ کہ اس جارحیت نے عالمی ضمیر کو بیدار کیا ہے اور امریکا اپنی ساری مادی طاقت اور اس تکبر کی بناء پر تنہا ہو گیا ہے اور ساری دنیا میں بلا تفریق مذہب و ملت امریکا کی مخالفت میں جس طرح مظاہرے ہوئے ہیں وہ اظہار ہے عالمی سطح پر نسل انسانی میں نمایاں ہوتے ہوئے انسانی شعور کا اور یہ کہ اس کی بیداری کی بنیاد ہمارے ہادیٔ برحق رسول اکرم ﷺ کا خطبہ حجتہ الوداع ہے اور گزشتہ سوا چودہ سو برسوں میں اس مقدس خطبے کے الفاظ کی تاثیر انسانوں کے درمیان اخوت کے شعور کی صورت نمایاں ہوئی ہے اور اس کا بہت مؤثر اظہار امریکا کے عراق اور افغانستان کے خلاف مظاہروں سے

ہوا ہے اور اسی دباؤ کی بناء پر امریکا میں نئی حکومت وجود میں آئی جس نے اپنی قوم سے برملا ان تمام اغلاط کو دور کرنے کا وعدہ کیا اور رہ گئی یہ بات کہ اس پورے المیے میں مسلمانوں کا کیا کردار رہا ہے تو علامہ اقبال کے جوابِ شکوہ کے دو بند اسی حوالے سے پیش کئے گئے ہیں۔

جب اقبال نے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" لکھا تھا اس وقت بھی دنیا میں مسلمان بڑی آزمائش میں گھرے ہوئے تھے اور اب ایک صدی کے بعد اور بہت سی ہمت افزاء مثبت تبدیلیوں کے باوجود وہ مرحلہ ایک بار پھر آ گیا ہے جس کی وجہ سے ہم پر اس مصرعے کا بھرپور اطلاق ایک بار پھر ہو گیا ہے کہ :"ملت ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے" اور اس آگ سے تحفظ کا وسیلہ بھی وہی ہے جو پہلے تھا یعنی یہ کہ

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ایمان کی توانائی سب سے محکم اور سب سے معتبر توانائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے۔ ایمان کی توانائی اشیاء کی خاصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ "اے آگ تو ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کیلئے سلامتی کا باث بن جا۔" ایمان کی توانائی کم تعداد کو کم سازوسامان کے ساتھ بڑی تعداد اور بڑے سازو سامان اور لاؤلشکر پر غالب کر دیتی ہے' سورۃ انفال میں فرمایا گیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَى ٱلْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَـٰبِرُونَ يَغْلِبُوا۟ مِاْئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّاْئَةٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ٱلْـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّاْئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا۟ مِاْئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ

"اے نبی ﷺ مومنوں کو جنگ پر ابھارو' اگر تم میں بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار پر غالب آ جائیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے' اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا' اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے' پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے' اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

پھر سورۃ آل عمران میں فرمایا گیاہے: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ

"دل شکستہ نہ ہو'غم نہ کرو'تم ہی بالآخر غالب آؤ گے اگر تم مومن ہو'اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے'یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں'تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور تم میں سے ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔"اب ان پیمانوں پر ہم خود اپنے اجتماعی اعمال کا محاسبہ کر سکتے ہیں۔

مسلمان ملکوں میں اس وقت جتنی تعداد ہے'تاریخ میں اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد کبھی نہیں تھی۔ مسلمان ملکوں کو اللہ تعالیٰ نے بر سرِ زمین جن بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے وہ بے حد و حساب ہے۔ تعداد کے حساب سے بھی مسلمان بہت زیادہ ہیں اور دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں'مسلمان ملکوں کو اللہ تعالیٰ نے بہترین افرادی قوت سے نوازا ہے اور ہمارے درمیان بہت اچھے افراد بھی ہیں لیکن ہماری اجتماعی زندگی مسلمان ملکوں میں معاشرتی زندگی مختلف پہلوؤں سے واضح انداز میں اللہ کے احکامات سے انحراف میں بسر ہو رہی ہے۔ ہمیں "خیرِ امت" کا لقب دیا گیا ہے'ہمیں "امتِ وسط" کی ذمہ داری عطا کی گئی ہے لیکن ہماری زندگی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی سے عاری ہے اور ہم اس وقت جس ذلت و رسوائی کا شکار بنے ہیں وہ خود اپنی بداعمالیوں کی بدولت بنے ہیں۔ اس کے باوجود اللہ کی رحمت سے مایوسی کسی حالت میں نہیں ہونی چاہئے اور وہ جو دوسرا بند پیش کیا گیا'اسی امید کی روشنی دکھاتا ہے۔

"دیکھ کر رنگِ چمن ہو پریشاں مالی"حساس قلب و نظر والے مایوس نہ ہوں۔"کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی"یہی سوکھی ہوئی ڈالیاں بہت جلد شاداب اور خوش رنگ پھولوں سے نکھرنے والی ہیں"خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی"ہمارا یہ گلشن ملت ہماری ہی خود غرضیوں'مفاد پرستیوں اور فرقہ بندیوں کے خس و خاشاک سے پاک ہونے والا ہے اور اس یقین کی بنیاد یہ ہے کہ "گل برانداز ہے خونِ شہداء کی لالی"وہ بے شمار بے گناہ جو جبر و ظلم کا شکار ہوئے ہیں ان کے خون کی حدت ہماری بے حسی کی تاریک رات کو احساسِ غیرت کی صبح صادق میں بدلتی جا رہی ہے۔ ان شہداء کے خون کی شفق رنگی ہی علامت ہے کہ ہمارے عالمگیر ملی شعور کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ مسلمان ہونا بہت بڑی ذمہ داری ہے'ایمان کا اعلان ہمارا ذاتی معاملہ نہیں'اللہ تعالیٰ کے حضور ایک بھرپور سماجی ذمہ داری کا عہد نامہ ہے۔ یہ ساری آزمائش اسی عہد نامے کی یاددہانی کیلئے ہیں۔
یہ آزمائشیں احساسِ ندامت پیدا کر رہی ہیں۔

سر چشم اشک مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

یہ آزمائش ہمیں زرِ خالص بننے میں مدد کریں گی'اسی طرح سونا آگ میں تپ کر زرِ خالص بن جاتا ہے!

بروز منگل 11 جمادی الثانی 1431ھ 25 مئی 2010ء

تاریخ کا عبرتناک سبق

پاکستان میں میڈیا کی آزادی نے جہاں قوم کے تعمیری کام میں ایک قابلِ ذکر کام کیا ہے وہاں اسی میڈیا کی آڑ میں ایسے لبرل فاشسٹ عناصر کی سرگرمیوں کو بھی عروج حاصل ہو رہا ہے جو مختلف حیلوں بہانوں سے ہماری نوجوان نسل کے زرخیز ذہنوں کو تشکیک کے اندھیروں میں گم کرنے کے ایجنڈے پر عمل کر رہے ہیں' اور یہ عمل اس وقت اور بھی تشویشناک ہو جاتا ہے جب حق پرستوں کی صفوں میں منافقین شامل ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ایسے افراد سب سے پہلے تعلیمی اداروں اور میڈیا کے اندر اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے ہیں۔ ایک طرف یہ مسلمانوں کی تعلیم میں ایسے موضوعات اور نکات کو زیرِ بحث لاتے ہیں جہاں ان کے اکابرین کے بارے میں شکوک و شبہات کے ساتھ تضحیک کا عنصر واضح ہو اور دوسری طرف میڈیا کی وساطت سے خاموش اکثریت کو متاثر کرنے کی ناپاک کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

اسپین کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں جہاں مسلمانوں نے ساڑھے آٹھ سو سال حکمرانی کی' اس طویل شاندار حکمرانی کے بعد آج وہاں یہ حالت ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا۔ ایسے شاندار ماضی کا یہ عبرتناک حال کیونکر ہوا؟ اسپین و قرطبہ کی تعلیمی درسگاہوں میں بھی ایسے ہی لبرل فاشسٹ عناصر اساتذہ کی شکل میں پچھلے سے داخل ہوئے' تعلیمی درسگاہوں میں دھیرے دھیرے مسلمانوں کی اقدار پر حملہ آور ہوئے' حکمرانوں تک نہ صرف رسائی حاصل کی بلکہ دربار میں بااثر عہدوں پر بھی مشیر کے طور پر رسائی حاصل کی۔ انہی افراد نے طاؤس و رباب اور عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے حکمرانوں کو دینی اقدار سے دور اور فرسودہ قرار دیتے ہوئے "لبرل یعنی روشن خیال" ماحول کا مبلغ بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب قرطبہ' اسبیلہ اور غرناطہ کے گرد دشمن کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا تو یہاں کے حکمراں اور دانشور عوام کو دشمن کی طاقت سے خوفزدہ کر رہے تھے اور اچھے تعلقات استوار کرنے' معاہدات کی نوید سنا کر ان کا دل بہلا رہے تھے اور دانشور طبقہ اپنے قومی ہیروز اور مشاہیر کے کارناموں کی بجائے دشمنوں کی عقل و فراست کے بارے میں عوام کو گمراہ کر رہا تھا۔ روشن خیال خوشامدی چیلے اپنی اس بے غیرتی پر جشن منا رہے تھے' پھر چشمِ فلک نے اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ ہتھیار پھینکنے پڑے' خشیتِ الٰہی پر دنیاوی طاقت کا خوف غالب آ گیا' مادی وسائل پر جب بھروسہ کیا جائے گا تو شکست جیسی رسوائی کا ضرور سامنا کرنا پڑے گا' تب طاؤس و رباب میں مگن ان مسلمانوں پر دشمن کی طرف سے خوفناک حملہ کیا گیا اور جہاں کئی صدیوں تک مسلمانوں نے حکمرانی کی وہاں ان کا نام و نشاں مٹا دیا گیا۔

یونانی تاریخ کا ایک واقعہ شدت سے یاد آتا ہے جب یونان میں بادشاہت کا دور دورہ تھا اور شاہ کی عوام کش پالیسیوں سے تنگ آ کر عوام نے بغاوت کا علم بلند کر دیا اور ایوان کی طرف چل پڑے۔ قبل اس کے عوام کا یہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر سب کچھ بہا لیجاتا' اس دوران وزیر اعظم نے ساری صورتحال بادشاہ کے گوش گزار کر دی جس پر بادشاہ نے کہا کہ بغاوت ہمارے ایوان تک آنے سے روکنے کیلئے لشکر کشی کی جائے نہ طاقت کا استعمال بلکہ ہر طرف کھیل تماشے شروع کر دیئے جائیں۔ اس وقت یونان میں خاص قسم کے کھیلوں کا چرچا تھا جن کا دورانیہ کئی ماہ جاری رہتا۔ کھیل یہ تھا کہ قیدیوں کو کھلے

میدان میں لایا جاتا اور بھوکے خونخوار جانور چھوڑ دیئے جاتے۔ دونوں کے درمیان اس وقت تک مقابلہ ہوتا جب تک کوئی ایک کو چیر پھاڑ نہ دیتا۔ پھر قیدی ختم ہو جاتے تو جانوروں کا جانوروں سے مقابلہ ہوتا۔ ادھر ان کھیلوں کا مقابلہ ہوا' ادھر بغاوت کیلئے امڈ آنے والا یہ سیلاب اپنے اصل اہداف کو چھوڑ کر کھیل میں مگن ہو گیا۔

آج ہمارے ملک میں ظالمانہ پالیسی کی بدولت جو صورتحال ہے وہ انتہائی خطرناک شکل اختیار کر چکی ہے۔ نظامِ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں جہاں حکومت کی مہربانیوں کے سبب عوام کیلئے مسائل کے انبار نہ لگے ہوں۔ ملک کی جغرافیائی سرحدیں ہوں یا نظریاتی' دونوں ہی خطروں کی زد میں ہیں۔ باطل پرستوں کو مملکتِ خداداد میں ایسے مہرے ہاتھ لگے ہیں جو اسلام کی بنیادوں پر حملے کرنے لگے ہیں۔ نظریاتی سرحدوں کو روشن خیالی منہدم و مدغم کر رہی ہے۔ شعبہ تعلیم مکمل طور پر باطل قوتوں کو دے دیا گیا ہے اور ان کی پشتیبانی کیلئے ٹیلیویژن چینل کے چند اینکر سرگرم رہتے ہیں جو گاہے بگاہے اسی خاص مائنڈ سیٹ کے افراد کو اپنے پروگراموں میں علمی ابکائیوں کا موقع فراہم کرتے رہتے ہیں۔ معیشت کی بربادی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے' مہنگائی اور بے روزگاری کا عفریت ہر روز کئی معصوم جانوں کو ہڑپ کر جاتا ہے' دوسری طرف کھیل تفریح کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے۔ کبھی بسنت' ہولی' ویلنٹائن ڈے کے رنگوں کو دلوں کو "موہ" لینے کا سلسلہ ہے تو کہیں میوزیکل نائٹ' شاعروں اور شامِ غزل کے ذریعے وقت برباد کیا جا رہا ہے۔

ایسے میں کون ہے جو سرحدوں پر جلتی بھڑکتی آگ پر دھیان دے' آئے دن کے بم دھماکوں نے ملک کے اندر ایک خوف کی فضاء پیدا کر رکھی ہے جس کی بناء پر ہماری معیشت' صنعت و حرفت کا دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے۔ کسے بگلیہار ڈیم کی تعمیر پر توجہ دلائی جائے کہ بھارت ہمارے دریاؤں کا پانی بند کر کے ارضِ پاکستان کو صحرا بنانے کی ناپاک کوشش میں مصروف ہے اور ہم اس سے دوستی کی پینگیں بڑھانے میں مرتے جا رہے ہیں۔

کشمیر' فلسطین' افغانستان اور عراق میں ڈھائے جانے والے مظالم کیونکر اپنی جانب متوجہ کر سکتے ہیں۔ ہلیری کلنٹن کے اشتعال انگیز بیانات' پینٹا گون اور قصرِ سفید کے الزامات' بیت المقدس و دیگر مقدس مقامات کی طرف بڑھتے ہوئے دشمن کے ناپاک قدم' کشمیریوں اور گوانتاناموبے کے مظلوم مسلمانوں کی صدائیں' ماؤں بہنوں کی چیخیں و سسکیاں طاؤس و رباب کے شور کے نعروں میں کیسے سنائی دے سکتی ہیں۔

تاریخ میں پڑھا ہے کہ مسلمانوں سے ان کی شناخت ختم کرنے کیلئے بڑے اوچھے ہتھکنڈے اختیار کئے گئے۔ پچاس ہزار سکوں کے عوض مذہب کی اماں دے دی جاتی' کلیسا اور گرجے کی حاضری پر مجبور کیا جاتا' اس دور میں میڈیا تھانہ کرکٹ میچ' نہ ہی ہمارے دانش مند حکمرانوں جیسے حکمراں اور نہ ہی

ہمارے ٹی وی پر دہائی دینے والے آجکل کے لبرل دانشور! ورنہ یقیناً اتنی کاوشوں کی ضرورت نہ پڑتی۔

ایسے میں جب کوئی زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ان سے خوشی دیکھی نہیں جاتی۔ ہم دجالی تہذیب کے دور میں داخل ہو چکے ہیں ۔اپنے دین وایمان کی حفاظت کیلئے ہمیں خود ہی کوششیں کرنا ہونگی اور وہ خوبیاں اپنانی ہونگی جن کی بدولت ہمارے اسلاف نے شاندار مثالیں قائم کیں ورنہ غفلت کا یہ عالم خدانخوستہ ہمیں بھی تاریخ کا عبرتناک سبق نہ بنادے۔

رہے نام میرے رب کا جو الحیی القیوم ہے!

بروز جمعرات 13 جمادی الثانی 1431ھ 27 مئی 2010ء

رہے نام اللہ کا

تھوڑی سی مٹی' تھوڑا سا پانی
بس اتنی کہانی؟
چھوٹا سا بچپن' لمبا بڑھاپا' کچھ کچھ جوانی
بس اتنی کہانی؟
نہ عہدہ نہ منصب نہ فرمان نہ کاغذ' بس اک روزِ محشر ہے سب کچھ زبانی
بس اتنی کہانی؟
نہ کوٹھی نہ کوٹھا' نہ پت جھڑ نہ برکھا' نہ جنت مکانی نہ خلد آشیانی
بس اتنی کہانی؟
یہ سب کچھ ہے فانی
بس اتنی کہانی! بس اتنی کہانی!!

مٹی کی چلتی پھرتی ڈھیریاں ممٹیوں یا مسندوں پر جا بیٹھیں تو سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ اپنی اصل اوقات' اپنا آغاز اور اپنا انجام تک بھول جاتی ہیں۔

موت کی ہچکی کو ذرا غور سے سن
زندگی بھر کا خلاصہ اسی آواز میں ہے

ایک اور دانشور کا کہنا ہے:

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

لیکن سنتا کون ہے اور سن بھی لے تو سمجھتا کب ہے؟
جس نے زندگی بہتر گزارنی ہو اس کیلئے ضروری ہے کہ موت کو یاد رکھے اور جس مقتدر نے اپنا عرصہ اقتدار بہتر گزارنا ہو تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ وقت بھی دھیان میں رکھے جب وہ اقتدار سے باہر ہو گا یا زندگی کے مدار سے باہر ہو گا۔

سامنے کی بات ہے کہ کل تک جس کی مرضی کے خلاف حسین دھرتی کے اس حصے یعنی پاکستان میں پتہ تک نہ ہلتا تھا' آج اس دھرتی پر پہ قدم رکھنے کو ترس رہا ہے۔ کل تک جس کے بیانوں اور تصویروں کے بغیر ہر اخبار ادھورا تھا اور ہر خبر نامہ نامکمل تھا..... آج قصہ پارینہ چہرے اور نام بھی

بھول چکے۔ اگر یاد ہے تو صرف اس لئے کہ اس کو واپس اس کے انجام تک پہنچانے کیلئے بلاؤ جو ہر وقت قوم کو مکے دکھا کر ڈرانے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا' جو بڑے تکبر کے ساتھ اعلان کرتا تھا کہ تم کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میری طرف سے بھیجی ہوئی اجل تمہارا قصہ تمام کر دے گی۔

لیکن رعونت 'تکبر' خود پسندی اور نرگسیت کا بازار آج بھی ویسے ہی گرم ہے۔ ایکٹر بدل گئے' کردار نہیں بدلے' جیسے دیو داس کا کردار کبھی کے ایل سہگل نے ادا کیا' پھر دلیپ کمار نے اسے امر کر دیا اور 2002ء میں شاہ رخ نے دیو داس بن کر دھوم مچادی' اسی طرح تکبر اور رعونت کا کردار بھی قائم رہتا ہے' صرف اداکاروں کے نام و چہرے تبدیل ہوتے ہیں۔

جنہیں اپنے اگلے پل اور کل کا اعتبار نہیں' مستقبل کی صورت گری میں مشغول ہیں' مٹی کے پتلے خاکے بنا رہے ہیں' پانی کے بلبلے مستقبل کی تصویروں میں اپنی پسند کے رنگ بھر رہے ہیں۔

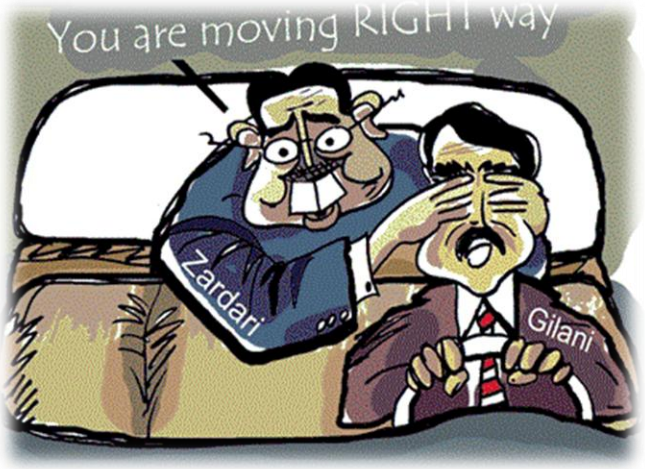

ہائے..... کوئی انہیں بتائے کہ بابِ علم حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا تھا۔ بے شک میں نے اپنے ربّ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا"۔

ڈرتے رہنا چاہئے' بڑے بول سے بچتے رہنا چاہئے۔

انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟

ہم تو اپنی کمر کا تل نہیں دیکھ سکتے۔

داڑھ کا درد باؤلا کر دیتا ہے۔

سر کے بال اپنے بس میں نہیں۔

پانی کی ایک بوند سانس کی نالی میں جا گھسے اور چند لمحوں کیلئے دماغ کو آکسیجن معطل ہو جائے تو دماغ کے ساتھ جسم کا ایک حصہ بھی جواب دے جاتا ہے اور کڑیل سے کڑیل جوان بھی ابلی ہوئی سبزی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

معمولی سی چوٹ یادداشت سے محروم کر سکتی ہے۔

نیند روٹھ جائے تو انسان خودکشی کا سوچنے لگ جاتا ہے۔

انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟

ڈیانا کا حسن' اوناسس کی دولت' کینیڈی و ریگن کی طاقت' آریا مہر کی نخوت' مدر ٹریسا کی شفقت' آئن اسٹائن کی ذہانت' نپولین کی شجاعت' رسل کی فراست' مائیکل جیکسن کی شہرت؟؟؟

کیازمانہ آگیاہے کہ خود کو اونچے منصب پر بیٹھا دیکھ کر انسان تقدیر کے مالک ہونے کا دعویٰ شروع کر دیتا ہے کہ "ہم جس کا چاہیں بادشاہ بنائیں اور جس کو چاہیں فقیر" اور سننے والے غرض مند خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں۔ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کیلئے ایک سید زادہ کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے حضرت صدر محترم دونوں عہدے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں حالانکہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ ابھی اس معاملے کی تشریح عدالتِ عالیہ کے ذمے ہے لیکن عدالتِ عالیہ کی تضحیک تو گویا اب ان کا نصب العین ٹھہرا ہے۔ عدالت شیخ ریاض کو قومی دولت لوٹنے کے جرم میں جیل بھیجتی ہے تو اس کی رہائی کیلئے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تمام قیدیوں کو اس لئے مراعات کا حکم صادر ہو جاتا ہے کہ اپنے دوست شیخ ریاض بھی جیل کی سلاخوں سے واپس آجائے جس کو چند دن پہلے مراعات دیکر نہ صرف پرانے عہدے پر بحال کیا گیا تھا بلکہ قانون و قاعدہ کی پرواہ کئے بغیر ترقی کی منزلت سے نوازا گیا تھا اور ایک دفعہ پھر عدالت عالیہ وزیرِ داخلہ رحمان ملک کی ضمانت منسوخ کرنے کا حکم جاری کرتی ہے تو ایوانِ صدر سے ان کی ساری سزا معاف کرنے کا حکم صادر ہو جاتا ہے۔

ملک کے وزیرِ دفاع احمد مختار دھیمے سروں میں اپنا پیغام جاری فرماتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود ہی اپنے صدر کے خلاف سوئس عدالتوں کو بد عنوانی کے مقدمات دوبارہ کھولنے کیلئے سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق خط تحریر کریں' گویا وہ بادیٔ النظر میں یہ پیغام اس لئے جاری کر رہے ہیں کہ مدت ملازمت میں اگر "ایکسٹینشن" کی ضرورت ہے تو "اِس ہاتھ لے 'اُس ہاتھ دے" کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔ اس تمام کاروائی کے بعد اس بات کی بھی دہائی دی جاتی ہے کہ تمام ادارے اپنے اپنے دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے کام کریں تاکہ قومی اداروں میں تصادم نہ ہو!

ہونی تو ہو کر رہتی ہے' یہ بھی تاریخ کا انتہائی کڑوا سچ ہے۔ "ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد" کیلئے راستہ اسی طرح ہموار ہوتا ہے اور "وہ جو شہید ہونے کی آرزو" کا برملا اعلان کرتے ہیں تاریخ کبھی کبھی ناتمام آرزوؤں کے ساتھ بھی ان کو اپنا حصہ بنالیتی ہے کہ لوگ عبرت حاصل کر سکیں۔

جو بھی ہوں اور جیسے بھی ہوتے ہیں
بالآخر سب قبروں میں جا سوتے ہیں

رہے نام میرے رب کا جس کو فنا نہیں!

بروز ہفتہ 15 جمادی الثانی 1431ھ 29 مئی 2010ء

آواز دے کہاں ہے؟

خبر پڑھ کر کوئی تعجب تو نہیں ہوا لیکن میں گہری سوچ میں اتر گیا دکھ کا احساس بڑھ رہا تھا یوں لگا جیسے میرے گھر کی باتیں لوگ چوراہے پر بیٹھ کر کر رہے ہیں۔ گھر اور اس کے اندر کی باتیں کتنی ذاتی ہوتی ہیں۔ ہم کبھی بھی یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی ہمارے گھریلو معاملات کو زیر بحث لائے۔ اب تو یہ عام ہو ہو گیا ہے کہ جب مغربی میڈیا بالعموم اور امریکی میڈیا بالخصوص بڑے وثوق کے ساتھ پاکستان کے کی سلامتی کے بارے میں یہ خبر جاری کرتا ہے کہ خدانخواستہ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے اور کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے اور دنیا کے امن کی خاطر ہمیں اس کے جوہری ہتھیاروں کی حفاظت کیلئے خود آگے بڑھ کر کوئی راست قدم اٹھانے کی اشد ضرورت ہے کبھی ان خدشات کا اظہار بڑے تواتر کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے جوہری ہتھیار کسی بھی وقت دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں جو دنیا میں تباہی کا موجب بن سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سب سے پہلے فریڈرک ڈبلیو کیگان اور مائیکل او ہینلون نے نیویارک ٹائمز 18 نومبر 2007ء میں اپنے آرٹیکل (OP-ED CONTRIBUTORS; Pakistan's Collapse, Our Problem) میں امریکی انتظامیہ پر زور دیا ہے کہ ایٹمی پاکستان میں (خدانخواستہ) اگر صورتِ حال مکمل طور پر قابو سے باہر ہوئی تو اس میں آپریشن کرنا آسان نہیں ہو گا۔ مرحلہ وار مسائل کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی لکھا کہ تباہ شدہ پاکستان (ان دشمنوں کے منہ میں خاک) کو مستحکم کرنا امریکا اور اس کے اتحادیوں کے دائرہ کار سے باہر ہو گا کیونکہ اس حجم کے ملک کے لئے 10 لاکھ فوجیوں کی ضرورت ہو گی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اس لئے منصوبے کے مطابق سب سے پہلے پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں اور مواد کو غلط ہاتھوں میں جانے سے بچانا ہو گا۔

پاکستان کی قوت کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حالات فوری طور پر خراب نہیں ہوں گے اور اس دوران امریکا اور مغربی طاقتوں کو وسائل اکٹھے کرنے اور دنیا کے دوسرے کونے میں پہنچنے کا وقت مل جائے گا۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق جب علاقے میں عالمی فوجیں اکٹھی ہو جائیں گی تو اسلام آباد (اسلام کا قلعہ) اور اس کے نواحی علاقوں کے علاوہ پنجاب کے کنٹرول کے لئے پاکستانی سیکورٹی فورسز کی مدد کی جائے اور اگر کسی علاقے میں شر پسندوں کے ہاتھوں ایٹمی ہتھیار لگ جائیں تو وہ علاقہ اور اثاثے ان سے واپس لینے کے لئے آپریشن کیا جائے۔ پاکستان کے مرکز پر قابو پانے کے بعد ان علاقوں کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے کام کرنا چاہئے۔ جہاں شر پسند آپریشن کر رہے ہوں۔ اس سے افغانستان میں جانے والی امریکی کوششوں کو بھی مدد ملے گی ۔ "گویا شطرنج کی بساط سامنے ہے ہر چال سوچ لی گئی ہے۔ ہر مہرہ اپنے اپنے مقام پر پٹنے کے لئے بس فقط باری کا منتظر ہے۔ کب کہاں کیسے کس کا سر کچلنا ہے' یہ سب طے کیا جاچکا ہے۔

دوسری چونکا دینے والی خبر پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کا وہ انٹرویو "دی موسٹ ڈیفیکلٹ جاب ان دی ورلڈ" جو انہوں نے " وال سٹریٹ جنرل " کے مشہور تجزیہ نگار دوسری چونکا دینے والی خبر پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کا وہ انٹرویو "بریٹ سٹیفن" کو 4/اکتوبر 2008ء کو

دیا تھا جس میں انہوں نے مغربی دنیا کو 100 بلین ڈالر کے عوض بادی النظر میں پاکستان کی جوہری طاقت سے دستبردار ہونے کا عندیہ دیا تھا۔ اخبار کے تجزی نگار نے امریکا کو یہ آفر فوری قبول کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ یاد رہے کہ یہودی نژاد بریٹ سٹیفن کو 28 سال کی عمر میں ہی "یروشلم پوسٹ" کے
ایڈیٹر جیسا اہم عہدہ (مارچ 2002ء سے لیکر اکتوبر 2004ء) پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ شائد اسی لئے سید مشاہد حسین نے انکشاف کیا ہے کہ زرداری صاحب کے اسرائیلی یہودیوں سے دیرینہ تعلقات ہیں اور گاہے بگاہے ان تعلقات کو بخوبی استعمال کرتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ پھر ہفتہ 29 مئی 2010ء کو واشنگٹن پوسٹ میں گریگ ملر نے "آپشن سٹیڈیڈ فار اے پاسبل پاکستان سٹرائیک" پاکستان پر ممکنہ حملے کی تیاری" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس کی تائید میں انور اقبال نے بھی "یو ایس ریجیر سس سٹرائیک ان سائیڈ پاکستان" کے

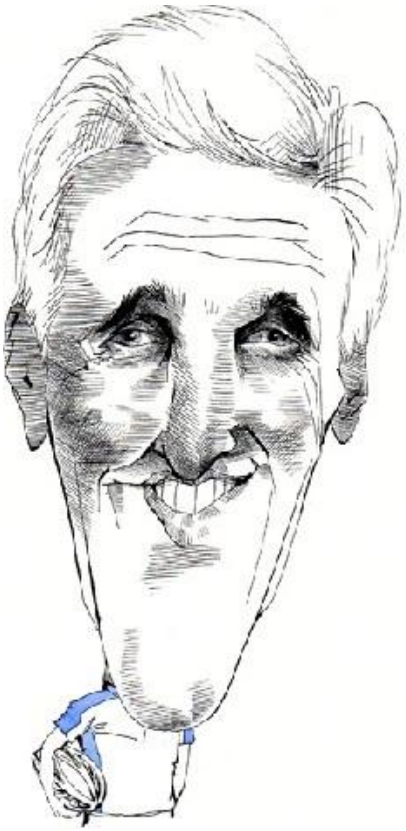

عنوان سے واشنگٹن سے اپنے کالم میں خبر دار کیا ہے کہ " امریکا نے کمپیوٹر پر پاکستان پر ممکنہ زمینی حملے کی پوری ریہرسل کی ہے"۔ نومبر 2008ء میں جب ممبئی پر دہشتگردی کا واقعہ ہوا تھا تو اس وقت بھی بش انتظامیہ نے پاکستانی حکومت کو امریکی افواج کا پاکستانی سرحدوں کے قریب ایسی ہی مشقوں کا عندیہ دیا تھا جس کے جواب میں اس وقت کے دفاعی مشیر جنرل محمود علی درانی کو فوری طور پر واشنگٹن جا کر یہ استدعا کرنی پڑی کہ اس طرح پاکستان کے نئے جمہوری نظام کو نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن بعد ازاں پاکستانی افواج کے سپہ سالار اشفاق پرویز کیانی کی امریکی ہم منصب جنرل مائیک مولن کو بھرپور یقین دہانی کے بعد کہ آئندہ ایسے کسی بھی حملے میں پاکستان کی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت بالکل نہیں دی جائے گی' امریکی انتظامیہ نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔ اب ایک دفعہ پھر ایسے ہی خطرناک ارادوں کا اعادہ کیا گیا ہے اور سفارتی ذرائع نے اس بات کی تصدیق بھی کی ہے کہ اب کسی بہانے کو خاطر میں نہیں لایا جائے گا"۔

مغربی ذرائع ابلاغ کی یہ صرف ایک جھلک ہے کہ پاکستان کے داخلی اور خارجی معاملات غرض ایک ایک پر شکاری کی طرح نظریں جمی ہوئی ہیں۔ یہود و نصاریٰ اسلام دشمنی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور افغانستان اور عراق کے بعد ہر اسلامی ملک اس تشویش میں مبتلا ہے کہ اس کی باری کب آئے گی؟ کیونکہ یہ بات بالکل صاف نظر آ رہی ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کا مطمع نظر ہی یہ ہے کہ نہ صرف اسلام کا نام لینے والا باقی نہ رہے۔ بلکہ تمام علاقے اور مسائل پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ ایٹمی اثاثے تو سونے پر سہاگہ والی بات ہے ۔ مزے کی بات ہے کہ ان کا اتحاد اٹوٹ ہے اور مدِ مقابل منتشر ہے۔ کئی قسم کی بیڑیاں ہیں جو انہوں نے مختلف ممالک کے لئے استعمال کی ہوئی ہیں۔ اور پاکستان جس کے لئے یہ زعم ہے کہ یہ اسلام کا قلعہ ہے، مگر کیا اسے پلیٹ میں سجا کر پیش نہیں کر دیا گیا؟ اس کا سودا کرنے والوں نے قسط وار اس کی قیمت وصول کی اور کر رہے ہیں۔

بظاہر محسوس یہ ہورہاہے کہ پاکستان میں کوئی بھی ان خدشات پر توجہ نہیں دے رہا' حکومت کی ساری مشینری صدر آصف زرداری اوران کے حواریوں کو کرپشن کے مقدمات سے بچانے کی فکر میں ہیں چاہے اس کیلئے ملک کی سلامتی کو بھی داؤ پر لگانا پڑے۔ ملک کی اعلیٰ عدالت اور حکومت میں طبلِ جنگ بج چکاہے اور حکومت نے یہ فیصلہ کرلیاہے کہ اس کا ہر قیمت پر مقابلہ کیاجائے گااور ملک میں یہ اندیشہ زدوعام کی زبان پر ہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کا بہانہ بناکر امریکا بہادر سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں تاکہ اس کی آڑ میں آنے والے عدالتی فیصلوں سے نجات ملے۔ یہ ایک ایساخطرناک عمل ہوگا جس کیلئے پاکستان دشمن قوتیں پہلے سے تیار بیٹھی ہیں۔

آج پاکستان کا ایٹمی پروگرام کئی سال کی ان تھک محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ چکاہے، اس دوران جن مسائل سے وطن عزیز کو گزرنا پڑا، جو جو مشکلات آئیں ان سے یہ ملک اکیلے ہی نمٹا۔ چاغی میں کامیاب تجربہ کرنے کے بعد ساری دنیامیں چرچاتھاپاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔ تب سے دشمن کی کوششیں بھی تیز ہوگئیں۔ کچھ اپنوں کی مہربانی سے اب یہ حال ہے کہ جس کادل چاہے منہ کھول کے کچھ بھی کہہ دیتاہے۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ باتیں سننا کتنا اچھالگتا تھا کہ اب پاکستان کی طرف کوئی میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکے گااور پاکستان اب ترقی کی شاہراہوں پر چلنے نہیں دوڑنے لگے گا۔ اتناسہانا گیت سنتے ہوئے مہنگائی اور کرپشن جیسی لعنت کو کئی بار نظر انداز کئے رکھا کہ بس خوشحالی اب آئی کہ اب آئی۔ کیا قوم نے کبھی یہ سوچاتھا کہ جس جوہری طاقت کو حاصل کرنے کیلئے اسی حکومت کے ہیروذوالفقار بھٹو نے گھاس کھانے کا اعلان کیاتھااور بعد میں پھانسی لے پھندے پر بھی جھول گیا 'آج اسی جماعت کے سربراہ آصف علی زرداری کو کرپشن کے مقدمات سے بچانے کیلئے اس کے جوہری پروگرام کو شدید خطرات سے دوچار کردیاجائے گا۔

آج حفاظت کے نام پر امداد کرنے والے خود ہی دانت گاڑے بیٹھے ہیں اور یہ وہ دانت نہیں کہ جو پتھر مارنے سے جان چھوڑ جائیں۔ کیری لوگر بل میں پہلے ہی اس کا بندوبست کردیاگیاہے۔ ان ہوشربامضامین میں جو انکشافات کئے گئے ہیں یقیناان پر کڑی نگاہ ان جیالوں کی بھی ہوگی جنہوں نے اپنی جان سے زیادہ اس جوہری طاقت کی تیاری و تکمیل کے علاوہ اس کی حفاظت کا بیڑہ بھی اٹھار کھاہے!

اب بات صرف گھر کی بات چوراہے پر کرنے کی نہیں رہی بلکہ ٹوٹے ہوئے گھر میں نقب کہاں کہاں لگانی ہے اور کیسے تیاپانچا کرناہے کہ نام ونشان نہ رہے۔ تجزیئے کا انداز ایساہے جیسے کسی مریض کو ڈاکٹر جواب دے دیں کہ اب یہ نہیں بچے گااور آپ اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرلیں۔ اور گھر والے سوچناشروع کردیں کہ قبر کہاں لیں؟ کون جاکر بات کرے؟ غسل کہاں ہو؟ نماز جنازہ کہاں پر رکھیں؟ کس کس کو اطلاع دیں؟ بہت سے دعوے دار اپنے اپنے حصے کے لئے بے چین ہوجاتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کا تجزیہ مجھے لگا' بعد میں اب تک اس گہرے دکھ میں ہوں کہ میرے گھر پر لوگوں کی کیسی نظریں پڑرہی ہیں؟ اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان میں پہلی مرتبہ ایسامنصف مزاج قاضی القضاہ موجود ہے جنہوں نے برملا یہ کہاہے کہ ہر حال میں انصاف ہوگا چاہے اس کیلئے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے لیکن جمہوری حکومت کے وزیرِ خارجہ 'وزیر داخلہ اوروزیر دفاع کہاں ہیں؟ رکھوالے کہاں ہیں؟

بروز سوموار 17 جمادی الثانی 1431ھ 31 مئی 2010ء

زمیں کی رات

بنی اسرائیل کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کنعان میں حضرت کنعان میں حضرت یعقوب اور ان کا خاندان آباد تھا۔ وہاں قحط سالی کی وجہ سے اور حضرت یوسف کے مصر میں وہاں کی حکومت پر مؤثر اثر ورسوخ کی وجہ سے یہ لوگ کنعان سے مصر آئے۔ مصر میں حضرت یوسف نے ان کیلئے ایک علیحدہ انتظامات کئے۔ ان کے معاشی استحکام اور ثقافتی تحفظ کیلئے عام مصریوں سے الگ "گوشن" نامی علاقہ آباد کیا۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر پر فرعونوں کی حکومت تھی اور وہ بنی اسرائیل کو لیکر بحر قلزم کے کنارے آئے جہاں فرعون کے وقت غرق ہونے کا تاریخی واقعہ پیش آیا۔ حضرت موسی جزیرہ نمائے سینا میں انہیں لے کر داخل ہوئے۔ اس وقت فلسطین اور اردن میں ایک ظالم اور جابر قوم ۔ان کے خلاف بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم ہوا مگر یہ خود پسند اور ضدی قوم تھی جس نے جہاد سے منہ موڑتے ہوئے کہا؛ حکمران تھی
قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ وہ بولے کہ موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جاسکتے (اگر لڑنا ہی ضرور ہے) پس تم اور تمہارا رب دونوں جنگ کرو' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" (المائدہ 5:24)

اس پر اللہ تعالیٰ نے ارضِ فلسطین کو ان پر حرام کر دیا اور سالہا سال سے یہ صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے۔ بعد میں یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین میں آئے۔ حضرت موسی کے دور میں ان کا عالم یہ تھا کہ کبھی بت پرستی کی باقاعدہ اجازت طلب کرتے' کبھی اللہ سے من وسلویٰ کا مطالبہ کرتے اور حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سونے کے بچھڑے کی پوجا کرنے لگ جاتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کی منتخب کردہ قوم ہیں جنہیں ساری دنیا میں منتشر ہونے 'دنیا بھر میں پھیل جانے کا حکم ملا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی بعثت ہوئی تو یہودیوں نے ان کی مخالفت اور ان کے خلاف پروپیگنڈے کا محاذ گرم کر دیا۔ حضرت مریم کے بارے میں غلیظ زبان استعمال کرتے رہے۔ روم میں جاکر آباد ہوئے تو اپنی فتنہ پردازیوں کا بازار وہاں بھی گرم رکھا۔ حجاز میں آئے تو اس زعم میں مبتلا تھے کہ نبی آخری الزماں ﷺ انہی کی نسل سے ہوں گے۔

عربی رنگ میں مکمل رنگے گئے تھے اور عربوں پر اپنا مکمل تسلط جمائے ہوئے تھے 'خصوصی طور پر مدینہ منورہ کے ارد گرد ان کی بستیاں آباد تھیں۔ یہ جنگ وفساد کی آگ بھڑکانے میں ماہر تھے۔ اوس وخزرج انہیں کی لگائی ہوئی آگ کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف برسوں تک برسرِپیکار رہے ۔ظاہر اُحد محاذ آرائی اور جھگڑے سے اجتناب کرتے مگر دو قبائل دو حکومتوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسر، پیکار رکھتے۔ غزوہ بنو قریضہ ' خیبر ' فدک 'وادئ القریٰ اور تیماء کے معرکوں کے بعد ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئے مگر یہ عہد شکنی 'سازشوں اور اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے میں انتہائی ماہر قوم ہے۔ قریب تر تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو جنگِ عظیم اوّل انہی یہودیوں کی بچھائی ہوئی وہ بساط تھی جس میں شطرنج کے مہروں کی طرح برطانیہ اور امریکا استعمال ہوئے۔

انیسیویں صدی کے آخر میں شروع ہونے والی ان کی منظم تحریک "زاؤنسٹ" تحریک تھی۔ یہ ایک ایسی صہیونی تحریک تھی جس نے تہذیب وشائستگی کے معیارات بدل کر رکھ دیئے۔ ہر وہ چیز جو یہودی مفاد میں ہو وہ جائز اور اچھائی کی سند رکھتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی اصل وجہ یہودیوں کی حکومت کا قیام تھا مگر فلسطین میں ان کی حکومت کا قیام ان کی منزل نہیں بلکہ دنیا سے تمام مذاہب کا خاتمہ 'تمام غیر یہودی اقوام کو اپنا دستِ نگر اور غلام بنانا ان کا منشور ہے جس کیلئے وہ کسی بھی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا ذمہ دار اعام طور پر ہٹلر کو قرار دیا جاتا ہے مگر در حقیقت اس کے پیچھے بھی یہ یہودی سوچ کہ ہمارے مفادات جرمن قوم کی مکمل تباہی سے مشروط ہیں 'کار فرما تھی۔

امریکا میں ان کا سیاسی اثر ورسوخ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ امریکی صدر ماضی میں ان کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے اور اب بھی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ یہ اتنی ہوشیاری اور عیارانہ کردار سے امریکا کے پورے ریاستی ڈھانچے پر اثر انداز ہو رہے ہیں 'جس کو چاہے بامِ عروج تک پہنچا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں پاتال کی گہری کھائیوں میں اتار دیتے ہیں۔ یہ در حقیقت اسلام کے ہی نہیں بلکہ عیسائیت 'بدھ مت اور ہر غیر یہودی مذہب کے خلاف اپنے اندر کینہ رکھتے ہیں۔ ہندو مت ان کے درمیان بہت سی عیارانہ عادات میں حیران کن مماثلت ہے۔ مثلاً سودی کاروبار میں ہندو مہاجن اور یہودی ایک جیسا مزاج رکھتے ہیں 'گائے کے تقدس کو دونوں ایک جیسا مذہبی احترام رکھتے ہیں 'گیروے لباس پر ایک جیسا مذہبی اعتقاد اور چانکیہ کی پوری سیاسی حکمت عملی کا مطالعہ کریں تو ان صیہونی سیاسی سازشوں کی ایک مکمل تصویر نظر آئے گی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان جو جرمنی کا ساتھ دے رہا تھا اس نے امریکی مفادات پر کوئی ضرب نہیں لگائی تھی مگر اس کی سپلائی لائن کو کاٹ کر حالات اس طرح کے بنا دیئے گئے کہ وہ پرل ہاربر پر حملہ کرے اور امریکا جنگ میں کودنے میں مجبور ہو جائے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں دن دہاڑے اسرائیل کی گن بوٹس نے امریکی جہاز یو ایس لبرٹی ڈبو کر الزام عربوں پر لگا دیا۔ نائن الیون کے سانحے کے بارے میں ایمانداری سے تحقیقات کی جائیں تو اس میں بھی اصل ہاتھ ان یہودی پالیسی ساز کا ہے جنہوں نے ایک دفعہ پھر کمال عیاری سے افغانستان اور عراق کی تباہی کے ذریعے عالمِ اسلام کی اجتماعی حیثیت کے مکمل خاتمے کے سلسلے کا آغاز کر دیا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں اصل جنگ معیشت کے میدان میں لڑی جا رہی ہے اور اس میدان کے سب سے ماہر کھلاڑی یہودی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک جائز اور ناجائز کا تعین یہودی مفاد سے وابستہ ہے۔ ہر وہ کام جس سے صہیونیت کا مفاد ہے 'وہ جائز اور باقی سب ناجائز۔ یہ دولت کمانے کے تمام ہنر بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور انہیں استعمال کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ سود خوری ان کی خاص صفت ہے جس کے ذریعے بتدریج کمزوروں

کو اپنے چنگل میں پھنسالینا اور تابعداروں میں اضافہ کرنا انہیں خوب آتا ہے۔ کسی بھی ملک میں مقامی لوگوں کو قرضوں کے ذریعے زمین اور اراضی سے محروم کر دیتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت جرمنی کی تمام صنعتیں یہودیوں کی ملکیت تھیں۔ دوران جنگ مزدوروں کی ہڑتالوں کے ذریعے اندرون ملک جرمنی میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ جنگ ہار گئے۔

یہودی بینکاروں نے ان کے تمام سرمائے کو امریکا اور برطانیہ منتقل کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے جرمن بدترین معاشی حالات کا شکار ہو گئے' انہی حالات نے ہٹلر کو وجود دیا۔ جنگوں کے دوران یہودیوں کو اپنا سرمایہ دونوں فریقین پر لگانا خوب آتا ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی خود شکست کا شکار نہیں ہوتے اور ہمیشہ نفع میں رہتے ہیں۔ امریکا جیسی سپر طاقت کو بھی اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں کیونکہ صہیونی سرمایہ کاروں نے تجارت پر مکمل قبضہ کیا ہوا ہے۔ امریکا کی صنعتی' تجارتی اور پیداواری قوتوں اور ذرائع پر ان کا مکمل کنٹرول اور بالادستی حاصل ہے۔ قرضوں کے نظام میں دنیا کا امیر ترین ملک بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ یہودیوں کی پالیسی یہ ہے کہ مزدوروں اور محنت کشوں کو اعلیٰ معاوضہ اس انداز سے دو کہ انہیں قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچے' اس کیلئے اپنی تیار کردہ اشیاء اور سازوسامان کی قیمتوں میں بھی غیر معمولی اضافہ کر دو۔

ان کا معاشی اثر ورسوخ ہر ملک کے سیاسی حالات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور تہذیب وثقافت پر بھی۔ بعض مسلمان ریاستوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جنہیں منی یورپ کہا جاتا ہے' اسلامی ملک کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ تہذیب وثقافت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ ڈویلپمنٹ کے نام پر صہیونی سرمایہ کاروں نے سٹی سینٹر کے جال بچھا دیئے ہیں کہ چھوٹے تاجر اور سرمایہ کاروں کو اپنی بقاء مشکل نظر آتی ہے۔ چند سال پہلے معاہدہ واشنگٹن کے ذریعے "نیو لبرل آزاد تجارت" کی اصطلاح سامنے آئی ہے اور اس آزاد تجارت کے اندر ترقی پذیر ممالک کی مکمل معاشی تباہی چھپی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا آکٹوپس ہے جس کا شکار ارجنٹائن اور برازیل ہو چکے ہیں۔ یہ وہ کھلی دھاندلیاں ہیں جن کے خلاف عالمی کریمنل کورٹ بھی بے بس نظر آرہی ہے۔

یہ ان صیہونی سرمایہ کاروں کی وہ سازش ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے پاس فصلوں کے ڈھیر بھی لگے ہوئے ہوں تو برآمد نہیں کر سکتے ہیں۔ بغیر بارود اسلحے کے دنیا پر ناجائز قبضے کی ایک اور صورت ہے کہ معاشی دیوالیہ پن قوموں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ ملک پاکستان کپاس اور شکر سازی میں اسی آزاد تجارت کا نشانہ بنا ہوا ہے مگر ہمارے برسرِ اقتدار طبقے کو ابھی ہوش ہی نہیں آرہا۔ ان کی دن رات یہ کوشش ہے کہنہ صرف ملک کے وسائل کو لوٹ کر اپنی تجوریوں کو غیر ملکوں میں محفوظ کیا جائے بلکہ پہلے سے لوٹی ہوئی دولت کو بھی محفوظ کریں چاہے اس کیلئے ملک کے تمام اداروں کو تباہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

یہودی قوم شروع سے پروپیگنڈہ کرنا خوب جانتی ہے۔ افواہیں پھیلانا' کسی مخالف کے خلاف اسکینڈلز کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کرنے کا فن بھی انہیں خوب آتا ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی قد آور شخصیات ان کی مٹھی میں رہتی ہیں۔ انیسویں صدی میں یہودی میڈیا پر اتنا کنٹرول رکھتے تھے کہ انہوں نے جرمن قوم کو دنیا کے سامنے خونی بھیڑیا بنا کر پیش کیا' ہر طرح سے ان کی کردار کشی کی بالکل اسی طرح جس انداز سے تمام اسلام پسند قوتوں کو آج دہشتگرد قرار دیا جارہا ہے۔ یہی لوگ برطانیہ اور امریکا میں ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں اور عوام کے ذہنوں اور خیالات کو اپنی مرضی سے کوئی رخ

دینے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر کوئی بات عوام تک مؤثر انداز سے پہنچانا مشکل ہے لیکن ان تمام حالات کے باوجود کشمیر میں بھارتی فوج کے ہاتھوں چار ہزار بے گناہ کشمیریوں کی اجتماعی قبروں کی نشاندہی ایک سان فرانسسکو کی انڈین امریکن پروفیسر انگنا چترجی نے اپنے ایک امریکی ساتھی پروفیسر رچرڈ شیفر کی مدد سے اپنی حالیہ رپورٹ میں کی ہے جس کیلئے اس نے درجنوں بار کشمیر کا دورہ کیا اور اب امریکی کانگرس کے رکن ڈین برٹن نے امریکی ایوان نمائندگان میں "کشمیر کاکس" قائم کرنے کا اعلان کیا ہے جہاں بھارت سے اس سنگین جرم کی باز پرس کی جاسکے۔ کیا ہمارے موجودہ حکمرانوں کو اس بات کی خبر ہے؟

رہے نام میرے رب کا جو جبار بھی ہے قہار بھی!

اداس میں ہی نہیں' شہر میں کہ میری طرح
زمیں کی رات بھی شامل ہے سوگواروں میں

بروز منگل 18 جمادی الثانی 1431ھ یکم جون 2010ء

تیری بربادیوں کے.....

بجلیاں ہیں' قہر ہے' آلام ہے۔ کتنی وادیاں اور چھوٹی بڑی بستیاں ان کی زد میں ہیں۔ اضطراب اور بے چینی کی لہر نے سارے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ قبائلی علاقے جہاد کے ثمرات کا تلخ ذائقہ مسلسل چکھتے چلے آرہے ہیں اور اب ایک دفعہ پھر اس کا رد عمل بڑی عیاری کے ساتھ ملک کے بڑے شہروں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا سب سے اہم شہر لاہور ایک دفعہ پھر مقتل گاہ بنا دیا گیا ہے ۔ شدید بدترین قسم کی دہشت گردی نے اور چند دن پہلے ایک ساتھ پانچ بم دھماکوں نے ملک کے باسیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آخر ہم کب تک شہنشاہ دوران کی خوشنودی کی خاطر جو فصل ہمارے حکمرانوں نے بوئی ہے' بے گناہ عوام اپنی جانوں کی قربانی سے اس کو کاٹتے رہیں گے۔ شائد جرمِ ضعیفی کی یہی سزا ہوتی ہے' نہ اپنی خوشی سے آئے' نہ اپنی خوشی چلے۔

روس کو افغانستان سے بھگانا تھا تو یہی مجاہدین کے محترم نام سے پہچانے جاتے تھے' تمام مغرب کی آنکھوں کے تارے تھے۔ بنجارہ لاد گیا' اشتراکی روس کی بساط لپیٹ دی گئی' امریکا واحد سپر پاور بن گیا۔ بجائے طاقت کے نشے میں چور مقامی دانشوروں نے نیا حریف ڈھونڈ نکالا جسے سیاسی (انقلابی) اسلام کا نام لیکر مغربی تہذیب کیلئے خطرہ قرار دیا۔ ان کے بھاگوں گیارہ ستمبر کا سانحہ ہو گیا۔ نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر زمین بوس ہوا اور انقلابی اسلام کے خلاف طبل جنگ بج گیا' کہنے کو دہشت گردی دشمن قرار پائی مگر حملہ افغانستان پر ہوا جہاں ملا عمر کی قیادت میں طالبان اپنی طرز کا اسلامی نظام رائج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روس کے خلاف برسرپیکار ملکی اور غیر ملکی مجاہدین ان کے ہمنوا تھے۔ طالبان سے اقتدار چھن گیا تو ان کے شانہ بشانہ روسی فوج سے لڑنے والوں کو جہاں جگہ ملی سر چھپانا پڑا' کچھ ہمارے قبائلی علاقوں میں آ گئے مگر امریکا کو یہ منظور نہ تھا۔ کہا گیا کہ نئی افغان حکومت کو ان سے خطرہ ہے۔

اب چراغ رخِ زیبا لیکر ہم ان دشمنوں کو ڈھونڈنے اپنے ہی گھروں کی تلاشی لے رہے ہیں۔ کہیں سراغ ملتا ہے تو آتشبازی ہو جاتی ہے' دونوں طرف کے شہیدوں کو دیکھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے' گردشِ ایام پیچھے کو لوٹ جاتی ہے۔ جنگ جمل میں بھی یہی ہوا تھا' اپنے ہی آمنے سامنے صف آراء تھے ۔ وہ جنہیں جیتے جی جنت کی بشارت دی گئی تھی' اختلاف باہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ تلواریں چلیں تو بوڑھا آسمان بھی رویا ہو گا' جنگ صفین کے موقع پر بھی اس نے آنسو بہائے ہونگے اور کربلا میں جو آفت ٹوٹی تھی اس پر تو خلقِ خدا صدیوں سے ماتم کرتی چلی آرہی ہے۔ حوادث زمانہ نے پھر سے ہمیں اسی موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ بگڑی بنانے کی فکر تو سب کو ہے مگر مقامی سطح پر اعتماد کی فضا پیدا کرنے کا اہتمام نہیں ہو پا رہا۔ ٹوٹے ہوئے پلوں کی از سر نو تعمیر نہیں ہو پا رہی۔ مقامی سطح پر وہ مزدور اور مستری موجود نہیں جو یہ کار خیر کر پائیں' اگر ہیں تو انہیں چارہ گری کا موقع نہیں مل رہا۔

ذرا اور جنوب کو آیئے' یہ وسیع و عریض خطہ بلوچستان ہے۔ ہر سو انتشار پھیلا ہوا ہے۔ شکوہ شکائت تو پرانی ریت ہے' عوام سے وہاں مہربانی تو کیا' انصاف تک کبھی ہوا نہیں۔ وہی چال اپنی بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ آبادی کا خاصا حصہ دور دراز پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں آباد ہے۔ وہ نہیں

جانتے حکومت کس سونے کی چڑیا کا نام ہے' اپنی محنت سے جو بن پڑے پیدا کر لیتے ہیں' اس سے جیا جا سکے تو ٹھیک و گرنہ قحط' بیماری اور بے بسی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ نہ اسکول' نہ ہسپتال اور نہ اور کوئی سہولت' زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔ واسطہ پڑتا ہے تو سردار' ٹکری اور معتبر سے اور بالعموم یہ تینوں معززین اپنا بھلا پہلے سوچتے ہیں اور غریب برادری کا بعد میں۔ سرداری نظام ڈھیلا پڑنے کے باوجود قائم ہے۔ ہر خاندان کا ایک بڑا ہوتا ہے جسے عام طور پر "معتبر" کہتے ہیں۔ قبیلے کی ہر شاخ "ٹکر" کہلاتی ہے جس کا سربراہ "ٹکری" ہوتا ہے اور سارے قبیلے کا سردار تو ماشاء اللہ قوم کا راج دلارا ہوتا ہے۔

روائتی طور پر یہی وڈیرے قیادت فراہم کرتے ہیں' ووٹ انہیں کے ہیں' رائے ان کی ہے' باندھنا چھوڑنا انہی کے بس میں ہے۔ قومی اسمبلی میں بڑے سرداروں کی اجارہ داری ہے تو صوبائی اسمبلیاں بھی معتبرین کی دستبرد میں رہتی ہیں' بالعموم وہی کامیاب ہوتے ہیں جنہیں اس علاقے کے سرداروں کی بھرپور حمائت حاصل ہو۔ ہر سطح پر اقتدار غالب طبقے کے پاس گروی رہتا ہے جو اسے اپنے مفاد میں برتتا ہے۔ امریکا کے عظیم صدر ابراہام لنکن نے جمہوریت کو ایسا طرزِ حکومت قرار دیا تھا جس سے لوگ خود اپنے مفاد میں اپنے اوپر راج کرتے ہیں۔ جہاں جہاں سرداری اور قبائلی نظام ابھی چل رہا ہے وہاں انتخابات ہوں نہ ہوں' سردار وڈیرے اور معتبر اپنے مفاد میں عوام پر حکومت کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سرکار بڑے منصوبوں پر زر کثیر خرچ کر رہی ہے تو انہیں اپنی حالتِ زار کا خیال ستانے لگتا ہے' وہ ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں کہ سرکار اتنی مالدار ہے تو ہمارا خیال کیوں نہیں رکھتی۔

ان کی یہ سوچ غیر روایتی بھی نہیں' انگریز کے زمانے سے یہی دستور چلا آیا ہے' سرکاری عملداری میں یہ شریک رہے ہیں۔ باقاعدہ درجہ بندی کے تحت باقاعدہ سرداروں اور ٹکریوں کے وظائف مقرر تھے' انہیں مخصوص مراعات حاصل تھیں۔ وفاداری بشرطِ استواری پر انعامات و کرامات ملا کرتے تھے۔ ان کے علاقے میں ترقیاتی کام تک ان کے مشورے اور رضامندی سے ہوا کرتے تھے۔ وہاں کس کو کیا ملنا ہے' ان کی مشاورت سے طے ہوتا تھا۔ اس کے عوض وہ اپنے علاقے کا پورا ذمہ لیتے تھے کہ وہاں سرکار مخالف کسی قسم کی کوئی کاروائی نہیں ہو گی۔ یہ نظام آزادی کے بعد بھی چلتا رہا مگر اس کی چولیں ڈھیلی ہوتی گئیں۔ بڑی وجہ طاقت کے توازن میں بگاڑ تھا۔ قبائلی انتظامی ڈھانچہ کا بنیادی اصول سادہ اور واضح تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ یا ڈپٹی کمشنر ضلع میں حکومت کا نمائندہ ہوتا تھا۔ وہ باہر سے آتا تھا' اس کیلئے غیر جانبدار ہونا لازم تھا۔ لوگوں کے درمیان نہ اسے صرف انصاف کرنا ہوتا تھا بلکہ بڑے سے بڑے جابر مجرم کو بھی کٹہرے میں کھڑا کرنا ضروری تھا تاکہ قانون کے بالاتر ہونے پر کسی کو شک و شبہ نہ رہے' یہ

تبھی ممکن تھا جب اسے نہ صرف اختیارات حاصل ہوں بلکہ جائز سرکاری احکامات کو نافذ کرنے کی طاقت بھی حاصل ہو' اسی لئے سکاؤٹ' لیویز اور پولیس اس کے حکم کے تابع تھے۔ کسی سردار میں اس کے مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ خفیہ فنڈ اس کے علاوہ تھے' ان کے دانشمندانہ استعمال سے بڑے سے بڑے کام نکلتے تھے۔ ہوتے ہوتے وسائل کی فراہمی کم ہوتی گئی' اسکاؤٹ اور پولیس آزاد ہوتی گئی' سردار وزارتوں میں پہنچے تو ان کا قد آسمانوں کو چھونے لگا' جن مراعات کے وہ محتاج ہوا کرتے تھے وہ ان کو اپنے ہاتھوں خیرات کی طرح بانٹنے لگے' رہی سہی کسر بھٹو کے دور میں نکل گئی' سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان ہوا' وظائف بند ہو گئے اور سرکار نے یوں انہیں ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا۔

اصلاحات کا ایک نیا ریلا آیا جو ڈپٹی کمشنر کے ادارے کو ہی بہالے گیا۔ اب ضلع کی سطح پر سرکار کا کوئی نمائندہ نہیں جو بگڑتے حالات کو سنبھالا دینے کا پابند بھی ہو اور اہل بھی' انتظامی خلاء پیدا ہو گیا ہے جس نے سماجی پسماندگی کے شکار علاقوں میں بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ ان علاقوں میں جو کچھ ڈپٹی کمشنر یا پولیٹیکل ایجنٹ کرتے تھے اب وہ اسلام آباد میں نور تن کر رہے ہیں۔ ہماری موجودہ حکومت نے سارے ملک کو امریکا کے حوالے کر دیا ہے بالکل اسی طرح جیسے سردار پاکستان بننے سے پہلے غیر ملکی آقاؤں کی خدمات بجالاتے تھے یا کچھ سال پہلے ہمارے حکمراں ان علاقوں پر سرداروں سے جو کام لیتے تھے۔ پہلے ڈپٹی کمشنروں کو خفیہ فنڈ دیئے جاتے تھے اب امریکا اپنے مفادات کی تعمیل میں کیری لوگر بل کی مد میں رقم فراہم کرتا ہے اور اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو ہم اس کے عوض ملک میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیکر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات پاکستانی عوام کی سلامتی اور خوشحالی کی بجائے اب اس پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے کہ سپریم کورٹ کے احکامات کا کس طرح مذاق اڑایا جائے یا پاکستانی آئین کی رو سے کس طرح ایسا استثنیٰ حاصل کیا جائے کہ لوٹی ہوئی ملکی دولت کو نہ صرف محفوظ بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا جا سکے۔

پچھلے دنوں چغہ پوش مسخرہ کرزئی نے اعلانیہ طور پر بھارت کو اپنا سب سے بڑا دوست کہہ کر اپنی غلامانہ اوقات یاد دلائی ہے۔ اس وقت امریکا بشمول اپنے اتحادیوں طالبان کے خلاف ایک بہت بڑی سازش میں مصروف ہے کہ بیرونی افواج کے جانے کے بعد طالبان کو ہر قیمت پر اقتدار سے باہر رکھا جائے جس میں ہمارے موجودہ حکمران بھی پوری طرح شامل ہو گئے ہیں۔ پاکستان کے ذریعے حکمت یار اور ملا برادر کو طالبان سے الگ کرنے کی کوششیں جاری ہیں ۔ گزشتہ ماہ اسی سلسلے میں مالدیپ میں ایک خفیہ میٹنگ کا اہتمام کیا گیا جس میں حکمت یار کے داماد ڈاکٹر غیرت بہیر' حامد کرزئی کا بھائی' ملا برادران اور خود امریکی گماشتے شامل تھے۔ اس میٹنگ کا مقصد یہ تھا کہ کسی بھی طور طالبان کو تقسیم کیا جائے یا دھونس یا دھاندلی کے ذریعے طالبان کو اپنی شرائط پر بات چیت کیلئے رضامند کیا جائے۔ یہ ایک ایسا خطرناک کھیل ہے جس سے پاکستان کی سلامتی کو داؤ پر لگا دیا گیا ہے اور لاہور کے حالیہ دھماکے اور اس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں۔

قانون بیچارہ تو ہر جگہ یتیم اور مسکین بنا دیا گیا ہے۔ لیاری جو کراچی کا جگر ہے مختلف مافیا کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ پنجاب میں وزیر اعلیٰ کو نازوں پلی پولیس سے شکوہ ہے کہ عوام میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کی بجائے چھترول سے ساری اصلاحات کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ ہم گھپ اندھیری رات کے وہ مسافر ہیں جو صحرا میں راستہ بھول گئے ہیں۔ بے سمت چلے جا رہے ہیں' منزل کہاں ہے کچھ معلوم نہیں۔ نہیں جانتے کس ٹوکری میں کتنے انڈے رکھنا ہیں؟

کیاسب کچھ ان گنے چنے ہاتھوں میں رہنا ہے یا محروم طبقوں کو شریک نعمت کرنا ہے؟ کب تک قوم اسی طرح بھٹکتی رہے گی اور منزل سے دور ہوتی چلی جائے گی؟ رہے نام میرے رب کا جو اپنے مجبور و مقہور بندوں کی فریاد سنتا ہے!

بروز بدھ 19 جمادی الثانی 1431ھ 2 جون 2010ء

آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو

تحریر، ہاں کیا ہر واقعہ تحریر کیا جاسکتا ہے؟ شاید۔ ہو سکتا ہے خود پر تھوڑا سا جبر کریں، خود کو جمع کریں تو آپ لکھ لیں گے۔ لیکن کیا ہر بات لکھی جاسکتی ہے ؟ خوشی کو تو لکھا جاسکتا ہے۔ اور غم کو؟ دکھ تو تحریر ہو سکتا ہے اور درد! آنسوئوں کو کیسے لکھا جاسکتا ہے۔ کرب کو کیسے لکھیں... اضطراب کو، بے کلی کو، بے حسی کو، انا کو تحریر میں کیسے سموئیں؟ لفظ وہی ہوتے ہیں، قلم وہی ہوتا ہے، صفحات وہی ہوتے ہیں... سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ لیکن آپ بے دست وپا ہوتے ہیں۔ رحمت کو تو بیان کیا جاسکتا ہے، تحریر کیا جاسکتا ہے۔ نحوست کو کیسے پابند تحریر کیا جاسکتا ہے! اداسی کو تحریر کر سکتے ہیں آپ؟ کچھ نہیں کر سکتے ہم۔ فیض صاحب نے تو کہا ہے" جو دل پہ گزرتی ہے سو گزرتی ہے، اسے بیان کیسے کریں! میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ نہیں مجھے یہ ہنر نہیں آتا۔ اور مجھے یہ سیکھنا بھی نہیں ہے۔

ضروری تو نہیں ہے مجھے سب کچھ آتا ہو۔ نہیں 'میں نہیں لکھ سکتا دل کو، اداسی کو، بے کلی کو، اضطراب کو... بالکل نہیں لکھ سکتا۔ آنسوئوں کو کیسے تحریر کروں ؟بتایئے آپ؟ اگر آپ تحریر کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔ کالم کی تحسین میں کئی ایسی تحریریں ملتی ہیں کہ جن کے الفاظ چیخ چیخ کر آسمان کو بھی خوں کے آنسو رلا دیتے ہیں۔ ان بہت سی تحریروں میں صرف ایک تحریر کے چند حصے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

کئی ماہ پہلے ہفتہ وار "رہبر" میں آپ کا پہلا کالم شائع ہوا تو میری شدید خواہش تھی کہ آپ کے کالم تو کشمیر کے تمام اخبارات کی زینت بننے کے لائق ہیں کیونکہ آپ کے کالم کیلئے ہفتہ بھر انتظار کرنا دشوار محسوس ہوتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ہم سب کی دعائیں رب العزت نے قبول فرمائیں اوراب کشمیر کے بڑے اخبارات میں تقریباً روزانہ کوئی نہ کوئی کالم آپ کا پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

پرانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شاعر کی مقبولیت کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھا جاتا تھا کہ اس شہر کے مانگنے والے کتنے فقیر اور خوش گلو گانے والیاں اس کلام کو ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں لیکن اب اس دور میں سیاسی تجزیہ نگاروں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کیلئے کسی سروے کی ضرورت اس لئے باقی نہیں رہتی کہ کالج ویونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء' وکلاء کے علاوہ شکارے کے ملاح بھی بڑی محبت سے آپ کے کالم کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پچھلی چھ دہائیوں سے صنم کے پنجروں سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ پہاڑوں میں رہنے والے عقاب اپنی پرواز سے نا آشنا ہو گئے ہیں لیکن جذبہ حریت کی غیرت و حرمت کو جب ٹھیس پہنچتی ہے تو اقبال کے ان شاہینوں کو دوبارہ چٹانوں کی چوٹیوں میں اپنے آشیانے یاد آتے ہیں۔ آپ کے کالم پڑھ کر ان شاہینوں نے دوبارہ پھڑ پھڑانا شروع کر دیا ہے اوران شاہینوں کو پھر سے اپنی کھوئی ہوئی منزل سامنے نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ آپ کے کالم میں مستور پیغام کی ہر کوئی تشریح اپنے انداز میں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات کلاس روم میں اس دلچسپ بحث میں اساتذہ کو بھی مجبوریوں کا دامن بھلا کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ آجکل انٹرنیٹ کی پابندیوں کے باوجود سچ کا وجود زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہتا۔

بعض اوقات پاکستان کے کچھ بھائیوں کے کے خیالات پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔ کیا اب تک اسی ہزار سے زائد جانوں کا نذرانہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ کشمیری اب بھی آپ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ہماری محبت کو تو یہ عالم ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی ہوئی تو سارے کشمیر میں اس کا سوگ منایا گیا اور سارے کشمیر میں ہڑتال ہوئی اور جب ضیاء الحق کو شہید کر دیا گیا تو کئی دن گھروں میں چولہا نہیں جلا (یہاں کسی فرد سے محبت کا اظہار مقصود نہیں بلکہ پاکستان سے ہر معاملے سے اپنی محبت کا اظہار مقصود ہوتا ہے) ۔ جب بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم کا مقابلہ بھارت کی ٹیم سے ہوتا ہے تو پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی فتح کیلئے سب سے زیادہ دعائیں کشمیر میں ہی مانگی جاتی ہیں اور پاکستان کی فتح پر کشمیر کے ہر گھر سے پاکستانی جھنڈا اٹھائے ہوئے سب مائیں بہنیں اس کا جشن مناتی ہیں۔

ہمیں اپنے شہداء کے قبرستانوں پر بڑا فخر ہے اور ہر " نامعلوم شہید " کے کتبے پر " محمد بن قاسم "کا نام کندہ کر دیا جاتا ہے۔ ان شہداء میں اکثریت ان جاں بازوں کی ہے جو اپنی بہنوں اور ماؤں کی عصمتوں کی حفاظت کیلئے قربان ہو گئے اور کشمیری مائیں اپنے بچوں کو ان کے نام کی لوریاں سناتی ہیں اور ہر اسلامی تہوار پر ان شہداء کے مزارات پر کشمیری مائیں اپنے خونِ دل سے چراغ روش کرتی ہیں اور اپنے آنسوؤں کے پھولوں سے ان مزارات کو منور کرتی ہیں کیونکہ یہ وہ شاہین تھے جو کوہستانی مردوں کو نیند سے بیدار کرنے آئے تھے اور ہم روزِ قیامت بھی ان کے احسانات کی گواہی دیں گے۔ میں شائد کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی ہوں کیونکہ میں بھی اک ماں ہوں اور مجھے ان ماؤں کی کوکھ پر ناز ہے جہاں انہوں نے جنم لیا۔

آپ کے کئی کالم دلوں کو اس قدر چھو جاتے ہیں کہ ہفتوں ان کا درد اور کسک دل میں رہتا ہے۔ پچھلے دنوں آپ نے اپنے کالم میں ڈاکٹر کشور کی پاکستان ہجرت کی جو داستان تحریر کی اس نے مجھے کئی دن بے حال رکھا لیکن میرے بھائی اب تو ایسی داستانیں آپ کو کشمیر کے گلی کوچوں میں عام ملیں گی اور شادی وبیاہ اور دوسری تقریبات میں ہم اپنے ان اعزازات کو شمار کر کے حساب لگاتے ہیں کہ اس دفعہ بازی کس کے ہاتھ رہی۔ میں بہت زیادہ لکھ گئی ہوں ویسے بھی بہنیں اپنے بھائیوں کو ہی دل کے زخم دکھاتی ہیں! اللہ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ اسی طرح کالم لکھتے رہیں اور ہمارے دلوں کی جوت جگاتے رہیں۔ آخر میں آپ ہی کا ایک جملہ "رہے نام میرے رب کا

آپ کی ایک دعا گو گمنام بہن.....

میری بہن! سونے میں تولنے کے لائق ہے آپ کی یہ تحریر اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس قوم اور نسل میں آپ جیسی مائیں ہوں ان کو غلام بنائے رکھنا اب کسی کے بس میں نہیں۔ روس کو بھی اپنی طاقت کا بہت گمان تھا لیکن جب آپ جیسی ماؤں سے واسطہ پڑا تو اب کئی حصوں میں بٹ

گیا۔ اب امریکا اور اس کے تمام اتحادی بھی اپنی جان بچانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اس کمبل سے جان چھوٹ جائے!
پھر آپ کو غلام بنانے والی طاقت تو ان سامرجی قوتوں کے مقابلے میں انتہائی کمزور ہے وہ بھلا کس طرح آپ کے جذبۂ حریت کے سامنے ٹھہر سکتی ہے؟

اس پیغام کے موصول ہونے کے بعد مجھے انسانی حقوق کے چیمپئن بہت یاد آئے اور جبہ و دستار والے بھی۔ ہاں وہ بھی۔ کیا ہم سب حکمرانوں کا محاصرہ کر کے انہیں اپنی کشمیری مجبور و مقہور بہنوں کا یہ پیغام نہیں پہنچا سکتے؟ لیکن ہم اپنے راحت کدوں میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے 'انسانی حقوق کے چیمپئن بھی اور جُبّہ و دستار والے بھی' ہاں میں بھی!

ہم پہلے بھی سب کے سب زبانی جمع خرچ کرتے رہے بلکہ وہ جسے اس کا بالکل اختیار نہیں تھا کشمیر کی تقسیم کے کئی منصوبے اپنی طرف سے پیش کرتا رہا اور موجودہ حکومت نے تو سرے سے کشمیر کا نام لینا بھی ترک کر دیا ہے۔ ان کیلئے تو سب سے بڑا مسئلہ قوم کی لوٹی ہوئی دولت کو محفوظ کرنا ہے چاہے اس کیلئے ملک میں کو داؤ پر لگانا پڑ جائے۔

نجانے اس موقع پر مجھے وہ لڑکی "راچل کوری" کیوں یاد آئی ہے۔ جب فلسطینیوں کے گھر بلڈوز کرنے کے لیے اسرائیلی فوج آگے بڑھی تو اس امریکی لڑکی نے ان کا راستہ روکا تھا: " نہیں تم نہیں گرا سکتے ان کے گھر"... اور پھر ہوا کیا تھا، جانتے ہیں آپ؟ جی، اس لڑکی پر سے بلڈوزر گزار دیا گیا تھا۔ آپ کچھ نہ کر سکے۔ لیکن قربانی کہاں رائیگاں جاتی ہے۔ چند دن پہلے ساری دنیا نے دیکھا کہ کس طرح ان صہیونی درندوں نے ترکی کی امدادی کشتیوں پر حملہ کر کے انیس ترکی کے مسلمانوں شہید کر دیا جو اپنے غزہ کے مجبور اور بھوک و پیاس سے بلبلاتے بھائیوں کیلئے غذائی اجناس اور ادویات لیکر جا رہے تھے۔ اس کشتی میں تین پاکستانی بھائی بھی موجود تھے جو اس عظیم مقصد کی تکمیل کیلئے سروں پر کفن باندھ کر نکلے تھے۔ آج ایک دفعہ پھر اس کے نام سے موسوم ایک بحری جہاز غزہ کے محبوس افراد کیلئے خوراک اور ادویات لیکر چل نکلا ہے اور آئرلینڈ نے ان صہیونیوں کو پہلے سے خبردار کر دیا ہے کہ اس پر امن قافلے پر کوئی زیادتی برداشت نہیں کی جائے گی۔

میری کشمیری بہن کے اس پیغام نے مجھے ایک امتحان میں مبتلا کر دیا ہے۔ نتیجہ تو بعد میں نکلے گا۔ کیا؟ میں نہیں جانتا۔ بس میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا کیا اور ان کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہاں دعا کروں میں... لیکن کس منہ سے دعا کروں؟ کیسے اپنے رب کا سامنا کروں؟ اک نئی کربلا میرے سامنے بپا ہوئی۔ بچے اور بچیاں تہہ تیغ کئے جا رہے ہیں۔ آپ کہاں ہیں اور کیا کہتے ہیں؟ معصوم بچوں اور بچیوں کی چیخیں مجھے جینے نہیں دیں گی۔ میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکا۔ ہاں مجھے زندگی پیاری ہے... ہاں میں سانس کی آمد و رفت کو زندگی سمجھتا ہوں... ہاں میں نے ذلت و رسوائی کی زندگی قبول کر لی ہے... ہاں میں موت سے بہت ڈرتا ہوں... ہاں میں نے اپنا رب بدل لیا ہے... ہاں میں عزت و ذلت کا مالک انہیں سمجھتا ہوں جن کے ہاتھ میں بے حس بندوقیں ہیں۔ شعلہ اگلتی ہوئی بندوقیں۔ میں انہیں زندگی اور موت کا مالک سمجھتا ہوں جن کے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سے دل دہل جاتا ہے۔ ہاں وہی ہیں میرے مالک... آپ کے متعلق کیسے کہہ سکتا ہوں! آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں نے کشمیر کے مقتل سے ایک مجبور و مقہور بہن کی صدا کا کچھ حصہ آپ کے

گوش گزار کر دیا ہے۔

حق و باطل کا وہی معرکہ عہدِ قدیم
گرم دنیا میں بہ اندازِ جدید آج بھی ہے
فرق یہ ہے کہ کہ نہیں عزمِ حسینی ورنہ
کربلا آج بھی ہے، روحِ یزید آج بھی ہے

بروز جمعتہ المبارک 21 جمادی الثانی 1431ھ 4 جون 2010ء

کانپ اٹھتا ہوں!

پامسٹری میں ہاتھ کی لکیروں سے قسمت کے حال بتائے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں انسان کے کردار اس کی خوبیاں، کمزوریاں اور اس کے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لئے پامسٹ بھی اکثر تمہید باندھتے ہوئے پہلے کسی شخص کو اس کے مزاج، ضدی پن، کنجوسی، بے احتیاطی، واضح بیماری کے بارے میں بتائے گا کیونکہ ان کی علامت ہاتھ پر ایسے ہی واضح ہوتی ہیں جیسے ماتھا چھونے سے بخار کا پتہ چلتا ہے اور نبض دیکھنے سے دل کی دھڑکن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد وہ اندازے لگانا شروع کرتا ہے لیکن ان پیشین گوئیوں میں بھی اس کی بنیاد اس استعداد یا اس رویے کی بنیاد پر ہوتی ہے جو پامسٹ کسی شخص میں پڑھ لیتا ہے۔ مثلاً ایک انتہائی غیر حساس اور بے صلاحیت لکیروں والے ہاتھ کے بارے میں وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ یہ مستقبل میں پینٹر، شاعر یا ادیب بن جائے گا۔

اسی طرح وہ حساس لائینوں اور نرم مزاجی کی علامتیں رکھنے والے کو قاتل، ڈکٹیٹر یا ظالم نہیں بتائے گا۔ یہ فن صدیوں سے انسان کی جستجو اور مشاہدے کی پیداوار ہے جیسے ہمارا علم قیافہ یعنی وہ کوئی ایک تبصرہ کسی دوسرے کے بارے میں ضرور کرتا ہے۔ یہ شکل سے شریف آدمی لگتا ہے یا شکل سے غنڈہ ہے۔ پامسٹری بھی ہاتھ دیکھ کر یہ بتاتی ہے کہ یہ ہاتھ سے کیسا لگتا ہے۔

ہاتھ کی ان لکیروں میں ایک علامت ایسی ہے کہ پامسٹ اگر اسے دیکھ لے تو فوراً یہ فیصلہ صادر فرما دیتا ہے کہ تمہیں اکثر محبت میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ علامت دل کی لکیر سے ایک شاخ کا دماغ کی لکیر کی طرف مشتری کے ابھار سے نیچے جھکنا ہے۔ ایسا فیصلہ صادر ہونے کے بعد وہ شخص اکثر یہ سوال کرتا ہے کہ مجھے مایوسی کیوں ہوتی ہے تو پامسٹ اکثر یہی کہتا ہے کہ تم میں ایک بہت بری عادت ہے۔ تم لوگوں سے توقعات بہت زیادہ وابستہ کر لیتے ہو اور جب توقعات پوری نہیں ہوتی تو پھر تمہیں شدید مایوسی ہوتی ہے اور یہ تمہارے ہاتھ سے ظاہر ہے اس لئے اول تو محبت کرو نہیں اور اگر کرو تو توقعات نہ لگاؤ تاکہ مایوسی نہ ہو۔

یوں لگتا ہے اس مملکت خداداد پاکستان کے سترہ کروڑ عوام میں سے اکثریت کے ہاتھوں پر دل کی لکیر سے دماغ کی لکیر تک جھکنے والی ایک شاخ موجود ہے اور اگر اس ساری قوم کو ایک بہت بڑے سٹیڈیم میں کھڑا کر دیا جائے اور ہاتھ بلند کرنے کو کہا جائے تو پامسٹ ان کے ہاتھ دیکھ کر کہیں گے جاؤ اپنے گھروں میں آرام کی نیند سو جاؤ، تمہارے مقدر میں ہمیشہ محبت میں مایوسی لکھی ہوئی ہے۔ مجمع سوال کرے گا کہ ایسا کیوں تو پامسٹ اپنے اندازے سے یہ بتائے گا اے سترہ کروڑ عوام تم خوش فہم ہو، خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ ہر کسی سے توقعات وابستہ کر لیتے ہو اور پھر جب وہ پوری نہیں ہوتی تو تمہارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ تمہارے کئی سال آنسو بہانے اور چھپ چھپ کر رونے میں گزرتے ہیں اور پھر جب تم سنبھلنے لگتے ہو، ذرا اس صدمے سے جاگتے ہو تو تمہارے سامنے ایک اور محبوب نئے خوشنما وعدوں کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہم اس بدنصیب، خوش فہم اور جذباتی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مقدر میں ازل سے شاید یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ جس کے گلے میں ہار پہنائے گی، جس کی گاڑیاں چومے گی، جس کے راستے پر اپنا دل اور آنکھیں بچھائے گی جس کی لگن میں پیٹ پر لاٹھیاں کھائے گی، سینے گولیوں سے چھلنی کروائے گی وہی اسے مایوس کرے گا۔ یہ وہی قوم تھی جس نے دس لاکھ لوگوں کا خوف اس سرحد پر نذرانے کے طور پر پیش کیا تھا اور خواب دیکھا تھا ایک ایسے ملک کا جس میں انصاف، امن اور خوشحالی ہو گی۔ یہ خواب پورا تو نہ ہوا لیکن اس ملک کے باسیوں کی آنکھوں میں ابھی تک امید باقی ہے۔ وہ ہر چند سال بعد اپنی آنکھوں میں امید کے دیئے روشن کر لیتے ہیں۔

حیرت ہے کم و بیش ان 63 سالوں میں اس قوم نے محبت کرنے میں کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ جو ان کو اپنی امیدوں کا مرکز نظر آیا اس کے لئے مجنوں کی طرح کوڑے بھی کھائے، سسی کی طرح دھوپ میں بھی جلے اور منصور کی طرح موت کو بھی گلے لگایا۔ سب نے اس قوم سے وعدے کئے، دعوے کئے اور ان سے محبت کی اس کٹھن راہ میں جانوں کی بھینٹ لی۔ لوگوں نے اپنے جوان بچوں کے لاشے اٹھائے لیکن ہمیشہ آنسوئوں اور امیدوں میں یہی فقرہ بولا بس اب ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ اب حالات بدل جائیں گے اب انصاف ہو گا، امن ہو گا، خوشحالی ہو گی۔ کیا ہم اپنے ان حسین خوابوں کی تعبیر حاصل کر پائے' کیا ہماری ساری قربانیاں رائیگاں ہو گئیں؟؟

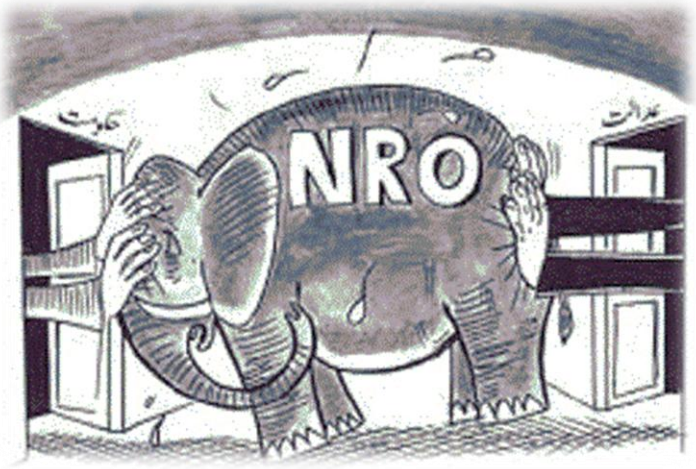

اب تو ان جیالوں کو چپ سی لگ گئی ہے جب وہ یہ سنتے ہیں کہ ہمارے وزیر اعظم ہاؤس کے یومیہ اخراجات بیس لاکھ روپے سے بھی تجاوز کر گئے ہیں 'ایوانِ صدر نے اپنے یومیہ اخراجات کم کر کے 25 لاکھ روپے کر دیئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی کابینہ کے ہر ایک وزیر کے یومیہ اخراجات ایک لاکھ سے کہیں زیادہ اس غریب ملک کی ریاست کو اٹھانے پڑتے ہیں۔ عوامی حکومت کا دعویٰ کرنے والے اب بلٹ پروف گاڑیوں میں ساٹھ گاڑیوں کے پروٹوکول کے بغیر اپنے ملک میں بھی سفر نہیں کر سکتے لیکن عوام کو وزراء کی تنخواہوں میں صرف پندرہ فیصد کٹوتی کی خوشخبری سنا کر کامیاب بجٹ پر خوشی سے بغلیں بجا رہے ہیں۔ عالمی ٹرانسپیریسی کے ادارے نے اپنی حالیہ رپورٹ میں پھر سے اطلاع دی ہے کہ پچھلے سال 2009ء میں 195 / ارب پاکستانی روپے کی کرپشن کے مقابلے میں 2010ء میں اب تک 233 / ارب پاکستانی روپے کی کرپشن ہوئی ہے اور قوم کی امانتوں کو سب سے زیادہ لوٹنے کا سہرا صوبہ پختونخواہ کے سر پر سجایا گیا ہے جو مرکزی حکومت کی سب سے بڑی اتحادی ہے۔

جہاں تک انصاف کا تعلق ہے تو ملک کے نامور وکیل بیرسٹر اظفر کمال وفاق کی طرف پیش ہو کر اعلیٰ عدالت کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ رسوائے زمانہ این آر او ایک درست قانون تھا اور سوئٹزرلینڈ کی عدالتوں میں حکمرانوں کی کرپشن کے جتنے مقدمات زیرِ سماعت تھے ان کو واپس لینے کا

حق بھی جائز تھا۔ اس ملک کی سربلندی اور عدل وانصاف کا نظام لانے کیلئے وہ لوگ تو جان دے کر سرخرو ہو گئے لیکن میں کبھی کبھی ایک منظر سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں' وہ منظر جس میں کسی بے انصافی پر، ظلم پر، زیادتی پر، دھوکے پر ایک ایسی عدالت میں سزا سنائی جائیگی جو سب سے بڑی عدالت ہے۔

اس محشر کے میدان کی تپتی زمین پر اگر ان جان دینے والوں نے میرے رب کے روبرو گریبان تھام لیا ان لوگوں کا' جن کے دعوؤں، جن کے وعدوں اور جن کے نعروں پر اس نے جان دی تھی اور مقدمہ دائر کر دیا اس اللہ کے حضور کہ میں نے جان دی تھی کہ لوگوں کو روٹی کپڑا مکان ملے گا، کوئی گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہے گا میں نے نظام مصطفی ﷺ کے لئے جان دی تھی، میں نے عدل وانصاف کے لئے جان دی اور پھر سوال کرے گا' اے عادل ومنصف رب میں نے جان دی تا کہ یہ شخص سرفراز ہو، اس قابل ہو کر میرے جیسے اور جان دینے والوں کے خواب پورے کر سکے' اسے اختیار ملا، طاقت ملی' اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں کوئی مصلحت کام نہیں آئے گی۔ وہاں اس اختیار کا سب کو جواب دینا پڑے گا جس کی بنیاد میں بے گناہوں کا لہو ہوتا ہے۔ وہاں کیس تکنیکی وجوہات کی بنا پر خارج نہیں ہو گا اور وہاں پر گریبان پکڑنے والے کی اپیل قابل سماعت ہے اور تمام عمر سزا کے لئے صرف ایک خون ہی بہت ہے۔

بروز منگل 25 جمادی الثانی 1431ھ 8 جون 2010ء

وطن کی فکر کر ناداں.....

ان کی دھرتی نے سب سے پہلے امریکی فوج'امریکی طاقت اور امریکی چالبازی کا مزا چکھا تھا۔ آج سے ایک صدی قبل امریکا کی فوج ان کی بندر گاہوں پر یہ کہہ کر لنگر انداز ہونا شروع ہوئی تھی کہ ہم تمہیں اسپین کی غلامی سے آزاد کروائیں گے۔ صدیوں سے مار کھاتے ظلم سہتے یہ لوگ اس وقت کیسے مسکرائے ہونگے'وہ جن کی کمریں اسپین کے فوجیوں کے ظلم سہتے سہتے دہریں ہو گئیں تھیں۔ جو ذرا بھی بولتا'غصے میں سینہ پھلاتا'اسے سمندر کے کنارے بنے ہوئے ایک تاریک جیل کے تہہ خانے میں پھینک دیا جاتا۔ زندہ بچ نکلتا تو ایک دن بڑے پادری کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ بپتسمہ کیلئے تیار ہوتا تو ایک آزاد غلام کی حیثیت سے فلپائن کے بازاریں زندگی گزارتا ورنہ موت اس کا مقدر ہوتی۔

منیلا کے ساحل کے ساتھ اس جیل کو یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس جیل کے تہہ خانوں کی سیڑھیاں اترتے ہوئے سیلن سے رچے خون کی بدبو اور نہائت نیچی چھت سے ٹکراتی چیخوں کی بازگشت سے سانس بند ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ جونہی ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچتے ہیں جہاں اس قوم کی آزادی کا ہیرو اور بانی رزال ایک لمبے عرصے تک قید رکھا گیا تھا تو اس کمرے کے در و دیوار مغرب کے مشرق پر ظلم و بربریت کے قصے سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ وہی بند کمرہ ہے جہاں رزال کی ماں نے ایک لیمپ کسی طرح رشوت دے کر بھجوایا تھا کہ اس کا بیٹا شاعر اور ناول نگار ہے 'اسے پڑھنے میں مدد دے گا۔ جیل والوں نے کہا کہ اس میں تیل تم خود ڈال کر لایا کرو گی'ہم تیل کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہر صبح ماں وہ لیمپ لے جاتی'سارا دن اس سے اسے اپنے بیٹے کی خوشبو آتی رہتی۔ شام کو وہ اسے صاف کر کے اس میں تیل بھر کر واپس لے آتی۔ اسی لیمپ میں اس کی ماں نے ایک خفیہ خانہ بنا رکھا تھا جس میں خالی کاغذ رکھ دیتی تھی اور صبح تک رزال ان پر اپنی شاعری اور اپنا افسانہ لکھ کر بھیجتا رہتا اور یوں جس دن وہ یہ تنگ و تاریک سیڑھیاں چڑھ کر پھانسی کی سزا پانے کیلئے جا رہا تھا پورا فلپائن اس کے ناول میں لکھے گئے باغیانہ فقروں سے گونج رہا تھا۔

ایسی غلامی میں امریکی فوج انہیں آزادی اور جمہوریت کا درس دیتی ہوئی داخل ہوئی۔ مسکراتے فلپائنی جب تھوڑی سی دیر کے بعد جاگے تو ان کی دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ اس زندگی سے انہیں وہ تکلیف دہ موت زیادہ بہتر لگتی تھی جس میں عزت و غیرت تھی'شرم و حیا تھی۔ امریکی فوج نے جہاں ان کی ہر بندر گاہ اور ہر بڑے شہر پر تسلط کیلئے اور اس علاقے میں اپنی جگا گیری کیلئے چھاؤنیاں بنائیں وہیں منیلا کے بازاروں میں ان کی کمسن عورتوں کا بازار سجانے کیلئے ایک پوری یونٹ ایک کرنل کی نگرانی میں مستعد اور چاق و چوبند وہاں متعین کر دی جہاں سب سے پہلے یہ فوجی خود اپنی سفلی پیاس بجھاتے اور دور دراز متعین امریکی فوجی اپنے بھائی بندوں کی نگرانی میں عیاشی کا مزہ لوٹتے۔

ان سے زیادہ کون جانتا ہو گا ان زخموں کو جو امریکی سپاہیوں اور عیاش سیاحوں نے ان کی معصوم اور سادہ زندگی پر لگائے۔ مکاتی'پاسگ اور منیلا کے بڑے بڑے بازاروں میں آج بھی امریکی فوج کے بنائے ہوئے یہ بازار موجود ہیں۔ اس قوم سے زیادہ کس کو خبر ہے کہ ان پر بدترین آمروں کو کون مسلط کرتا

رہاہے۔اسی قوم کے حکمرانوں سے زیادہ کون جانتاہے کہ جتنی دیر کیلئے وہ امریکا کیلئے کارآمد رہتے ہیں'ڈکٹیٹر مارکوس کی طرح حکومت کرتے ہیں اور جب
ناکارہ ہو جاتے ہیں تو پردیس میں ذلت ورسوائی کی موت مرتے ہیں۔

یہ ملک آج بھی امریکااور امریکی فوج کا دستِ نگر اور محتاج ہے'آج بھی امداد کے ٹکڑے اور فوجی سازوسامان کی بھیک اسے امریکا سے ملتی ہے'آج بھی اس کی سرزمین امریکی اڈوں سے آباد ہے'وہی اڈے جہاں سے پورے مشرقِ بعید پر حکمرانی کی جا رہی ہے۔امریکی پالیسیوں میں گھٹاہوایہ ملک آج بھی اس قدر غریب ہے کہ اس کے 80لاکھ مرد اور عورتیں پوری دنیاکے گھروں میں آیاؤں'ڈرائیوروں اور دوسرے معمولی ملازمتوں پر بھاری مشقتوں کو جھیل کر اپنے ملک کی معیشت کو سہارادیتے ہیں۔

کہتے ہیں غیرت کا کوئی ٹھکانہ اور وقت نہیں ہوتا۔یہ کبھی بھی محکوموں کے دماغ میں جاگ اٹھا کرتی ہے اور ایساہی چھ سال پہلے ہوا جب اس ملک کا ایک عام شہری'ایک معمولی ڈرائیور انجیلوڈی لاکروز عراق میں اغواہوا۔اغواکاروں نے کہااپنی فوجوں کو فوراًعراق کی سرزمین سے واپس لے جاؤ۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ امریکا کی محتاج اور دستِ نگر یہ حکومت جو آج بھی مندباؤ کی تحریکِ آزادی کو کچلنے کیلئے امریکی فوج کی محتاج ہے'یوں گویاہو گی کہ دنیاپر انسانی جان کی قیمت کااحساس گونجنے لگا۔ اس حکومت کے ترجمان نے کہا"یہ ڈرائیور ہمارے لئے فلپائن کے ہر جیتے جاگتے انسان کااستعارہ ہے ۔"اس نے کہا"اے فلپائنی قوم آؤ'اسے بچانے کیلئے ہماراساتھ دو۔"پھر تاریخ نے نظر بھر کر دیکھا کہ فلپائن نے عراق سے اپنی تمام فوج کو واپس بلالیا۔امریکا گرجا'برطانیہ نے غصہ دکھایا' آسٹریلیانے دباؤڈالنے کی پوری کوشش کی لیکن حکومت کاجواب آئندہ آنے والی تاریخ میں قومی مفاد کے معانی مرتب کر گیا۔انسان کی"عزت وتوقیر"کی داستان رقم کر گیا۔حکومت نے کہاخارجہ پالیسی سے زیادہ انسانی جان اہمیت رکھتی ہے۔

مجھ پر اس بیان سے جو بیتنا تھی وہ بیت رہی ہے اور میرا ضمیر اس کو بھگت بھی رہاہے لیکن میں سوچتاہوں جب ایک انسان کی قیمت کاعلم ان کو ہو گاجو افغانستان اور عراق کی جیلوں'گوانتانا موبے کے قید خانوں میں خارجہ پالیسی پر قربان ہو گئے تو وہ کیاسوچیں گے۔مجھے ایک لاکھ سے زائدان روحوں کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں جو آزادی کے پروانوں کی طرح کشمیر کے قبرستانوں میں گھر بسا گئیں۔فرانس کامردِ آہن ڈیگال بھی طاقت کے بل بوتے پر الجزائر کو قابو نہ کر سکا'برطانیہ جس کو اپنی بے پناہ طاقت پر گھمنڈ تھااس کا کینیااور قبرص میں کیاحال ہوا'قصر سفید کے فراعین عراق اور افغانستان سے نکلنے کے راستے ڈھونڈرہے ہیں'بھلاکب تک طاقت کے بل بوتے پر مظلوموں کو غلام بناکر رکھاجاسکتاہے؟

کاش کوئی ایک آواز' کوئی ایک ترجمان' کوئی ایک بیان صرف اتنا کہہ دے کہ نہیں' خارجہ پالیسی' کیری لوگر بل کی شکل میں مالی امداد قرضے کی معافی 'فوجی سازوسامان سے نہیں بنتی' انسانوں کی جان ومال کی حرمت سے بنتی ہے۔ فلپائن کے پاس تو صرف ایک ڈرائیور تھا' صرف ایک انسان تھا مثال دینے کو' ہمارے پاس تو سینکڑوں' ہزاروں ہیں! لیکن ہم نے اپنے ضمیر کو کہاں غرق کر دیا؟

آمنہ مسعود جنجوعہ اب بھی ہزاروں گمشدہ افراد کی فہرست سینے سے لگائے حکومت کے ہر دروزے پر دہائی دے رہی ہے کہ ان کے پیاروں کا کوئی پتہ بتائے جنہیں اس ملک کے ڈکٹیٹر مشرف نے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں خود پکڑ کر اپنے آقاؤں کے زندان آباد کئے ہیں۔ ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک جسدِ قومی بم دھماکوں' دہشت گردی کی وارداتوں اور ڈرون حملوں کے زخموں سے چور چور ہے' شہریوں کے اعضاء بری طرح شل ہو چکے ہیں' اعلیٰ عدالتوں کی بے توقیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن اپنے آقاؤں کے احکام کی تعمیل میں پرانی تنخواہ پر ہی خدمات بجالا رہے ہیں۔ فلپائن کی طرح ہماری قومی زندگی میں امریکا کہاں نہیں؟ اس ملک کی حکومتوں کی تخلیق سے لیکر تقریباً سارے سیاستدانوں پر "امریکا" کی مہر لگی ہوئی ہے اور کئی سیاسی جماعتیں اب بھی امریکا کی سیاسی موسیقی پر رقص کناں ہیں۔

ہماری معیشت امریکا کے مالیاتی ادارے چلا رہے ہیں' امریکی ماہرین ہمارا قومی بجٹ ترتیب دیتے ہیں' ہماری خارجہ پالیسی کے قلب میں امریکی مفادات کا پرچم لہرا رہا ہے اور ہماری داخلہ پالیسی امریکی ترجیحات پر مرتب ہوتی ہے۔ امریکا کے حکم پر تعلیمی نصاب کو آغا خان بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا ہے تاکہ امریکا کی مداخلت براہِ راست نظر نہ آئے۔ میرا ماتھا تو اسی دن کھٹکا تھا جب پاکستان کے مشہور اخبار "دی نیوز" میں 24 دسمبر 2009ء کو یو ایس ایڈ کی طرف سے ایک اشتہار چھپا تھا جس میں اگلے چار سال کیلئے پاکستان میں بچوں کیلئے ٹیلی ویژن پروگرام بنانے کیلئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں اور امریکا پاکستان میں ان فلموں پر ڈیڑھ ارب پاکستانی روپے کی خطیر رقم صرف کرے گا۔ امریکا کو ہمارے بچوں سے آخر ایسی کون سی محبت ہو گئی ہے؟ دراصل امریکا اب ہمارے بچوں کیلئے مقامی ابلاغی قتل گاہیں تعمیر کرنے کی منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح ہمارے حکمرانوں نے امریکی ڈروں حملوں کی اجازت دے رکھی ہے' جس طرح جیکب آباد اور پسنی کے ہوائی اڈوں پر امریکی قبضہ تسلیم کیا ہوا ہے اسی طرح امریکا اب اس منصوبے کے تحت ہماری آنے والی نسل کو تباہ و برباد کرنے کے پروگرام پر بڑی تیزی کے ساتھ عمل کر رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے ہاں روسی اور بھارتی ایجنٹوں کی شناخت واضح تھی لیکن اب تو ہم غلامی کی ان حدوں میں داخل ہو گئے ہیں کہ ایسے منصوبہ سازوں کو امریکی تھنک ٹینک یا این جی اوز کہہ کر شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دیکر اپنی عافیت ڈھونڈتے رہتے ہیں!

رہے نام میرا رب کا جو بہترین منصوبہ ساز ہے!

فقر بدنام نہ ہوتا جو فقیر

ایک ہی بابِ طلب تک رہتا

بروز جمعرات 27 جمادی الثانی 1431ھ 10 جون 2010ء

عشق و محبت کے بے ذوق تماشے

کرکٹ ڈپلومیسی کا شور فروری 1987ء میں اس وقت اٹھا تھا جب جنرل ضیاء الحق نے کسی دعوت کی خواہش کا اظہار کئے بغیر جے پور جا کر کرکٹ میچ دیکھنے کا یکطرفہ اعلان کر دیا تھا۔ اس ڈرامائی اعلان کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ بھارت نے "براس ٹیک" مشقوں کے آخر میں 23 ڈویژن فوج پاکستان کی سرحد پر لگا دی تھی اور اس کا لہجہ یکایک تلخ ہونے لگا تھا۔ ضیاء الحق میچ دیکھنے کے بعد نئی دہلی کے ہوائی اڈے سے وطن واپس روانہ ہونے لگے تو اپنے مخصوص غیر رسمی انداز میں وزیر اعظم راجیو گاندھی کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور اسے وہ خوفناک پیغام پہنچایا جو جنگ پر آمادہ شخص کو پہنچانا ضروری تھا' جس کے فوری بعد راجیو نے ہنگامی میٹنگ میں اپنے ان تمام ارادوں کو فی الفور منسوخ کر دیا اور اسرائیلی فضائیہ کا جنگی جہازوں پر مشتمل بیڑہ جو بھارتی فضائیہ کے ساتھ مختلف ہوائی اڈوں پر پاکستان پر حملے کیلئے بالکل تیار تھا ان کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پاکستان کی طرف رخ بھی کر سکیں۔ یہ وہی دن تھے جب مشاہد حسین سید' بھارتی صحافی کلدیپ نیئر کو ڈاکٹر عبد القدیر خان کے پاس لے گئے تھے اور اگلے دن دنیا اس خبر سے تھرا گئی تھی کہ پاکستان نے ایٹم بم بنا لیا ہے۔ جب ہاہاکار تھمنے میں نہ آئی تو 22 مارچ 1987ء کو "ایٹم برائے امن ایکسپو" کا افتتاح کرتے ہوئے ضیاء الحق نے کہا "ہم نے ایٹم بم نہیں بنایا لیکن ہم ایٹم بم بنانے کا ارادہ ضرور رکھتے ہیں"۔

بھارت کے بارے میں پالیسی کے خدوخال تراشنے' کوئی چھوٹا یا بڑا قدم اٹھانے اور کسی بھی نوع کی پیش رفت سے قبل یہ ضروری ہے کہ اس کی مخصوص فکری جذباتی کیفیت' اس کے ذہن کی سامراجی ساخت اور اس کے نفسیاتی عوامل کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ باسٹھ سالوں کے دوران آتی جاتی حکومتوں کے مارشل لائی اور جمہوری حکمرانوں نے بالعموم بھارت شناسی میں کوئی بڑی ٹھوکر نہیں کھائی' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قومی پالیسیوں پر حاوی مسلح افواج نے کسی بھی حکومت کو بھارت سے معاملہ کرتے وقت نرمی اور کمزوری دکھانے کی جازت نہ دی اور اپنے مکمل اعتماد کے ساتھ جمہوری حکومتوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں راجیو گاندھی سارک کانفرنس میں شرکت کیلئے 1988ء میں اسلام آباد آئے تو فوری طور پر "کشمیر ہاؤس" کے بورڈ اتارنے کی "سازش منظرِ عام پر آئی۔ سکھوں کی فہرستیں بھارت کے حوالے کرنے کا غوغا اٹھا' بے نظیر بھٹو کو "سیکورٹی رسک" قرار دیکر ایسا محشر بپا کیا گیا کہ ان کو اپنی حکومت سے ہاتھ دھونے پڑے اور کئی سال جلاوطنی کے عذاب میں مبتلا رہیں۔

نواز شریف کے دور میں واجپائی نے لاہور آکر مینارِ پاکستان کے سائے تلے پاکستان کی آزادی و خود مختاری کو پہلی مرتبہ سلام پیش کیا۔ اس پر نواز شریف کی حب الوطنی سوالیہ نشان بن گئی۔ مسلح افواج کے سربراہ پرویز مشرف واہگہ جانے اور اپنے وزیر اعظم کے ہمراہ بھارتی وزیر اعظم کا استقبال کرنے سے گریزاں رہے۔ احتجاج کرنے والوں نے لاہور کے گلی کوچوں کو میدانِ کارزار بنا دیا۔ مینارِ پاکستان کو پاک کرنے کیلئے غسل دیا گیا۔ پھر کارگل کا "معرکہ اعظم" پیش آیا اور اعلانِ لاہور سمیت سب کچھ خس و خاشاک ہو گیا۔

وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ بھارت کے حوالے سے ہماری نئی "انقلابی پالیسی" میں نائن الیون کا بھی اتنا عمل دخل ہے جتنا کارگل جنگ کا۔ وہ دن اور آج کا

دن'ہم پورے قد سے کھڑے نہیں ہونے پارہے اور پاکستان کے بارے میں بگڑ جانے والا زہرناک عالمی تاثر ختم نہیں ہو رہا۔ بھارت نے نہ صرف کشمیر کے بارے میں بین الاقوامی برادری کی حمائت اور ہمدردیاں حاصل کر کے ہمیں "دراندازی اور دہشت گردی" کے کٹہرے میں کھڑا کر چکا ہے بلکہ ہماری غیر حکیمانہ 'غیر مرتب 'مبہم 'بے مغز اور ڈری ڈری پالیسیوں کے طفیل ہمیں اس روایتی بانکپن سے محروم کر چکا ہے جو آج تک ہماری فوجی اور سیاسی قیادتوں کا امتیاز رہا۔ کمانڈو صدر پرویز مشرف آگرہ گئے تو یہ تاریخی پس منظر ان کے ذہن میں تھا اور اسی لئے وہ "کوریشو" سے ہٹ کر بے معنی مذاکرات میں الجھنے سے اپنا دامن بچاتے ہوئے بالآخر ناکام لوٹے لیکن کچھ عرصے کے بعد صورتحال یکسر اس قدر تبدیل ہوئی کہ ایل کے ایڈوانی نے برملا میڈیا کے سامنے یہ پول کھول دیا کہ "اگر صدر مشرف آگرہ کے مشترکہ اعلامیے میں وہ بات لکھ دیتے جو انہوں نے جنوری 2004ء کے اعلان اسلام آباد میں لکھ دی تو مذاکرات ناکام نہ رہتے"۔

لیکن اب تو معاملہ اس سے بھی کہیں زیادہ تشویشناک معلوم ہوتا ہے۔ صدر آصف علی زرداری تو بھارت پر اس قدر فریفتہ ہیں کہ ایوانِ در میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اعلان کر دیا کہ بھارت تو کبھی ہمارا دشمن ہی نہیں رہا۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو پاک بھارت میں تین جنگیں آخر کیوں لڑیں گئیں؟ پھر اس کے بعد زرداری صاحب پر بھارت کے ساتھ فری ٹریڈ کا بھوت سوار تھا' پاک بھارت کی تجارتی مشترکہ منڈی بنانے کی تجاویز ان کی شدید خواہش تھی۔ ابھی ان خوشنما بیانوں کی گرد بھی نہ بیٹھی تھی کہ انہی کی حکومت کے وزیرِ داخلہ حمٰن ملک کو مجبور ہو کر یہ بیان دینا پڑا کہ پاکستان میں دہشت گردی کے پیچھے بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔ ممبئی میں اجمل قصاب والا معاملہ پیش آیا تو اسی دن وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے بغیر سوچے سمجھے آئی ایس آئی کے ڈی جی کو بھارت بھیجنے کی آفر کر دی لیکن بعد میں ہوش آیا تو اس بیان پر خاموشی اختیار کرنا پڑی کہ جلد بازی میں قومی غیرت کے ساتھ کیا سلوک کر بیٹھے۔ ایوانِ صدر سے فرمان جاری ہوا تو اقوام متحدہ میں خود پاکستان کے نمائندے نے اپنے ہی ملک کی کچھ جماعتوں کو دہشت گرد تنظیمیں قرار دلوا کر ان پر پابندی لگوا دی اور عظیم ہمسایہ ملک چین کو اس قرارداد کو ویٹو کرنے سے منع کر دیا۔

بھارت کی فضائیہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی جس کے جواب میں پاکستانی فضائیہ نے فوری اقدامات کئے تو بیان جاری ہو گیا کہ بھارتی پائلٹ راستہ بھول گئے تھے۔ بھارت نے بگلیار ڈیم پر کوئی رعائت دینے سے انکار کر دیا ہے اور پاکستان کو یہ معاملہ اب ورلڈ بینک کے پاس لیجانا پڑا گیا ہے۔ "کشن گنگا" منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے' سیاچین کا معاملہ جوں کا توں ہے' سر کریک کا معاملہ جو اپنے حل کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اس کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کشمیر کو بدستور اپنا اٹوٹ انگ قرار دینے کی رٹ جاری ہے۔ سات لاکھ سفاک بھارتی سپاہ بدستور آگ و خون کے مکروہ کھیل میں مصروف ہے۔ بے معنی مذاکرات کا سرکس' نام نہاد اعتماد افزا اقدامات کے ہنڈولے کب کے پھوٹ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود "شرم الشیخ" میں دوبارہ جو وعدے وعید ہوئے ان سے بھی مارے شرم کے انکار کر چکے ہیں۔

"وار آن ٹیرر" کا بیگانہ ڈھول جو مشرف نے قوم کے گلے میں ڈلا تھا اس ڈھول کو بجاتے بجاتے خود قوم کا ڈھول بج گیا ہے لیکن ہمارے شل ہاتھوں کو اب بھی یہ حکم ہے کہ اس فرض سے سستی برداشت نہیں کی جائے گی۔ فاسق مشرف نے تو بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے "لائن آف کنٹرول" ختم کر دینے کی مبہم اور ناقابل فہم سی تجویز بھی پیش کر ڈالی تھی جبکہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس تجویز کی پذیرائی کی صورت میں کشمیر کا سٹیٹس کیا ہو گا ؟ کشمیر کے دونوں اطراف میں امتیاز کس طرح باقی رہے گا؟ اگر سارا کشمیر ایک ہو جائے تو یہ کی قلمرو کا حصہ ہو گا؟ کیا اس تجویز کا مقصد "تھرڈ آپشن " کی راہ ہموار کرنا مقصود تھا؟ سرینگر اور مظفر آباد بس سروس نے کیا کشمیر کے مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش قدمی دکھائی؟

بھارت تو پچھلے باسٹھ سالوں سے اس کوشش میں ہے کہ پہلے تجارتی تعلقات بحال کرو پھر اس کی آڑ میں کشمیر کے مسئلے کو ہمیشہ سے دفن کر دو۔ اسی لئے بھارت تو چاہتا ہے کہ قدم قدم پر ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے بن جائیں' ہر سرحدی چوکی پر تجارت کا جمعہ بازار سجایا جائے' کرکٹ میچوں ' رنگ رلیوں اور موج میلوں کی برسات سال کے بارہ مہینے برستی رہے' شرط صرف یہی ہے کہ پاکستان ایک لاکھ شہداء کی قبروں سمیت آزادی کیلئے سربکف کشمیری مجاہدین سے رشتہ توڑ لے اور کشمیر کا تذکرہ چھوڑ دے۔ کارگل اور نائن الیون نے مل جل کر پاکستان کی موجودہ حکومت کو بھارت کے حوالے سے اپنی روایتی خودی سے محروم کر دیا ہے اور گزشتہ نو سالوں سے مسلسل لڑھکنیاں کھاتے چلے جا رہے ہیں جس سے جسدِ قومی کا جوڑ جوڑ ہلنے لگا ہے۔ معاملہ اعتماد افزا اقدامات سے بھی کوسوں آگے نکل گیا ہے اور زرداری حکومت والہانہ عشق و محبت کے ایسے بے ذوق تماشے بھی دکھانے لگی ہے جس سے گریز اب از حد ضروری ہے جس کی بناء پر کشمیریوں کا دیرینہ مؤقف عملاً گہری قبر میں دفن ہوتا جا رہا ہے کہ "کشمیر کا مسئلہ حل ہوئے بغیر دوستی نہیں ہو سکتی"۔

اب حال ہی میں بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے دورۂ کشمیر کے موقع پر صرف کشمیری مجاہدین کو مذاکرات کی دعوت دیکر زمینی حقائق یعنی "تحریکِ حریت کانفرنس" کو سائڈ لائن پر لگانے کی پوری کوشش کی ہے لیکن ان کا یہ سیاسی حربہ بھی ناکام رہے گا اور کشمیری مجاہدین اس سیاسی اور خطرناک چال سے بخوبی واقف ہیں۔ بھارت "کشمیر" کے حوالے سے زیادہ بے لچک ہو گیا ہے لیکن اس سے ہماری دوستی عشق و جنوں میں ڈھلتی جا رہی ہے اور محبت و وارفتگی کے شیریں گیت گاتی زبانوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کشمیر کا لفظ کس طرح بولا جاتا ہے؟ لیکن کشمیریوں کے جذبۂ قربانی کا کیا کریں جو ایک لاکھ جانوں کا نذرانہ دیکر اب بھی تازہ دم نظر آتے ہیں اور ان کو اپنی جدوجہد آزادی کی کامیابی کا اس قدر یقین ہے جس طرح ہر روز مشرق سے طلوع ونے والا سورج!

بروز ہفتہ 29 جمادی الثانی 1431ھ 12 جون 2010ء

کوتاہیوں کا کفّارہ

"یکجہتی کشمیر" ایک علامت ہے اس احساسِ ذمہ داری کی جو کشمیر کی جدوجہد کے سلسلے میں ہم اہل پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ کشمیر میں خودارادیت کے حق کے حصول کیلئے گزشتہ باسٹھ سالوں سے جو جدوجہد ہو رہی ہے' وہ کشمیریوں کیلئے ہی نہیں ہو رہی ہے اس میں پاکستان کی بقاء بھی شامل ہے۔ کشمیر کا مسئلہ ایک منصوبہ بندی کے تحت پیدا کیا گیا۔ برصغیر سے جب برطانیہ کے استحصالی دور کا خاتمہ ہوا تو یہاں دو آزاد مملکت وجود میں آئیں۔ کشمیر کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہاں مغربی طاقتوں کی مداخلت کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ مغربی طاقتوں بخصوص برطانیہ اور امریکا کے دو اصول ہیں۔ اپنے داخلی معاملات میں وہ سچائی اور انصاف کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور بین الاقوامی سیاست میں وہ منافقت کا اصول اپنے سامنے رکھتے ہیں اور معاملہ مسلمانوں یا مسلمان ملکوں کا آجائے تو ان کے فیصلوں پر صہیونی اثرات غالب ہو جاتے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی سرحدی تنازعہ نہیں ہے۔ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے بھارت نے اپنے وجود کی ابتداء ہی جارحیت سے کی ہے۔ اس جارحیت کی ابتداء کشمیر سے ہوئی جس کی تیاری دہلی کے "وائسریگل لاج" میں قیامِ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی کی گئی۔ کشمیر کی ریاست ہر سمت سے پاکستان کے اندر تھی اور وہاں مسلمانوں کی اکثریت بھی تھی۔ کشمیر تک بھارتی فوجیوں کو راستہ فراہم کرنے کیلئے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن اور باؤنڈری کمیشن کے صدر "سیرل ریڈکلف" نے پاکستان کے ساتھ کھلم کھلا بدعہدی کی اور ضلع گورداسپور کی دو تحصیلیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی بھارت کو دیدیں' پھر ایک مشکوک دستاویز کے ذریعے مہاراجہ کشمیر کے نام سے بھارت سے کشمیر کا الحاق کا اعلان کر دیا گیا اور بھارتی فوجیں فوراً کشمیر میں داخل ہو گئیں۔

اس جارحیت سے دفاع کیلئے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائدِ اعظم نے جب افواجِ پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو جو انگریز تھا' حکم دیا تو اس نے قائدِ اعظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا' یہی نہیں بلکہ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ رچرڈ ایٹلی (26 جولائی 1945 تا 26 اکتوبر 1951) نے برطانوی دار لعوام میں قانونِ آزادی کا مسودہ پیش کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ یہ پھر ایک ہو جائے گا" حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا برصغیر کشمیر سے راس کماری تک' برما سے بلوچستان تک کبھی ایک نہیں رہا۔ برصغیر کی یکجہتی' دراصل یادگار ہے ہمارے غلامی کی' برطانیہ کے استحصالی دورِ اقتدار کے علاوہ یہ علاقہ کبھی ایک ملک یا جغرافیائی وحدت نہیں رہا۔ انگریزوں نے اپنے غاصبانہ دور میں تین تصورات عام کئے۔ وطنی قومیت کا تصور' جمہوریت کا تصور اور جغرافیائی وحدت کا تصور۔ وطنی قومیت کے فروغ کا مقصد مسلمانوں کو ان کی عالمگیر ملی شناخت سے دور کرنا تھا' جمہوریت کا مقصد برصغیر میں مسلمانوں کو بہت بڑی ہندو اکثریت کا مستقل پابند بنانا تھا۔

جغرافیائی وحدت کا مقصد یہ تھا کہ ہندو قیادت اس پورے برصغیر کو اپنی ملکیت سمجھے اور اس میں کسی کمی کو اپنے دائرہ اقتدار میں کمی سمجھے۔ گاندھی جی نے اس تصور کے تحت کہا تھا کہ "قیامِ پاکستان کا مطلب یہ ہو گا کہ گویا کئو ماتا کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔" گاندھی جی کی سیاست قول و فعل کے تضاد کا بڑا نادر نمونہ تھی۔ انہوں نے لہجہ دھیما رکھا لیکن ہمیشہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو بھڑکائے رکھا۔ انگریزوں نے برصغیر میں مسلمانوں سے مجموعی طور پر معاندانہ حکمتِ عملی اختیار کی۔ یہ ان کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا تقاضہ تھا۔ انہوں نے ہندوؤں سے مکمل یکجہتی اختیار کی اور ہندوؤں نے اسے قبول کیا' یہ دونوں کے باہمی مفاد کا تقاضہ تھا۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ برطانیہ اور بھارت حقیقی معنوں میں پاکستان کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کی سیاسی لغت میں "بین الاقوامی تعلقات" کے حوالے سے معاہدوں کی پابندی کی اصلاح محض نمائش کیلئے ہے' عمل کیلئے نہیں ہے۔ بھارت خود اقوامِ متحد کی سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ لیکر گیا۔ سلامتی کونسل کی واضح قراردادیں کشمیر کے مسئلے پر موجود ہیں لیکن باسٹھ سال گزر گئے بھارت سلامتی کونسل کی قراردادوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور عالمی طاقتیں تماشہ دیکھ رہ ہیں۔

سلامتی کونسل کی قراردادوں کی خلاف ورزی کرنے والے دنیا میں اس وقت صرف دو ہی ملک ہیں' ایک بھارت اور دوسرا اسرائیل اور ان دونوں کو برطانیہ اور امریکا کی پوری سرپرستی حاصل ہے۔ کشمیر اور فلسطین میں بڑے تسلسل' ڈھٹائی اور انتہائی بے حیائی کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں' ہر دن معصوم اور بے گناہ انسان حکومتی بربریت اور دہشت گردی کا شکار ہو رہے ہیں اور منافقانہ سیاست کی ماہر عالمی طاقتیں تماشہ دیکھ رہی ہیں' صرف اس لئے کہ بہنے والا یہ خون مسلمانوں کا ہے ۔ جہاں تک برطانیہ اور امریکا کا تعلق ہے تو اسرائیل ان کا مربی ہے اور وہ اسرائیل کے جارحانہ مقاصد کی حمائت پر مجبور ہیں' رہ گیا بھارت تو وہ اس پورے علاقے میں ان کے مفادات کا نگراں ہے لہٰذا وہ یہاں بھارت کی چوہدراہٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں تمام اقلیتوں کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً جو مظالم روا رکھے گئے وہ بالکل عیاں ہیں۔

کشمیر میں بے رحمی اور درندگی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے لیکن ڈنکے پیٹے جا رہے ہیں کہ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ دونوں اطراف سے یہ تاجرانہ رشتوں کا اظہار اور تاجرانہ ذہنیت کی پکار ہے۔ یہ ایشیا کے نہیں علاقوں میں اثر و رسوخ کے ' استحصالی اثر و رسوخ کے سودے ہیں۔ کرداروں کے نام بدلے ہیں' ڈراموں کے کردار بدلے ہیں' کہانیاں نہیں بدلیں' جن میں مرکزی خیال یہ ہے کہ نسبتاً کمزور ملک لیکن وسائل رکھنے والی قوموں کا استحصال کیا جائے۔ یہ انسانیت کی تذلیل ہے' رسوائی ہے' یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجود کا تسلسل ہے۔ ہندوستان کشمیر میں وہی کچھ کرتا چلا آ رہا ہے جو تکبر اور جبر پسندی کا تقاضہ ہے۔ ہر فرعون نے ہر دور میں یہی روش اختیار کی کہ مخالفت کو شدید بے رحمی سے کچل دیا جائے لیکن وہ بات جو فیض نے کہی ہے کہ:

یہی جنون کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر' یہی اختیار کا موسم

اگر بھارت واقعی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے تو پھر غیر جانبدار میڈیا کو وہاں جانے کی اجازت کیوں نہیں؟ اگر چند لمحوں کیلئے فرض کر لیا جائے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے تو دنیا کا کون سا قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اپنے ایک لاکھ شہریوں کو اس قدر بے رحمی سے قتل کر دیا جائے! بھارت اگر واقعی ایک مہذب جمہوری ملک ہے تو کشمیر کیوں کو حق خود ارادیت کے معاملے پر اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کیوں نہیں کرتا؟

شیطانی جبر کے مقابلے میں ایمانی توانائی سدراہ بن جاتی ہے اور بالآخر کامیاب ہوتی ہے۔ جبر کرنے والے اذیتوں سے اور موت سے ڈراتے ہیں' ایمانی قوت موت سے نبرد آزمائی کی جرأت عطا کرتی ہے۔ موت میں خوف ہی نہیں ہوتا' لذت بھی ہوتی ہے اور جذبۂ ایمانی اس لذت کو نکھارتا ہے۔ خود اہل کشمیر اس لذت سے اب سرشار ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے اہلِ کشمیر پر بھی اور اہلِ پاکستان پر بھی۔ کشمیری صرف کشمیر کی آزادی کی ہی نہیں' پاکستان کے استحکام کی بھی جنگ لڑ رہے ہیں۔ حریت کی داستانیں اسی طرح رقم ہوتی ہیں۔ بھارت کی جارحانہ طاقت جذبۂ حریت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بھارت کی لاکھوں کی تعداد میں فوج ہر طرح مسلح ہے' کشمیری اس کے مقابلے میں بالکل نہتے اور غیر مسلح ہیں لیکن بھات کی بھرپور مسلح فوج انسانی اقدار سے نہ صرف محروم ہے بلکہ ان سے متصادم ہے اس لئے بالآخر ناکامی اس کا مقدر ہو گی۔ قوموں کی زندگی میں یہ مرحلے آتے ہیں' جھکے سر کے ساتھ' طیش یا سربلندی کے ساتھ سرفروشی کا فیصلہ:

دل کی آزادی شہنشاہی' شکم سامان موت
فیصلہ تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ہم جیسے بھی ہیں بہر حال مسلمان ہیں' ہمارے مسائل عالمی طاقتیں حل نہیں کریں گی' ہمیں خود اپنے فیصلے کرنے ہیں' ہمیں خود اپنی تقدیر کا مالک بننا ہو گا ۔ مسلمان ملکوں میں اب پہلے کی نسبت زیادہ بیداری ایمانی شعور کی علامت ہے۔ فرائض تو سب کو ادا کرنے ہیں لیکن ہم اہلِ پاکستان پر خصوصی ذمہ داری ہے ۔ ہم کو آج کی ذمہ داری بھی پوری کرنی ہے اور اب تک کی کوتاہیوں کا کفارہ بھی ادا کرنا ہے۔ پاکستان کا قیام اور استحکام ایک معاشرتی معجزہ ہے' کشمیر کا پاکستان سے الحاق اسی معجزے کا تسلسل ہو گا۔

بروز اتوار یکم رجب المرجب 1431ھ 13 جون 2010ء

☆☆☆